تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس اُردو

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں

(تقابلی مطالعہ)

محقق

سحر مبین

رجسٹریشن:97/FLL/MS.URDU/S13

نگران

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

International Islamic University
CENTRAL LIBRARY
Islamabad

شعبۂ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Acc # TH 21171

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو، کلیۂ زبان و ادب

تصدیق نامہ

سحر مبین نے رجسٹریشن نمبر:97/FLL/MSURDU/S13 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان **"صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں (تقابلی مطالعہ)"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بجھوا دیا جائے۔

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: ***Seher Mobeen***
Title of the Thesis: صو فی تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں: تقا بلی مطا لعہ
Registration No: ***97-FLL/MS Urdu/S13***

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE	
External Examiner: **Dr. Nawazish Ali** Professor AIOU Islamabad	***Internal Examiner:*** **Dr. Humaira Ishfaq** Assistant Professor Department of Urdu(Female), IIUI
Supervisor: **Dr. Arshad Mehmood Asif** Assistant Professor Department of Urdu(Male), IIUI	

****

Chairperson
Department of Urdu

Dean
Faculty of Language & Literature

دیباچہ

تحقیق کا میدان ایک ایسا میدان ہے جس کی تنگی اور وسعت دونوں محقق کے لیے مشکلات کا سبب بن جاتی ہیں۔اگر یہ میدان تنگ اور محدود ہے۔تو اس کے لیے یہ مشکل پیش آتی ہے۔کہ تھوڑی سی معلومات سے کس طرح کام لیا جائے کہ وہ پھیل کر ایک مستقل مقالے کی صورت اختیار کر لے اور اگر یہ میدان وسیع اور غیر محدود ہوتا ہے تو اس کی یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ان غیر محدود اور وسیع معلومات کو سمیٹ کر کیونکہ متوسط حجم کا ایک مقالہ تحریر کر سکے۔معلومات کا ایک بے پایاں ذخیرہ اس کی نگاہ کے سامنے ہوتا ہے۔اور اس میں سے اس کو اپنے ذوقِ سلیم کی مدد سے مفید اور ضروری معلومات کا انتخاب کر کے اپنی راہ سب سے الگ نکالنی پڑتی ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے سلسلے میں لکھی گئی نظموں پر جب میں نے یہ مقالہ تحریر کرنا چاہا تو مجھے یہی پہلی مشکل پیش آئی۔ اردو میں ہمارے ہاں بچوں کا سرمایہ دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں کم درجے کا ہے۔اچھے فنکاروں نے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔یہی وجہ ہے کہ بہترین تخلیقی فنکاروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔اس طرح بچوں کے لیے تحریر کردہ تصانیف پر تحقیقی مقالہ جات میں بھی دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔کیونکہ ان کی تعداد بھی خاصی کم ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور قیوم نظر اپنے اپنے عہد کی یگانہ روزگار شخصیات تھیں ماہر تعلیم،شاعر اور نقاد ہر تین حثیتوں میں ان دونوں شخصیات نے ہماری ادبی اور تہذیبی روایات کو سنوارا نکھارا اور آگے بڑھایا ہے۔شاعر کی حثیت سے انھوں نے شعری روایات کو ثروت صند بنانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے خیال سے بہت عمدہ اور نہایت مقبول شاعری کی ہے۔ان دونوں شعراء کی بچوں کے حوالے سے خدمات نا قابل فراموش ہیں۔اور ان خدمات کا اس مقالے میں اعتراف اور احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوع کے حوالہ سے اس مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے باب میں بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری ،ادبی رسائل اور اداروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسرے باب میں صوفی تبسم کے مختصر حالات زندگی،ان کی شاعری اور بچوں کے حوالے سے لکھی گئی نظموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں قیوم نظر کے حالت زندگی،ان کی شاعری،تصانیف اور بچوں کے حوالے سے لکھی گئی نظموں کا

خصوصی تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں دونوں شعراء کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان نظموں کو اسلوبیت، موسیقیت، موضوعات تشبیہات اور استعارات کے پیمانے پر پرکھا گیا ہے اور نظموں میں موجود پیغام کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

اس مقالے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں شعراء کی بچوں کے حوالے سے شاعری کا جس قدر ہو سکے بہترین انداز میں تقابل اور تجزیہ کیا جا سکے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے اس کا فیصلہ تو اس مقالے کے قارین ہی کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی شکر گزار ہوں۔ جن کی مدد کے بغیر یہ اہم مقالہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا اور ساتھ ہی اپنے نگران ڈاکٹر ارشد معراج، اسسٹنٹ پروفیسر کی بھی بہت مشکور ہوں کہ جن کی رہنمائی کے بغیر اس مقالے کا مکمل ہونا ناممکن تھا اور اس کے ساتھ اپنے اساتذہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق، ڈاکٹر صباحت مشتاق اور میڈم شیراز فضل داد، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب اور صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ ان کی محنت اس مقام تک لائی کہ میں یہ اہم مقالہ تحریر کر سکوں۔

سحر مبین

فہرست ابواب

نام ابواب		صفحہ نمبر
باب اول:	اُردو میں بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری، ادیب ، رسائل اور اداروں کی اہمیت: پس منظر مطالعہ	
ا۔	بچوں کا ادب، تعریف، بچوں کے شعراء اور موجودہ عہد میں نصاب کے علاوہ بچوں کے لیے نظمیں کیوں نہیں لکھی جا رہیں نیز بچوں کو انگریزی نظمیں جلد ازبر ہو جاتی ہے، پس منظری، تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔	۱
ب۔	بچوں کے ادب پر کام کرنے والے ادارے، ہمدرد، اکادمی ادبیات پاکستان شعبہ بچوں کا ادب دعوۃ اکیڈمی کی خدمات	۱۸
ج۔	بچوں کے رسائل و جرائد، پھول، تعلیم و تربیت، ہمدرد نونہال، میں بچوں کے لیے پیش کی جانے والی نظموں کا محاکمہ	۳۴
باب دوم:	صوفی تبسم کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے موضوعات کا احاطہ: تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	
ا۔	صوفی تبسم کا مختصر تعارف	۶۱
ب۔	صوفی تبسم کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں خصوصاً ۱۔جھولنے ۲۔ٹول مٹول ۳۔ٹوٹ بٹوٹ ۴۔ دوسری نظمیں میں شامل نظموں کا فکری تنقیدی و تحقیقی تجزیاتی مطالعہ	۷۸

باب سوم: قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں اور ان کے موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ا۔ قیوم نظر کا مختصر تعارف: ۱۵۷

ب۔ قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں خصوصاً ا۔ آلو چے ۲۔ گلگلے ۳۔ بلبلے ۴۔ بچوں کا لاہور میں شامل نظموں کا فکری تنقیدی و تحقیقی تجزیاتی مطالعہ ۱۶۹

باب چہارم: صوفی تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا تقابلی مطالعہ

ا۔ نظموں کے موضوعات کا فکری سطح پر تقابل ۲۵۹

۲۔ نظموں کا اسلوب، استعارات، تشبیہات، موسیقت، آسان زبان، آسان الفاظ ۳۰۷

۳۔ نظموں کے پیغام کا موازنہ ۳۲۷

ماحصل ۳۳۳

ضمیمہ ۳۳۵

کتابیات ۳۵۷

باب اوّل

اُردو میں بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری، ادیب، رسائل اور اداروں کی اہمیت: پس منظر مطالعہ

ا۔ بچوں کے ادب کی ضرورت:

عربی میں بچے کو طفل کہتے ہیں۔ جس کی جمع اطفال ہے، اُردو میں انہیں بچہ یا بچے کہا جاتا ہے یہ ان کم سن افراد کو کہتے ہیں جن کی عمریں مختلف ممالک کے قوانین میں مختلف ہیں۔ مثلاً بعض ممالک میں ۱۶ سال تک بچہ کہلاتا ہے اور بعض میں ۱۸ سال تک اسلام میں طفل کا تصور بلوغت تک ہے۔ چاہے وہ ۱۳ سال کی عمر تک ہو جائے یا ۱۶ سال تک۔ طفل کسی نہ کسی کی اولاد ہوتے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے والدین پر ہوتی ہے۔ اگر والدین میسر نہ ہوں یا تربیت نہ کرسکیں تو ریاست پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ایسے اصول و قواعد بیان کیے گئے ہیں جن سے بچوں کی زندگی کو تحفظ بھی ملتا ہے۔ اور ان کی راہنمائی بھی ہوتی ہے اور ان کی راہ عمل کا تعین بھی ہوتا ہے۔ اسلام جب بچے، خاندان اور قبیلے کی زندگی کی تنظیم کرتا ہے اس وقت یہ حقیقت پیش نظر رہتی ہے کہ ان سب میں ایک باہمی ربط ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک حصے میں بھی کوئی تبدیلی ہوتی یا اسے کوئی نقصان پہنچا تو اس کا اثر سب پر پڑے گا۔

نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں کے ساتھ عزت و اکرام کا معاملہ نہ کرتا ہو۔''(۱)

اسلام میں بڑوں کی طرح بچوں کے بھی حقوق ہیں جن میں بچوں کی اچھی دیکھ بھال، عمدہ تربیت اور

بہترین تعلیم ہے حق کا لفظ قرآن حکیم میں ۲۷۳ مرتبہ آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد اپنے مضمون ''بچے کا حق اختیار'' میں سید شریف جرجانی کے حوالے سے حق کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ترجمہ: ''لغت میں حق کا معنی یہ ہے کہ ایسی ثابت چیز جس کا انکار ممکن نہ ہو اور اہل معانی کی اصطلاح میں ایسا حکم جو واقع کے مطابق ہو۔'' التعریفات ص ۴۰ (۲)

ایک حق وہ مفاد ہے جسے قانون کا کوئی اصول تسلیم کرتا ہو اور اس کی حفاظت کرتا ہو۔ یہ ایک ایسا مفاد ہے جس کا احترام فرض ہے اور اس کی پامالی غلط اور ناجائز ہے۔

حق اور فرض کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس وقت تک کوئی حق نہیں پایا جاسکتا۔ جب تک کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس کا کوئی فرض نہ ہو اسی طرح کوئی فرض نہیں پایا جاسکتا۔ جب تک کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس کا وہ حق ہے۔

دنیا کی سبھی قوموں کا قیمتی سرمایہ بچے ہوا کرتے ہیں۔ اگر اس وقت وہ گود کا کھلونا ہیں تو آگے چل کر وہی مستقبل کے معمار بنیں گے۔ ماں کی گود بچے کی درسگاہ اول ہے۔ اسی عظیم درسگاہ سے وہ اخلاق حسنہ، اطاعت و فرمانبرداری، دنیا میں عظیم زندگی گزارنے کے سلیقے، ڈھنگ اور طور طریقے لے کر معاشرے کا حصہ بنتا ہے۔ اسی لیے ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اس طرز پر کرے کہ ان کے رگ و ریشے میں دین کی روح پھونک دے۔

وکی پیڈیا میں لکھا ہے:

''دنیا کے آدھے ممالک میں ۳ سال سے کم عمر بچوں کی تعلیم کا کوئی پروگرام نہیں۔ جنوبی و مغربی ایشیا میں کم از کم تعلیمی قابلیت سے محروم بالغ افراد کی شرح ۵۹ فیصد، سب صحارا افریقہ ۶۱ فیصد، عرب ممالک ۶۶ فیصد ہے۔ دنیا میں ۲۰۳ میں سے ۱۹۲ ممالک میں لازمی تعلیم کے قوانین موجود ہیں۔ اس کے باوجود ۱۰ ممالک ایسے ہیں جن میں (ہر ایک میں الگ الگ) ۱۰ ملین سے زیادہ بالغ ان پڑھ ہیں۔ جس میں سے صرف آدھے ممالک ۱۹۹۰ء سے ان پڑھ افراد کی تعداد میں خاطر خواہ کمی لاسکے ہیں۔'' (۳)

اسی طرح پاکستان کے ۳۰ فیصد بچوں کو تعلیم تک رسائی کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ ۷۰ فیصد طالبات

پرائمری تک ہی تعلیم مکمل کرتی ہیں۔ دو کروڑ سات لاکھ بچے تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق سے محروم ہیں۔ ایک کروڑ ۳۰ لاکھ بچے غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ حالانکہ کسی بھی ملک کی معاشی، معاشرتی اور صنعتی ترقی کے لیے بچے کی تعلیم و تربیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ بہترین تعلیم و تربیت ایک عمدہ اور مہذب ماحول میں ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ ماحول کی اثر پذیری کا اندازہ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لگایا جاسکتا ہے کہ: ''ہر نومولود فطرتِ سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔'' (۴)

اسی طرح ایک اور حدیث ہے کہ:

''سب سے اچھا انسان وہ ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔'' (۵)

ان احادیث کی روشنی میں ہمیں بچے کی تعلیم و تربیت پر اسی طرح سے توجہ دینے کی ضرورت ہے جو اسے اخلاقی اور معاشی طور پر مستحکم کر کے معاشرے کا مفید فرد بنانے کی ضامن ہو۔ آج کے صنعتی اور ایٹمی دور نے زندگی کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے اسی وجہ سے بچے کی شخصیت کی عمدہ تربیت کے لیے دینی تربیت اور ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی ضرورت کو بھی پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے بچوں کی نفسیات سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

نفسیات کردار کا سائنسی مطالعہ ہے۔ کردار سے مراد کسی جاندار کی ایسی سرگرمیاں ہیں جن کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اور جن کی معروضی طریقے سے پیمائش ممکن ہے۔

محدود طور پر تعلیم ایک منضبط ماحول میں بچوں کے کردار کی اصلاح ہے۔ کردار کی نئے سرے سے تشکیل یا اصلاح کی غرض سے اس میں تبدیلیاں لانے سے قبل ضروری ہے کہ کرداری سائنس یعنی علم نفسیات کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ ضروری عمل ہے کہ بچوں کی جسمانی، معاشرتی اور ذہنی نشو و نما کی مختلف منازل اور ان کی خصوصیات سے آگاہ ہوا جائے ہم علم نفسیات سے آگاہی کی صورت میں بچوں کے کردار میں بامعنی اور تعمیری تبدیلیاں پیدا کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

مغرب میں تعلیمی نفسیات کی تاریخ کا آغاز یونانی فلسفیوں کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ ڈیما کرائٹس (Democritus) پہلا

فلسفی تھا۔ جس نے بچے کی پھلتی پھولتی شخصیت پر گھریلو ماحول کے اثرات کا بڑی شدومد کے ساتھ ذکر کیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں افلاطون(Plato) اور ارسطو (Aristotle) نے تعلیمی نظام مرتب کیے۔ اور تعلیم کا رشتہ نفسیاتی اصولوں کے ساتھ جوڑا۔ انہوں نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں جیسے مختلف لوگوں کے لیے مختلف قسم کی تعلیم، تعلیم کا کردار، تعلیم کا پیشہ، طریقے ہائے تدریس، تعلیم کی نوعیت، تعلیم پر گھریلو ماحول کے اثرات وغیرہ پر مدلل اور وضاحت سے لکھا۔ ارسطو نے نفسیات سے متعلق اپنے نظریات کو زیادہ منظم اور مدلل طور پر پیش کیا۔ وہ ذہنی ملکیت کے نظریہ پر یقین رکھتا تھا۔ اور اسی لیے وہ ذہنی عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ دنیا نے اس کے نفسیاتی اصول وقوانین قبول کیے۔ اس نے دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک تعلیمی عمل کو متاثر کیا۔ بعد میں آنے والے مفکرین نے اس کے بتائے ہوئے اصولوں اور نظریات میں تبدیلیاں کیں۔ روسو(Rousseau) نے تعلیم کی بنیاد انسانی نشوونما کے اصولوں پر رکھی۔ اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ایمیل(Emile) میں بچوں کی تعلیم کی مفصل سکیم پیش کی۔

تعلیم کے موضوع پر روسو کے غوروفکر کے نتائج ''ایمیل'' کی صورت میں سامنے آئے۔ اس کا ضمنی عنوان ''تعلیم کے بارے میں'' ہے اور بلاشبہ یہ تعلیم کے موضوع پر لکھی جانے والی سب سے زیادہ بااثر کتابوں میں سے ایک ہے۔

مشہور فرانسیسی مصنف 'روسو' کی شہرہ آفاق کتاب 'ایمیل' ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی اور یہ غالباً پہلی کتاب تھی ۔جس نے بچوں کے جذبات اور خواہشات سے پابندی اٹھانے کا مشورہ دیا۔ اس سے پہلے والدین کی دلچسپی صرف اتنی ہی تھی کہ وہ ان کی تربیت اس طرح کریں کہ ان میں فرمانبرداری کی صفات پیدا ہوسکیں۔اس مقصد کے لیے انہیں بچوں کی فطری صلاحیتوں کو سمجھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ان کی فطرت کی توضیح کرنے والے اسباب بڑوں کی فطرت سے چنداں مختلف نہ تھے۔ ایک ہی قسم کے قوانین کا اطلاق دونوں پر ہوتا تھا۔ اگر ایک کام کو بڑا آدمی آسانی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی کام کو بچے نہ سیکھ سکیں۔ اگر ہم اپنی خواہشوں اور دلچسپیوں کو اپنے ضبط میں رکھ سکتے ہیں۔ تو بچے بھی ان پر ضبط کیوں نہیں رکھ سکتے۔

'روسو' نے اس قسم کے خیالات کے خلاف بغاوت کی۔ اور بچوں کو قدرت کے سپرد کرنے اور انہیں مکمل آزادی دینے کی حمایت میں علم بلند کیا۔ روسو اور اس کے سوئیس دوست 'پیسولائزی' (Pesolimi) کی تحریکوں سے لوگوں میں بچوں سے حقیقی دلچسپی لینے کا شوق پیدا ہوا ایسا شوق جس کا مقصد بچوں کی شخصیت سے آگاہ ہونا تھا۔

جہاں تک 'ایمیل' کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ دو مختلف حصوں پر لکھی گئی ہے۔ ایک طرف وہ 'فطری انسان' کے لیے موزوں ہونے والی تعلیم کو بیان کرتا ہے۔ اور دوسری طرف انسان کی فطرت کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان دونوں سطحوں پر وہ اس بنیادی مقصد سے آغاز کرتا ہے کہ اس کے زمانے کے فلسفی اور ماہر تعلیم بچپن کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ بالغوں کو الزام دیتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کے ذہن کا تصور کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

وہ لکھتا ہے کہ:

''بچوں کے دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کے اپنے انداز ہوتے ہیں۔لہٰذا اس سے زیادہ احمقانہ کوئی اور بات نہیں کہ ان کے ذہن کو دبا کر ہم بالغ لوگ اپنی ذہنیت کو ان پر نافذ کریں۔''(۶)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بچوں کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے اور تعلیم کے شعبے میں پہلا کام اس ذہنیت کو سمجھنا ہے روسو غالباً پہلا مفکر تھا۔ جس نے تدریس کے علم کو بچے کا سائنسی انداز میں فہم حاصل کرنے سے منسلک کیا۔ اس حوالے سے اکثر اوقات آج بھی بچوں کی نفسیات کے علم کا بانی ہونے کا اعزاز دیا جاتا ہے۔

'ایمیل' میں روسو لکھتا ہے کہ:

''فلسفی ہمیشہ انسان کو بچے میں تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر دھیان نہیں دیتے کہ انسان ہونے سے پہلے وہ کیا تھا۔'' (۷)

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:

"Correct education disposes the child to take the path that will lead him to truth when he has reached the age to understand it, and to godness when he has acquired the faculty of recognizing and loving it"(8)

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان فطرت سے جو تعلیم حاصل کرتا ہے...... یعنی ہماری قوتوں اور اعضا کی داخلی نشوونما...... وہ انسانی کنٹرول سے باہر ہے۔ لہٰذا انسانی تعلیم کا ہم آہنگ اور بااصول بیان نشوونما کے فطری انداز پر مبنی ہونا چاہیے۔

جان لاک(John Locke)ایک برطانوی مفکر تھا۔ وہ تجربہ پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دور میں مقبول عام ذہنی ملکیت(Faculty Theory) کے نظریہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اگر چہ اس نے اس نظریہ کو مکمل طور پر رد نہیں کیا لیکن اس نے رائے دی کہ:

> ''روح میں ذہنی ملکیت جیسی کوئی حقیقی شے نہیں ہے۔ اس نے اس بات کا بار بار اعادہ کیا کہ پیدائش کے وقت انسانی ذہن پختہ نہیں ہوتا۔ اور وہ کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ اس قابل ضرور ہوتا ہے کہ بیرونی دنیا سے حواس کے ذریعے تاثرات قبول کرے۔ اس طرح اس نے خواس خمسہ کے ذریعے تعلیم کے نظریہ کے آغاز کیا۔''(۹)

اس کے بعد ہونے والی دوسری اہم تبدیلی نفسیاتی ملکیت کا نظریہ ہے۔ اس کے مطابق ڈاکٹر محمد عارف ضیاء لکھتے ہیں:

> ''ذہن تین باہم مربوط حصوں یا قوتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا حصہ تفہیم اور استدلال کا ہے۔ دوسرا حصہ احساسات، خواہشات، جذبات اور بھوک کا ہے۔ اور تیسرا قوتِ ارادی کا ہے۔''(۱۰)

انیسویں صدی میں ''لپٹالوزی'' اور ''فریڈرک فروبل''(Friebrich Frobel) جیسے مصلح لوگوں نے زور دیا کہ تدریسی مواد کا انتخاب بچے کی دلچسپی اور اس کی ذہنی قابلیت کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔ لپٹالوزی اگر چہ ذہنی ملکیت(Faculty Theory) کے نظریہ کا پیروکار تھا۔ لیکن وہ پہلا ماہر تعلیم تھا جس نے تعلیم کو نفسیاتی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد فرد کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا تھا۔ اس نے تعلیم کے طریقے دریافت کیے۔ اور انسانی نشوونما کے اصول وضع کیے۔

نفسیاتی ملکیت کے نظریہ نے امریکن تعلیم کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس سے ایک نیا نظریہ ابھرا۔ جو تعلیمی حلقوں میں تعلیم کے رسمی ضبط کے نظریہ (Formal Discipline Theory) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نظریے کے مطابق مضامین میں مواد کی شکل وصورت اور اس کے ذہن کو منظم اور مضبوط بنانے پر زور دیا گیا۔

فروبل نے بچوں کے لیے ایک خصوصی طریقہ تعلیم مرتب کیا۔ جو کنڈر گاٹن(Kinder Garten) ہے۔

اگرچہ ڈیوی ماہر نفسیات نہیں۔ لیکن اس کے تعلیمی نظریات نے تعلیمی عمل اور تعلیمی سوچ کو بہت متاثر کیا۔

Experience and Education تعلیم پر ایک بہترین کتاب ہے۔ جس میں جان ڈیوی (John Devy) کہتا ہے کہ:

"Analyzing both "traditional" and "Prograssive" education. I insist that neither the old nor the new education is adequate and that each is misedacative because neither of them applies the principles of a carefully developed philosophy of experience"(11)

جان ڈیوی کا ماننا ہے کہ بچوں کو ان کی مرضی کے ماحول میں رہنے دیا جائے۔ اور ان کی دلچسپی کے مطابق نصاب ہونا چاہیے۔

"Childern should be allowed to explore their environments"(12)

دو عظیم جنگوں کے درمیانی عرصہ میں تعلیمی نفسیات کے میدان میں تین مزید اضافے ہوئے۔ ان میں پہلا اضافہ ''فرائڈ'' (Freud) کی تجزیاتی نفسیات سے ہوا جرمن ماہر نفسیات نے تعلیم سے متعلق ''گشالٹ'' کا نظریہ پیش کیا۔ اور ذہنی پیمائشوں کے سلسلے میں کئی مزید بیش رفتیں ہوئیں۔ فرائڈ کی تجزیاتی نفسیات سے تمام دنیا متاثر ہوئی۔ تعلیم بھی اس سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکی۔ فرائڈ کے نزدیک انسانی کردار کی تشکیل میں کچھ ایسے عوامل کار فرما ہوتے ہیں جن کے لیے ابتدائی بچپن کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینا بہت بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ گھر کے ماحول کا بچے کی تعلیمی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔

فرائڈ سے قبل جنسی کارکردگی کا آغاز بلوغت سے سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے فرائڈ نے جب طفل جنسیت کا نظریہ پیش کیا تو اس پر بہت زیادہ لے دے ہوئی۔ لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ فرائڈ سے پہلے بعض ماہرین اس نظریہ تک پہنچ چکے تھے لیکن ان ابتدائی ماہرین کے کام کی وجہ سے فرائڈ کی اہمیت کسی لحاظ سے کم نہیں ہوئی۔

فرائڈ کے نفسیاتی رجحانات کے مطابق جب ہم بچوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ بچے صرف اپنی ذات میں ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ جوں جوں یہ ذاتی دلچسپی کم ہوتی ہے تو دوسروں میں ان کی دلچسپی بڑھنا شروع ہو جاتی ہے اس طرح وہ اپنے سے محبت کرواتے ہوئے دوسروں سے محبت کرنا بھی سیکھ جاتے ہیں اگر بچے سے

پیار نہ کیا جائے تو وہ بھی دوسروں سے پیار کرنا نہیں سیکھتا۔ اور اپنی اس محرومی کو برداشت نہ کرسکتے ہوئے غیر شعوری طور پر اس سے نفرت کرتا ہے اور اپنے تصورات میں اس کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ اسی طرح ذاتی محرومی کے ساتھ موت کی خواہش وابستہ ہو جاتی ہے اس وجہ سے احساس گناہ، جو عموماً خوف و ہراس کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے اس خواہش کے ساتھ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن اگر حالات بہتر ہوں تو دوسروں کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور یہ محبت بچے پر محرومی کا کوئی اثر نہیں ہونے دیتی۔

اسی طرح بچے شروع سے ہی اپنی ماں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ آنکھ کھولتے ہی جس ہستی کو سب سے زیادہ قریب پاتے ہیں وہ ماں ہی ہوتی ہے۔ اور اس محبت میں وہ کسی طرح کی تقسیم برداشت نہیں کرتے۔ فرائیڈ کا ماننا ہے کہ: بچے کا یہ رویہ ذاتی تجربے کی بنا پر ہوتا ہے۔

فرائیڈ نے اس قسم کے خیالات مریضوں کے لاشعور میں تجزیہ نفس کے دوران معلوم کیے تھے۔ اس کے مطابق

> ''اگر یہ ذہنی اختلافات بچپن ہی میں دور نہ کیے جائیں۔ تو تعلقات پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ اور بعض اوقات اختلافات شدید صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ساری زندگی اسی کشمکش کا شکار ہو جاتی ہے بعض اوقات والدین کا اپنا ردعمل بھی بچے کے ان جذبات کو شدید کر دیتا ہے۔'' (۱۳)

چنانچہ فرائیڈ کے ان نظریات کی وجہ سے ابتدائی بچپن کی تعلیم کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ اور خود بچوں کی ذہنی صحت کے تحفظ کے لیے ذہنی صحت (Mental Health) کی تحریک شروع ہوئی۔

نفسیات کے مختلف نظام جیسے کرداریت، تحلیل نفسی، اور بصیرتی نفسیات انسانی رویہ اور تعلیم کو مختلف زاویوں سے پیش کر رہے ہیں۔ نفسیاتی حوالوں سے بچوں کی نشو ونما ایک بڑھتا ہوا اور پھلتا پھولتا مضمون ہے۔ اور ہر وقت وسعت پذیر ہے۔ اس میں روزانہ نئے موضوعات شامل ہو رہے ہیں اور نئے نئے پہلو پیش کیے جا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت نفسیاتی حوالوں سے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے اور اس میں تعلیمی عمل کے دوران وقوع پذیر انسانی اعمال و افعال کے تمام پہلو زیر بحث لائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ان میں قطعیت کی کمی ہے۔

بچے کی شخصیت کی متوازن نشوونما اور اس کی مخفی صلاحیتوں کو احسن طریقے سے اجاگر کرنے کے لیے تعلیم وتربیت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مفکرین نفسیات کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد شخصیت کی تعمیر ہے۔ اور ایسی تعلیم جو بچوں کی شخصیت کی نشوونما نہ کرے۔ اس سے بچوں کا محروم رہنا ہی بہتر ہے۔ لیکن شخصیت کوئی بنی بنائی چیز نہیں۔ اور نہ ہی اس کا انحصار صرف اچھے جسم اور خوبصورت خدوخال پر ہے بلکہ ایک متوازن شخصیت وہ شخصیت ہے۔ جس کے جسمانی، ذہنی، جذباتی، معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں کے درمیان تنظیم، یک جہتی اور اتحاد ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب ماحول اور تعلیم وتربیت کا اہتمام بہت ضروری ہے۔

دورِ جدید کے تصور تعلیم کے مطابق طالب علم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ بچے کے لیے جب یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ تعلیم کا محور اور مرکز بچہ ہے تو بچے کی نفسیاتی تقاضوں کی تسکین کرنا تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے نفسیات بچوں کی شخصیت نکھارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور معاشرے میں مطابقت کے طریقے سکھاتی ہے۔ نفسیات بچے کے مختلف ادوار جسمانی، ذہنی، جذباتی، معاشرتی تقاضوں کی تسکین کے طریقوں سے آگاہ کرتی ہے۔ بچے کی مکمل نشوونما کے لیے نفسیات یہ بتاتی ہے کہ بچے کا ہر پہلو ایک دوسرے سے ملحق ہے اس لیے بچے کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز کرنا اس کی شخصیت میں خلا پیدا کرنا ہے۔ جس سے بچے کی شخصیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لیے بچے پر انفرادی توجہ دے کر اس کی شخصیت کی مکمل نشوونما کی جائے۔

کسی بھی شخصیت کی احساساتی و جذباتی معاشرتی وسماجی اخلاقی و مذہبی طور پر نشوونما میں ادب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور بچوں کا ادب یہی فریضہ بخوبی سر انجام دیتا ہے۔ دنیا بھر میں بچوں کے لیے تعلیم وتربیت ذہنی و جذباتی و احساساتی نشوونما کے لیے ادب تحریر ہوتا ہے۔ نینسی اینڈرسن (Nancy Anderson) نے بچوں کے ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> "All books written for children, encluding works such as comic books, joke books, cartoon books, dictionaries and other reference materials"(14)

(ترجمہ) ''تمام کتابیں جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہوں جیسے کہ لطائف، کارٹون، افسانہ اور لغات وغیرہ سب بچوں کے ادب میں شمار ہوتی ہیں۔''

نینسی اینڈرسن (Nancy Anderson) کا خیال ہے کہ:

"There is no singed or widely used defination of children literature. It can be broadly defined as anything that children read, expect their course books."(15)

(ترجمہ)''بچوں کے ادب کی کوئی مخصوص تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی چیز جو بچے نصاب کے علاوہ شوق سے پڑھتے ہوں۔ اسے بچوں کا ادب کہا جاسکتا ہے۔''

پہلے زمانوں میں بچوں کا ادب زبانی کہانیوں، گانوں اور نظموں پر مشتمل تھا۔ جن کے ذریعے بچوں کو سکھایا اور بہلایا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں بچوں کے ادب کا اغاز ہوتا ہے۔

"Early children's literative consisted of spoken stories, songs, and poems, that would have been used to educate, instruct and entertian children. It was only 18thy century with the develpoment of the concept of Childhood"(16)

فرانسیسی تاریخ دان فلپ اریز(Philip Arie's)اپنی کتاب"Centuries of Childhood"میں بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''بچپن کا جدید تصور موجودہ وقتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ یعنی کہ پہلے وقتوں میں بچوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اور نہ ہی انہیں بڑوں سے علیحدہ سمجھا جاتا تھا۔

"The modren concept of 'childhood' only emerged in recent times, and that for the greater part of the history, children were not viewed as greatly different from adult, and were not given significently different treatment"(17)

سولہویں صدی میں بچپن کا تصور سامنے آیا بڑوں نے بچوں کو ایک مختلف اور معصوم ہستی سمجھا۔ جنہیں اپنی حفاظت اور نشوونما کے لیے بڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سترہویں صدی میں انگریزی زبان میں ایسی تخلیقات شائع ہوئیں جنہیں بڑوں کے علاوہ بچوں نے بھی پڑھا اور وہ بچوں میں اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچوں کے عالمی ادب میں لافانی حیثیت اختیار کر گئیں۔ اس لافانی سرمایہ میں 'ڈینیل ڈیفو'(Danial Defue) کی تخلیق 'رابنس کروسو'(Robins Crouse) اولین حیثیت رکھتی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ''گریم کی کہانیاں'' کی صورت میں دنیا بھر کے بچوں کو پریوں کی کہانیوں کا

ایک بیش قیمت خزانہ ہاتھ لگا۔ گریم برادارن کی یہ کہانیاں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ انہی دنوں ڈنمارک کے ایک ادیب ''ہنس کرسچین اینڈرسن'' (Hans Christian Anderson) پریوں کی کہانیاں لکھنے کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ کر رہے تھے۔ اینڈرسن کی کہانیاں بھی بچوں میں بہت مقبول ہوئیں۔

بچوں کے ادب میں 'ایلیس اینڈ دی ونڈر لینڈ' (Alis and the wonder land) کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے بچوں کے تخیل کی نشو ونما میں یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی اور دنیا بھر کے بچوں نے اسے پسند کیا۔

اسی طرح اُردو میں ''مولوی اسماعیل میرٹھی'' کی درسی کتابیں بچوں کے ادب کا بہترین سرمایہ ہین اور ان میں بچوں کے ادب کی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

بچوں کے ادب کی ضرورت کیوں ہے؟ عموماً یوں لگتا ہے کہ بچوں کے ادب کو آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ جیسے بچوں کے لیے کتابیں۔

بچوں کی کامیابی کے لیے انہیں ہر طرح کے ادب تک رسائی دینا بہت ضروری ہے۔ والدین، اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں میں پڑھنے کے رحجان کو تقویت دیں۔ ادب کا پڑھنا بچوں کے لیے بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔ ''ڈونا نورئن'' (Dona Norian) نے اپنی کتاب "Through the eye of a child" میں نوجوان نسل کے لیے ادب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو واضح کیا ہے کہ ادب بچوں کو سوچنے سمجھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے نیز بچے ادب کے ذریعے سے اپنی تہذیب اور ورثے کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے ہیں یہی ادب بچوں میں بہت ساری مہارتیں سکھانے کا سبب بنتا ہے۔ اور یوں ادب کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا جاتا ہے۔اس سے بچوں کو ادب سمجھنے اور اس کے بارے میں اپنی رائے دینے کا موقع ملتا ہے۔ بہترین ادب اپنے پڑھنے والوں کو ہر چیز کے بارے میں نہیں بتاتا جو کہ وہ جاننا چاہتا ہے بلکہ یہ ہر ایک کو مختلف معلومات فراہم کرتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک پڑھنے والا بعد میں پڑھنے والے کی نسبت کچھ مختلف سیکھے۔

دوسرے یہ کہ ادب کے ذریعے سے بچے نہ صرف اپنی ثقافت اور ورثے کے بارے میں جانتے ہیں۔ بلکہ یہ دوسرے لوگوں کی ثقافت اور ورثے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور بچوں کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ ان اقدار کو سیکھیں۔ کیونکہ بچوں میں اپنے اور دوسروں کے ورثے اور ثقافت کے بارے میں مثبت کردار کو پیدا کرنا اور سمجھنا ان کی انفرادی اور معاشرتی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ تاہم پڑھانے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ بچوں کو

تہذیب وثقافت کے بارے میں بتائیں اور کتاب کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیں۔

تیسرا یہ کہ ادب بچوں میں جذباتی کیفیات پیدا کرنے کا بھی سبب بنتا ہے کہانیوں میں اس قدر طاقت ہوتی ہے کہ وہ بچوں میں جذبائیت کو تقویت دیتی ہیں۔ بچوں کی کہانیوں میں کردار کو اکثر اوقات مشکل لمحات میں اہم اخلاقی فیصلے کرنے اور پھران کی وجوہات پر غور وفکر کرتے دکھایا جاتا ہے یعنی اس سے بچوں میں اخلاقی قوت اور مضبوط کردار کو پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے نیز بچوں کا ادب ان میں تخلیقات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور تصوراتی خیالات کو تقویت دیتا ہے۔ بچوں کا ادب اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ بچوں میں انفرادی اور معاشرتی ترقی کا کام کرتا ہے۔ جس کے ذریعے سے ان میں دوسروں کا خیال اور دوستی جیسے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں۔ نیز بچوں کا ادب بچوں کو دنیا کے بارے میں، دوسروں کے بارے میں اور خود کے بارے میں سکھانے کے لیے ایک کار آمد ذریعہ ہے۔ کیونکہ بچے ادب میں موجود کرداروں، واقعات اور مسائل سے خود سے ہم اآہنگ یا منسوب کرتے ہیں۔

بچوں کا ادب مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔ جیسے کہ ان میں تصویروں والی کتابیں، تاریخی کتب، خیالی کہانیاں، روایتی ادب، شاعری، آپ بیتی، سوانح عمری اور معلوماتی کتب شامل ہوتی ہے۔ بچوں کا ادب نہ صرف ذاتی دلچسپی کے لیے پڑھا جاتا ہے بلکہ تعلیمی نصاب کو تقویت دینے کے لیے بھی پڑھا جاسکتا ہے روایتی تعلیمی کتابوں کے علاوہ بچوں کا ادب بہت سے فائدے فراہم کرتا ہے اور ان سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

آج دنیا میں بچوں کے ادب کو جو منفرد مقام حاصل ہے وہ صرف ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ اس میں بچوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت بھی شامل ہے یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ بچوں کے ادب میں بے باکی، خود اعتمادی، جملوں کی ترکیب، ساتھ مل کر گانے کی عادت، حرکات و سکنات کے ذریعے جذبات کا اظہار، الفاظ کا صحیح طریقے سے ادا کرنا، عام معلومات میں اضافہ، گیتوں کے ذریعے اور کھیل کھیل میں تعلیم، بچوں کی طبیعت میں موزونیت پیدا کرنے والے اسباب وغیرہ شامل ہونے چاہیں۔

بچوں کے لیے ایسا ادب مہیا کیا جائے۔ جو بچوں کی کردار سازی، میں مفید ثابت ہو، بچوں کے مسائل بہ ظاہر بہت معمولی اور آسان نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے مسائل بھی ان کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بچے جھوٹ اور سچ، اچھے اور برے، خوشی اور غم، انصاف اور ناانصافی کے خیالی فرق کو سمجھ تو لیتے ہیں۔ لیکن اس کے عملی پہلو کو نہیں سمجھ سکتے۔ جو بڑوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی جانیوالی سبق آموز کتابوں

سے ان پر یہ باتیں واضح کی جاسکتی ہیں اور سیدھے سادے طریقے سے بتائی ہوئی باتیں ان پر اثر انداز بھی ہو جاتی ہیں اپنی کتابوں سے بچے یہ سیکھتے ہیں کہ سچ اور اچھائی کا صلہ ہمیشہ آخر میں ہی ملتا ہے اور جھوٹے اور لالچی لوگ ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہی چیزیں ہیں جنہیں بچے جاننا چاہتے ہیں لیکن شعوری طور پر اس بات کو محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنی پریوں کی کہانیوں اور سیر وتفریح کے واقعات وغیرہ میں سچائی ڈھونڈتے ہیں۔ جو ان میں خوشی اور گرمجوشی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے اس کی سچائی حقائق پر مبنی ہونی چاہیں۔ تاکہ وہ ان حقائق کو لے کر آگے چل سکیں۔

اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچپن کے تجربات کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ بچپن ہی کا زمانہ زندگی کے بننے سنورنے کا زمانہ ہوتا ہے اس زمانے میں بچے چیزوں کو زیادہ غور سے سمجھتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ زمانہ بہت کم مدت کا ہوتا ہے۔ ماہر نفسیات فرائڈ کے مطابق بچہ اپنی عمر کے ابتدائی چھے سالوں میں مکمل شخصیت کا حامل ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قیمتی وقت کو جس پر آئندہ آنے والی زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ یونہی ضائع نہ ہونے دیں اور بچے کی شخصیت کو بنانے کی سب سے اہم منزل کو فضول کتابوں کے پڑھنے میں ضائع ہونے کا موقع نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بچے بڑے ہو کر بھی پڑھتے رہیں گے۔ اور بعد میں اچھی کتابیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن جس بچے نے اپنے بچپن میں ہی بہترین ادب کا مطالعہ کر لیا۔ اور اپنی آئندہ زندگی کو بھی بہتر بنالیا۔ لہٰذا اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ بچپن ہی سے بچوں کو بہترین ادب سے روشناس کرائیں۔ تاکہ وہ آئندہ خود بھی اچھے ادب کا انتخاب کریں یہ کہنا غلط ہے کہ بچوں کا ادب ہوا میں معلق ہے اور اس کی کوئی مقررہ قدریں نہیں ہیں۔ جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کے ادب اور بڑوں کے ادب، دونوں کی قدریں مشترک ہیں۔ اس لیے اُردو میں بچوں کے ادب کی ایک نمایاں حیثیت ہونی چاہیے۔

سی۔ایل۔ لیو کا کہنا ہے کہ:

"وہ ادب معیاری نہیں ہے جس سے ہم دس سال کی عمر میں تو لطف اندوز ہوسکیں۔
مگر پچاس سال کی عمر میں نہ ہوں ادب کے معیاری ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ ہر عمر
اور ہر زمانے میں لوگ اس سے لطف اندوز ہوں۔"(۱۸)

ہمارے ادیبوں کی یہ ناانصافی ہے کہ وہ بچوں کو بھلا بیٹھے ہیں انہوں نے بچوں کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ

ان کے لیے معیاری ادب تخلیق کیا جائے۔ اچھے اور برے ادب میں تمیز کرنے کی امید بڑوں سے بھی اس وقت تک نہیں کر سکتے جبکہ انہیں خود اپنے بچپن میں اچھا ادب پڑھنے کو ہی نہ ملا ہو۔ بچوں کے ادب کی تخلیق بھی ایک فن ہے۔ اس کو صرف ایک ذریعہ ہی نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ بامقصد بھی ہونا چاہیے کتاب واقعات کا پلندہ نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

بچے کے لیے کوئی بھی کتاب اس لیے اچھی ہوتی ہے کہ وہ اس کے لیے تجربے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ جب بچہ کسی کتاب کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ کچھ آگے پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کی شخصیت میں بہ حیثیت ایک فرد کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اور نئے خیالات کو سمجھنے اور نئے تجربات کو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کے ادب کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور کی اچھی کتابیں تو باقی رہ گئی ہیں اور بیکار کتابیں اسی زمانے کے ساتھ ہی ختم ہوگئی ہیں بچوں کے ادب کے لیے ایک معیار قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو بچے کے ذہن کو زیادہ متاثر کر سکے اور جس کے پڑھنے سے اسے سچی خوشی حاصل ہو۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تھوڑا بہت معمولی قسم کا ادب پڑھنے سے بچوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ایسا کہنا غلط ہے۔ کیونکہ ادب اچھا ہو یا برا، کارآمد ہو یا فضول اس کا بچوں پر اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بچپن کا زمانہ جو بہت کم عرصے پر محیط ہوتا ہے بہت زیادہ اہم اور قیمتی ہوتا ہے بچے حساس ہوتے ہیں۔ اور ہر چیز کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس لیے اس نایاب عرصے میں بچے کو ایسا ادب مہیا کیا جائے جو اس کی شخصیت سازی میں مدومعاون ثابت ہو۔ ان باتوں کے پیش نظر بچوں کے لیے عمدہ اور کارآمد ادب کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

بچوں کو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کا مطالعہ شروع سے ہی ان میں اچھے اور برے ادب کی تمیز پیدا کر سکے۔ اور یوں وہ خود کو اس قابل بنا سکیں گے کہ وہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔

بچوں کا ادب یوں بھی ضروری ہے کہ یہ ایک لازوال روایت ہے جن میں کتابیں ایک نسل سے دوسری نسل تک ہمارے ادبی ورثے کو منتقل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ بچے جو کہ بہت کم عرصے کے لیے چھوٹے رہتے ہیں۔ ان کی رسائی بہترین اور لازوال ادبی ورثے تک ہونی چاہیے۔ بہترین ادب بہت ساری نسلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بچوں کے ادب کے حوالے سے شاعری بہت اہم اور لازمی جز ہے ہم تک زیادہ تر کہانیاں نظموں یا شاعری کی صورت میں پہنچتی ہیں۔ بچپن میں جو کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ وہ زیادہ تر نظموں کی صورت میں ہی ہوتی تھیں۔ بچوں کو نظمیں کیوں پسند ہوتی ہے؟ کیا بچوں کی نشوونما میں نظمیں اہم ہیں؟ یقیناً ہیں۔ نظمیں زبان کی نشوونما، ذہنی نشوونما، جذباتی نشوونما اور جسمانی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

نظموں کا اونچی آواز میں پڑھنا یا دہرانا بچوں کے بول چال کے مشغلے، آواز کے اتار چڑھاؤ، اور مقدار کو سمجھنے میں مدد یتا ہے۔ اسی طرح نظمیں جسمانی نشوونما میں بھی مدد ملتی ہیں۔ سانس آہنگ، زبان اور منہ کی حرکات کو نظموں کے سریلے نظام سے آسان بنایا جاسکتا ہے۔ نظمیں بچوں کے لیے ایک بہترین ماحول فراہم کرتی ہیں۔ کیونکہ انہیں پڑھنے میں بچوں کو آسانی ہوتی ہے۔

اسی طرح شاعری کے ذریعے سے بچے الفاظ کی پہچان سیکھتے ہیں۔ کہ بہت سے الفاظ جو آواز میں تو ایک جیسے ہیں۔ لیکن وہ معانی کے لحاظ سے مختلف ہیں وہ نقوش کے بارے میں سیکھتے ہیں۔ اور پھر ان کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں انہیں نظموں کو یاد کرنا اچھا لگتا ہے اور اسی طرح سے وہ نئی زبانوں کو بھی سیکھتے ہیں۔

نظموں کے ذریعے سے بچوں کی جذباتی نشوونما میں بھی مدد ملتی ہے۔ بچوں کو صرف محنتی اور پڑھائی میں اچھا بنانا ہی ایک مقصد نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے بارے میں اور اپنے جذبات کے بارے میں بھی جان سکیں اور دوسرے بچوں کے ساتھ ایک اچھا اور دوستانہ رویہ بنا سکیں۔ نظمیں بچوں کے حس مزاح کو بھی بڑھاتی ہیں۔ بچے خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں یا سکون چاہتے ہیں تو وہ ان نظموں کو دہراتے ہیں۔ جو انہوں نے یاد کی تھیں۔

چونکہ بچوں کا مانوس گانوں اور نظموں کا یاد کرنا ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے اور چھوٹے بچے نئی آوازوں اور لفظوں کو سیکھنے اور سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں بہت ساری یادگار اور مشہور کہانیاں، نظموں کی صورت میں موجود ہیں۔ جو بچے بہت چھوٹی عمر سے ہی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بڑے ہو کر پڑھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ پڑھائی بہت ضروری چیز ہے۔ اور جو بچے پڑھنے کو پسند کرتے ہیں وہی عام طور پر نیا سیکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔ یہ بہت بہترین ہے کہ بچوں کو بہت چھوٹی عمر سے ہی اس قسم کی سرگرمیوں میں شامل کیا جائے۔

"Experts and Literary and child develpoment have discovered, that if children know eight nursery rhyms by heart by the time they're four years old, they are usually

among the best reader by the time they are eight"(19)

اُردو زبان میں بچوں کا ادب کئی رنگ اور روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس شق میں نصاب کی وہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ جو بچوں کو سبقاً پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے مختصر حجم کی کہانیاں، قصے، افسانے، ڈرامے اور اس نوع کے دوسرے مضامین ہیں۔ ان سے بچوں کے لیے ایک فیصد شغل مہیا ہوتا ہے اور ان کے خیالات و جذبات، ان کے ذہن اور جمالیاتی ترتیب کی نشوونما ہوتی ہے۔

اُردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے نظم اور نثر کی صورت میں ترقی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچوں کی ابتدائی نصاب میں فارسی کتابیں شامل تھیں۔ اور حکومت کا کاروبار فارسی زبان میں ہوتا تھا۔ ان ابتدائی کتابوں میں نظم و نثر میں بچوں کی ذہنی ضرورت کا فقدان تھا۔ اردو میں بچوں کے ادب پر ایک زمانے تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو نظر انداز کردیں تو دور دور اس ادب کی نمایاں جھلک نظر نہیں آتی۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد جب انگریز برصغیر پر قابض ہوئے۔ تو انہیں اپنی حکومت اور مقاصد کی کامیابی کے لیے اُردو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور ہندوستان کے ساتھ ربط وضبط بڑھانے کے لیے ملک کی مختلف مقامات خصوصاً کلکتہ، دہلی اور لاہور میں خاص کوششیں عمل میں آئیں۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو کی اشاعت اور ترویج میں مدد ملی۔ اس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حاؔلی، منشی پیارے لال، پنڈت حسن پھول اور مرزا ارشد گورگانی جیسے اُردو سے لگاؤ رکھنے والے بزرگ لاہور میں موجود تھے۔ ان بزرگوں کی توجہ اور کوشش سے ہالرائڈ کی تجویزیں کامیاب ہوئیں۔ طویل قصے، کہانیاں، داستانیں اور عشقیہ افسانوی شاعری کے نمونوں کا جائزہ لے کر اس میں اصلاح کی گئی۔ اور زمانے کی ضرورتوں کے پیش نظر ہر طرح کے تراجم سے اُردو مالا مال ہوگئی۔ بچوں کے مطلب کی کتابیں بھی تیار ہوئیں درسی اور غیر درسی کتابیں ترتیب دی جانے لگیں۔ اردو کی ابتدائی درسی کتابوں میں مولانا آزادؔ کو امتیازی شہرت حاصل ہے۔ یو۔ پی۔ او حیدر آباد میں اسماعیل میرٹھی صاحب کی ریڈرس اور مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تیار کی ہوئی انجمن ترقی اردو کی بچوں کی کتابیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ حاؔلی، شبؔلی، آزادؔ، اسماعیل میرٹھی، اقباؔل، مسرور جہاں آبادی محروم وغیرہ نے بچوں کے اخلاق و عادات اور ان کی ذہنی نشوونما سے متعلق مفید اور ادبی حسن سے آراستہ نظموں کی تخلیق کے ذریعے

بچوں کے ادب کی مضبوط بنیاد رکھی۔ رسائل اور اخبارات کے کالموں میں اس ادب کی نمایاں جگہ دی گئی۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ ''پھول'' کی مقبولیت سے اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ بعد کے دور میں اس رجحان کی لے تیز ہوگئی۔ ممتاز ادیبوں نے اس حصہ ادب کو معیار و منہاج تک پہنچایا۔ بقول شفیع الدین نیؔر:

بچوں کے ادب کو ترقی بیسویں صدی میں ملی جب کہ اس کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوچکی تھی۔ بچوں کے ادب کی وجہ سے کئی ادارے اور اشاعت گھر چلے مثلاً ''دارالاشاعت'' پنجاب، ''فیروز سنز'' لاہور، ''انڈین پریس'' الہ آباد، ''نسیم بکڈپو'' لکھنو اور ''عبدالحق اکادمی'' حیدرآباد وغیرہ بچوں کے ادب کے سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بچوں کے لیے جن اصحاب نے نظم ونثر میں کچھ کام کیا ہے اگر جستجو کی جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچے گی اور دو تین درجن نام تو ایسے مل جائیں گے۔ جن کی تخلیقات کی افادیت اور مقبولیت نے بچوں کے اُردو ادب میں امتیازی مقام حاصل کر لیا ہے۔ منشی سورج نارائن مہؔر، مولانا محمد حسین آزؔاد، خواجہ الطاف حسین حاؔلی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، ڈاکٹر محمد اقباؔل، منشی تلوک چند محرؔوم، چکبست لکھنوی، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر، مائل خیر آبادی، لطیف فاروقی اور شفیع الدین نیؔر وغیرہ نظم نگاروں میں اور منشی پریم چند، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر محمد مجیب، کرشن چندر، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر اطہر پرویز، عادل رشید وغیرہ بلند پایہ نثر نگاروں کو کون بھلا سکتا ہے۔

بچوں کا ادب اس وقت تک بچوں کا ادب کہلانے کا مستحق نہیں جب تک لکھنے والا خود اپنے آپ کو بالکل بچہ ہی نہ بنالے۔ اور اسی انداز سے سوچنے سمجھنے لگے اور بچوں کے لیے لکھے۔ ایک نامور ادیب کا یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ بچوں کا ادب اس کے لیے ایک کم درجہ کی چیز ہے۔

اُردو میں بچوں کے ادب کے نقوش ہمیں ابتداء ہی سے دوہے اور پہیلیوں وغیرہ کے روپ میں ملتے ہیں۔ میر تقی میر کے کلام میں بچوں کے لیے چند نظمیں مل جاتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ پھر محمد حسین آزؔاد، حاؔلی، اسماعیل میرٹھی اور اقباؔل وغیرہ نے بچوں کے لیے بہت بہترین لکھا۔

اردو میں بچوں کا ادب ایک نئی نظر کا محتاج ہے۔ ہمارا سرمایہ دوسری زبانوں کے بچوں کے ادب کے مقابلہ میں کم درجے کا ہے۔ اچھے فنکاروں نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین تخلیقی فنکاروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس ادب کی تخلیق کے لیے معاشرت کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی افتاد،

شعور، نفسیات اور احساسات وغیرہ کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اور زبان پر اس حد تک قدرت درکار ہے کہ آسان مبہم زبان میں موثر طریقہ پر ماضی الضمیر سمجھا سکیں۔

ب: اُردو میں بچوں کی شاعری، ادیب، رسائل اور اداروں کی اہمیت

پاکستان میں بچوں کے ادب کے آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ برصغیر پاک و ہند میں بچوں کے ادب نے کس دور میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس حوالے سے بچو ں کے ادب پر دسترس رکھنے والی مختلف علمی و ادبی شخصیات نے جو رائے قائم کی ہے، اُن میں سے چند صاحبِ علم اور فضل کی آراء پیش کی جا رہی ہیں تا کہ بچوں کے ادب کے ارتقاء کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکے اور موجودہ صورت حال کا درست تعین کیا جا سکے۔

پاکستان میں بچوں کے ادب پر تحقیقی کام کرنے والے ممتاز سکالر، ڈاکٹر محمود الرحمٰن کی رائے میں :

> ''اُردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے ۔ اُس زمانے میں نوعمر افراد کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو زیادہ تر لغت پر مشتمل تھیں۔ مثلاً خالقِ باری ، ایزدِ باری، اللہ باری وغیرہ۔ بچوں کے ادب میں 1857ء کی جنگ آزادی ایک سنگِ میل رکھتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس ناکام انقلاب نے جہاں زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا ، وہاں اُردو زبان و ادب پر بھی خاصا اثرانداز ہوا۔ ان بدلتے ہوئے حالات نے بچوں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ محمد حسین آزاد ، الطاف حسین حالی ، اسماعیل میرٹھی، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری اور دیگر ممتاز علمی و ادبی شخصیات نے نظم ونثر کے ذریعے بچوں کے ادب کو زیب و زینت بخشی۔ اس کے اگلے مرحلے میں علامہ اقبال ، تاجورنجیب آبادی، اختر شیرانی، منشی پریم چند، حفیظ جالندھری ، غلام عباس اور دیگر بے شمار اہلِ قلم نے بچوں کے ادب کو پروان چڑھایا۔''(۲۰)

دراصل برصغیر میں بچوں کے ادب کے آغاز و ارتقاء کے تاریخی پس منظر کو واضح کرنے کے لیے ابتداء سے 1857ء اور 1947ء سے آج تک دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی نے

برطانوی حکومت کو ہندوستان میں استحکام بخشا۔ اس کے ساتھ ہی اس جنگ نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ملک وقوم کی ناگفتہ بہ حالت اور پسماندگی کو دور کرنے اور انھیں بے چارگی و مایوسی کے غلبہ سے نجات دلانے کے لیے اُس دور میں اپنی تہذیب وتمدن اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی میراث کے لیے ادب کو بھی وسیلہ قرار دیا گیا تاکہ بچوں کو نئے خیالات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔

پاکستان میں بچوں کے ادب پر سب سے پہلے پی ایچ ڈی کرنے والی شخصیت ڈاکٹر اسد ادیب نے برصغیر میں بچوں کے ادب کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے:

> ''اُردو میں بچوں کے ادب کی بنیاد شمالی ہند اور پنجاب میں پڑی۔ یہ ادب مدرسوں کے اخلاقی نصاب کا حصہ تھا جو بچوں کو مظاہر فطرت سے محبت دلاتا، اشیائے صرف کے ناموں کی تعلیم دیتا، پرندوں، پھولوں، رنگوں، چاند ستاروں کی روشنی کے قریب لانا، ہمارے اُردو ادب میں امیر خسرو بچوں کے پہلے ادیب ہیں۔ جنھوں نے شعر وشاعری اور منظوم نثر کے ذریعے تعلیم وتفریح کو یکجا کیا۔ اس کے بعد نذیر احمد، محمد حسین آزاد نے بچوں اور خواتین کے لیے قصّے اور کہانی کو معاشرتی اصلاح اور قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔'' (۲۱)

جب ہم بچوں کے ادب کے آغاز و ارتقاء کی بات کرتے ہیں تو خیال سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی کی نظموں اور محمد حسین آزاد کے اُن چھوٹے چھوٹے نثر پاروں کی جانب جاتا تھا جو اُن کی درسی کتابوں میں شامل تھے۔ محمد حسین آزاد کی نثر ایک طلسماتی انداز کی نثر تھی جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ لیکن بہرحال بچوں کے ادب کے سلسلے میں اوّلیت کا سہرا ''مرزا غالب'' کے سر ہے۔ ''قادر نامہ'' کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب بچوں کے ادب کی ضرورت سے غافل نہیں تھے اور بالکل یہی بات علامہ اقبال کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے بھی بچوں کے حوالے سے بے حد عمدہ، سبق آموز اور خوبصورت نظمیں لکھیں ہیں۔

بچوں کے ادب کی تاریخ، اُردو کی تاریخ سے کہیں زیادہ مختصر ہے۔ اُردو میں علمی و ادبی کتابوں کا سلسلہ تو انیسویں صدی کے آغاز سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بچوں کے ادب کی جانب توجہ بہت بعد میں ہوئی۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ انگریزی زبان و ادب کی بدولت جب جدید خیالات نے ہندوستان میں رجحان پایا تو

بچوں کے ادب کی ضرورت کا احساس بھی عام ہونے لگا۔ دہلی اور پنجاب میں اُردو کا بازار گرم ہوا۔ محمد حسین آزاد ، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد جیسے شہرۂ آفاق ادیبوں اور شاعروں نے اُردو شعر و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کتابیں تصنیف کیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ بچوں کے ادب کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہو چکا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں اس کی تخلیق و اشاعت کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا اور بچوں کے لیے عمدہ کتابیں شائع ہونے لگیں۔ دہلی، لاہور، حیدرآباد، دکن اور لکھنؤ دارالاشاعت پنجاب، فیروز سنز لاہور، انڈین پریس الہٰ آباد، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، عبدالحق اکادمی حیدرآباد اور مکتبہ جامعہ نئی دہلی ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بچوں کے ادب کی کیا صورت حال رہی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسد ادیب نے اپنی کتاب ''بچوں کے ادب : تجزیے اور تجاویز'' میں لکھا ہے:

> ''14۔اگست 1947ء کو آزادی کی رات کے بعد جب صبح طلوع ہوئی۔ ہم ایک نئے عزم اور نئی امنگ کے ساتھ اُٹھے۔ ہمارے دل و دماغ طرح طرح کے خیالات سے روشن تھے۔ معیشت، سیاست، تعلیم ، حکمت اور حکومت کے ہر شعبے میں ہمارا ذہن تبدیلیوں پر آمادہ تھا۔ خاص طور پر ترقی پسندانہ خیالات کے پُر جوش خامیوں کا کہنا تھا کہ ادب کو زندگی کے قریب تر رکھا جائے۔ یہ پُکار اُن اہلِ قلم کے کانوں تک بھی پہنچی جو بچوں کے لیے نیا ادب لکھنا چاہتے تھے۔ گو کہ تجزیہ بتلاتا ہے کہ ان اداروں نے قومی نقطۂ نظر کی نسبت اپنے اقتصادی مفادات کی خاطر بھی یہ کام کیا۔ لیکن یہ بات ماننے والی ہے کہ بچوں کے رسالوں سے پاکستان میں بچوں کے ادب کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔ پاکستان کی نظریاتی اساس کا پہلو بچوں کے لیے اُن نئے رسالوں میں نمایاں ہو کر اُبھرا۔ جو برصغیر کی تقسیم کے ابتدائی برسوں میں نکلے۔ ان رسالوں نے بچوں کے ادب کو نئے تفریحی اور معلومات ادب سے مالا مال کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد انہی رسالوں کے ذریعے پاکستان میں بچوں کے ادب کی تشکیل ہوئی۔''(۲۲)

جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بڑوں کے ادب کے ساتھ بچوں کے ادب کی ضرورت بھی پیش آنی

چاہیے تھی اور پیش آئی۔ اس وقت سب سے پہلی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ بچوں کے لیے ایسی کتابیں لکھی جائیں جنھیں پڑھ کر بچوں کو تحریکِ پاکستان، مقاصدِ پاکستان اور جدوجہدِ آزادی سے آشنا ہونے کا موقع مل سکے۔ لہٰذا اس حوالے سے معلوماتی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں اور ایسی کتابیں بھی جو تحریکِ پاکستان کے احوال و کوائف کو واضح کرتی تھیں۔ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔ اس چیز نے ہمارے مصنفوں کو اسلام کی جلیل القدر ہستیوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کی ترغیب دی۔ اس کے نتیجے میں ان عظیم مسلمانوں کے حالاتِ زندگی الگ الگ کتابوں میں محفوظ کر کے پڑھنے والوں تک پہنچائے گئے۔

ممتاز ماہرِ تعلیم اور بچوں کے ادب پر تحقیقی کام کرنے والے اور تحقیقی نظر رکھنے والے ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے مطابق:

> ''قیامِ پاکستان کے بعد بچوں کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں قطعاً مایوسی نہیں ہوتی۔ اس مختصر سے عرصے میں ادب الاطفال نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔'' (۲۳)

قیامِ پاکستان کے بعد بچوں کے ادب کی خوش کن پیش رفت کے حوالے سے جو نقطۂ نظر سامنے آیا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ماہنامہ کتاب 'لاہور' میں اپنے مضمون 'پاکستان میں بچوں کا ادب' میں لکھا:

> ''قیامِ پاکستان کے بعد بچوں کے ادب کے نام پر جو کچھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا کثیر حصہ قطعاً غیر معیاری ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ ناشرین نے مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے تو کسی بھی صورت غلط نہ ہوگا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں، اُن کے مواد اور اُن کی پروڈکشن کا جائزہ ثابت کرتا ہے کہ پاکستان میں بچوں کا ادب ابھی یورپ کی انیسویں صدی کے دور سے بھی نہیں نکل پایا۔''(۲۴)

قیامِ پاکستان کے بعد بچوں کے ادب کی تخلیق و اشاعت کا جائزہ لیتے وقت یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی ملک کے لٹریچر کے فروغ اور اشاعت کا دار و مدار اُس ملک کی شرحِ خواندگی پر ہے۔ جوں جوں خواندگی کا تناسب بڑھتا ہے۔ ادب کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہمارے ہاں شرحِ خواندگی بارہ تیرہ فی صد تھی۔ جبکہ اس وقت تقریباً 35 فی صد ہے۔ تعلیم کے فروغ کی وجہ سے عوام میں مطالعے کا ذوق بڑھ رہا ہے۔ دراصل وطنِ عزیز پاکستان میں یہ کچھ دستور سا بن گیا ہے کہ اُردو کا کوئی بھی ناقد بچوں کے ادب پر تبصرہ

کرنے بیٹھتا ہے تو اس جملے سے شروع کرتا ہے کہ اُردو میں بچوں کا معیاری ادب سرے سے ہے ہی نہیں۔ اب تک جتنی کتابیں چھپی ہیں وہ معنوی اعتبار سے گھٹیا اور صوری لحاظ سے بھونڈی اور غیر دلکش ہیں۔ یہ اُن ناشرین کتب کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے جو نقصان کا خطرہ مول لے کر تہذیبی اور مستقل مزاجی سے بچوں کے لیے اعلیٰ ادب پیش کر رہے ہیں۔ ان مطبوعات کا نفسِ مضمون بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ بچوں کے ادب پر نصف عرصے سے زیادہ سرگرم ماہنامہ ''ہمدرد نونہال'' کراچی کے مدیرِ اعلیٰ مسعود احمد برکاتی کہتے ہیں:

> ''پاکستان بننے کے بعد مسائل زیست کے ہنگاموں اور معاش و اقتصاد کے فوری تقاضوں کی وجہ سے کتابوں کی رفتارِ اشاعت بہت کم تھی۔ قدرتی طور پر بچوں کے لیے کتابوں کی تالیف و اشاعت بھی محدود تھی۔ لیکن سیاسی عدم استحکام کے باوجود معاشرتی استحکام اور صنعتی سرگرمیوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مشاغل میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کے زیرِ اثر بچوں کی کتابوں اور رسالوں کی اشاعت میں بھی اضافہ ہوا۔ پاکستان کی پہلی دہائی میں بچوں کے گنتی کے چند رسالے شائع ہوئے تھے۔ آج ان کی تعداد کم از کم چالیس کے قریب ہے۔ اس تعداد کو حوصلہ افزاء کہا جا سکتا ہے۔'' (۲۵)

قیامِ پاکستان کے بعد سرکاری اور پرائیویٹ سطح پر جو علمی، ادبی اور تحقیقی ادارے وجود میں آئے انھوں نے کم یا زیادہ بچوں کے ادب کی ترویج میں حصہ ضرور لیا اور اُن کے اس کم یا زیادہ تعاون کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آج اگر بچوں کا ادب اس مقام پر ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں اُن اداروں کا بھی اپنا اپنا ایک کردار ہے۔ اب اُن ہی میں سے چند اہم اور بڑے اداروں کا یہاں ذکر کیا جائے گا جنھوں نے بچوں کے ادب کے حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔

نئی نسل کسی بھی ملک کے مستقبل کی معمار ہوتی ہے۔ آج کے بچے کل جوان ہو کر اہم ملکی ذمہ داریاں سنبھالیں گے۔ آج نئی نسل کی تربیت جس انداز میں کی جائے گی، کل اِسی قسم کے اثرات پوری دُنیا کے سامنے ہوں گے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں جہاں والدین اور اساتذہ کا کردار بہت نمایاں ہے وہیں بچوں کے رسائل کے مثبت یا منفی اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بچے اور پھول دونوں قدرت کے عظیم عطیے ہیں۔ بچے کا معصوم سا چہرہ پھول کی مانند ہوتا ہے تو پھول بھی

بچے کی طرح نرمی و نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ پھول اور بچے ایک ہی احساس کے دو نام ہیں۔ پھول کی نشوونما کے لیے جہاں اچھی زمین اور مناسب آب و ہوا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح بچے کی نشوونما اور تربیت کے لیے گھر کے اندر اور گھر کے باہر کا ماحول خوشگوار ہونا بہت ضروری ہے۔ ہر بچہ فطرتِ سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اس کا ماحول اسے یہودی، نصرانی و مجوسی یا مسلمان بناتا ہے۔ یہ ارشادِ گرامی ہمارے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ اس ارشاد مبارک کی روشنی میں بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی ضرورت و اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہے۔ اس کے بعد اردگرد کا ماحول اسے متاثر کرتا ہے۔ جب وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوتا ہے تو کہانیوں کی کتابیں اور بچوں کے رسائل اس کی شخصیت اور کردار پر نمایاں اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان اثرات کی ہمہ گیر اہمیت کے پیشِ نظر ہر دور میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اس اہم ذریعہ کو اپنایا جاتا رہا ہے۔

یوں تو کہانی سننا بچوں کی فطرت میں شامل ہے۔ ایک دور تھا کہ جب دادی یا نانی اماں شام کے سائے ڈھلتے ہی گھر بار کے بچوں کے اصرار پر اپنے بچپن کی سنی سنائی کہانیاں سناتیں۔ جب یہ کہانیاں ختم ہو جاتیں تو بچوں کا مطالبہ اپنی جگہ موجود رہتا تھا۔ بڑی بوڑھیوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ادھر اُدھر کی باتیں جوڑ کر نئی کہانی بنا ڈالی اور یوں بچوں کو بہلاتیں تھیں۔

آج کے دور میں جبکہ ٹمٹماتے دیئوں کی جگہ آنکھوں کو چندھیا دینے والا بجلی کی قمقموں نے لے لی ہے۔ ریڈیو کی بجائے گھر گھر میں ٹی وی اور کمپیوٹر کا راج ہے اور انٹرنیٹ کا تیز ترین دور ہے۔ ایسے میں تاروں کی چھاؤں میں کہانی سنانے والی دادی یا نانی اماں رہیں اور نہ ہی آج کے بچوں کو غیر حقیقی اور غیر فطری کہانیاں سننے کی فرصت ہے۔

اس تیز رفتار دور نے ماضی کے پڑاؤ اور سکون میں شور برپا کر دیا ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش نے تمام اخلاقی اقدار و روایات کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بچوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی اب نہ کسی کو فرصت ہے اور نہ ضرورت ہے۔ روپے پیسے کی ریل پیل نے خاتونِ خانہ کو سوسائٹی کی محفلوں میں اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اس کے پاس بچوں کے لیے کوئی وقت نہیں بچتا۔ خادمائیں اور مامائیں بچوں کو جیسی تربیت کر سکتی ہیں۔

وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سوسائٹی میں مقام بنانے کی فکر نے والدین کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ انھیں اپنے بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا کوئی ہوش ہے نہ فکر ہے۔ تعلیمی ادارے جہاں پر بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہاں اساتذہ کتابوں کے بے جان حرف و الفاظ ان کے ذہنوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ کلاس میں پوزیشن حاصل کرسکیں۔ انھیں یہ فکر نہیں ہے کہ درسی کتب کے صفحات پر پھیلے ہوئے الفاظ و حروف پڑھانے اور رٹا دینے سے ان کی ذمہ داری پوری نہیں ہوتی۔

ان حالات میں یہ کس کی ذمہ داری ہے کہ نئی نسل کو معاشرے کا ذمہ دار شہری بنائے۔ اس کے اخلاق و کردار کو سنوارے۔ اس کو اقدار و روایات سے آگاہ کرے۔ یہ اہم مسئلہ سوالیہ نشان بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان حالات میں بچوں کے رسائل نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی سب اچھا نظر نہیں آتا۔ کسی نے اپنے شوق کی خاطر رسالہ نکالا ہے تو کسی نے سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لیے رسالہ نکالا ہے۔ ایسے میں بچوں کے کچھ رسائل ایسے ضرور ہیں جو کسی مقصد اور مشن کے تحت نکل رہے ہیں۔ گنتی کے ان رسائل میں بجا طور پر نئی نسل کی تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھ کر تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا دائرہ کار اور حلقۂ اثر بھی معاشرے میں پوری طرح محسوس نہیں ہوتا۔ ہر چھوٹے اور بڑے رسالے کا اپنا مخصوص حلقۂ قارین بن چکا ہے۔

بہرحال بچوں کے رسائل کے کردار کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بچوں کے رسائل کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی تمام تر تحریریں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر شائع کریں اور اس بات کا اہتمام کریں کہ ان تحریروں کے ذریعے بچوں میں غیرمحسوس طور پر اسلام اور پاکستان سے محبت پیدا ہو۔

اس وقت پوری دنیا کو مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں سیٹلائیٹ سسٹم نے دنیا کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ پہلے ہی مطبوعہ صحافت کو ملک کے اندر ٹیلی وژن اور کمپیوٹر جیسے تیز ترین ذرائع ابلاغ کا سامنا ہے۔ نیز جدید ذرائع ابلاغ نئی نسل کی دلچسپی اور توجہ کے کئی سامان پیدا کر رہے ہیں اور جن سے بچے بہت کچھ سیکھ بھی رہے ہیں۔ ان حالات میں بچوں کے رسائل کے ذمہ داران کو سوچنا چاہیے کہ اپنے وجود کی بقا اور تحفظ کے لیے ان کا کردار اور رویہ کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں ابھی سے سوچ بچار اور لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس موقع پر بھی روایتی سستی کا مظاہرہ کیا گیا تو اس بات کا امکان ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی بڑھتی ہوئی یلغار کا مقابلہ مطبوعہ ذرائع ابلاغ کے بس میں نہیں رہے گا۔ اس لیے ممکنہ خدشات کا مقابلہ کرنے اور نئی نسل کو بے مقصدیت اور

لا دیئیت سے بچانے کے لیے غیر معمولی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جن شخصیات نے ابتدائی اور بنیادی کردار ادا کیا۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا اسماعیل میرٹھی اور مولانا الطاف حسین حالی بہت نمایاں ہیں۔ ان تینوں حضرات نے اپنی آسان فہم اور دلنشیں نثر اور نظم کے ذریعے غیر محسوس طور پر ملک کے معماروں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی کوشش کی۔

بیسویں صدی کے آغاز پر برصغیر پاک و ہند میں بچوں کے لیے رسائل کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے ہفت روزہ اخبار نکلنے شروع ہوئے۔ یہ رسالے سے زیادہ اخبار ہوا کرتے تھے۔ ان میں عظیم شخصیات کے حالات و واقعات ، ایک آدھ کہانی، دو تین لطیفے اور ایک آدھ نظم یا گیت ہوتے تھے۔ اُس کے بعد حالات و زمانے کے ساتھ ساتھ بچوں کے رسالے ماہناموں کی شکل میں اور کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار پر شائع ہونے شروع ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل منشی محبوب عالم نے لاہور سے بچوں کے لیے پاک و ہند کا سب سے پہلا رسالہ ''بچوں کا اخبار'' شروع کیا۔ ''بچوں کا اخبار'' میں اخلاقی، معلوماتی مضامین، نظمیں اور سبق آموز کہانیاں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں لاہور ہی سے سید امتیاز علی تاج کے والد شمس العلماء سید ممتاز علی نے ''پھول'' کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ والد کے انتقال کے بعد امتیاز علی تاج نے اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''پھول'' بچوں کے لیے معیاری اور دلچسپ رسالہ تھا۔ اس کی زبان بہت آسان اور سلیس تھی۔ ''پھول'' کے مستقل لکھنے والوں میں اس دور کی معروف علمی و ادبی شخصیات مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخآری، اسماعیل پانی پتی، غلام بیگ چغتائی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی اور حجاب امتیاز علی شامل تھیں۔ بجنور سے مجید حسن کی زیرادارت بچوں کے لیے ہفت روزہ ''غنچہ'' شروع ہوا۔ یہ چھوٹی عمر کے بچوں میں بہت مقبول تھا مگر محدود حلقۂ اثر ہونے کی وجہ سے زیادہ معروف نہ ہو سکا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے بھی بچوں کے لیے ''پریم'' کے نام سے ہفت روزہ پرچہ شروع کیا۔ یہ بچوں کا اخلاقی اور اصلاحی رسالہ تھا۔

۱۹۲۳ء میں دیال سنگھ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر راگو ناتھ سہانے نے ''گلدستہ'' کے نام سے ہفت روزہ رسالہ شروع کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ''پیامِ تعلیم'' کے نام سے پندرہ روزہ رسالہ شروع کیا۔ اس میں تاریخ ، آزادی کے حوالے سے مضامین بکثرت شائع ہوتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں ''بچوں کی دنیا'' پہلا رسالہ تھا، جو کہ فرسودہ طرزِ طباعت کے مقابلے میں جدید طرزِ طباعت پر الہ آباد سے شروع ہوا۔ قومی کتب خانہ لاہور کے زیراہتمام ۱۹۳۷ء میں پندرہ روزہ رسالہ ''ہدایت'' شروع ہوا۔ اس رسالہ کی مجلس ادارت میں نمایاں ادبی شخصیات شامل رہی ہیں۔ جن میں شیدا کاشمیری، الطاف پرواز، عنایت اللہ (بانی روزنامہ 'مشرق' لاہور) اورسید نظر زیدی شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد کئی رسائل تقسیم ہند کی نظر ہوگئے۔ کچھ نے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے دم توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی کئی نئے رسالوں نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں مولوی فیروز الدین نے لاہور سے ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' کا آغاز کیا تھا۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک یہ رسالہ تیسری نسل کو منتقل ہو چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری و معنوی حسن میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔۱۹۵۲ء میں کراچی سے ماہنامہ ''کھلونا'' شروع ہوا۔ کئی سال تک کامیابی سے چلنے کے بعد بوجوہ بند ہوگیا۔

ماہنامہ ''ہمدرد نونہال'' نے ۱۹۵۵ء میں کراچی سے حکیم محمد سعید کی زیرادارت اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ گزشتہ ۶۰ سال سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے۔ اس رسالے میں بچوں کے لیے علمی ، سائنسی، معلوماتی، اخلاقی اور تفریحی تحریریں ہوتی ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کی تقریباً تمام چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور سے بچوں کے جس رسالے نے سب سے پہلے اپنی اشاعت کا آغاز کیا وہ ماہنامہ ''بچوں کی دنیا'' ہے۔ اس رسالے کا آغاز مولوی محمد امین شرقپوری نے ۱۹۴۸ء میں کیا۔ ''تعلیم و تربیت'' کی طرح یہ رسالہ بھی تیسری نسل کو منتقل ہو چکا ہے۔ اس رسالے کا آغاز سے لے کر آج تک ایک مخصوص مزاج ہے۔ اس میں زیادہ تر جنوں اور پریوں کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ گزشتہ ۶۷ سال سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے اور بھی بے شمار نئے رسائل کا آغاز ہوا۔ ان رسائل میں ماہنامہ 'چائلڈ سٹار'، 'نوعمر'، 'خزانہ'، 'انکل سرگم'، 'بچوں کا گلشن'، 'بچپن'، 'فاختہ'، 'بھائی جان'، 'مجاہد'، 'بچوں کا دوست'، 'تاروں کی دنیا' اور اسی طرح کئی اور رسائل ، اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے کے مصداق شائع اور بند ہو رہے ہیں۔

نئی نسل کی تربیت کی ذمہ داری جہاں والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ وہیں بچوں کے رسائل کو بھی اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بچوں کے رسائل نئی نسل کے اخلاق و کردار کو سنوارنے یا بگاڑنے

میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے مدیران رسائل سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں نئی نسل کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تربیت کا اہتمام کرکے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں گے۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے وقت اگر یہ احساس دل میں موجود رہے کہ ہمیں اپنے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ اور اپنی زیرادارت مرتب ہونے والے رسالے کے ایک ایک صفحے کے لیے اللہ کے حضور جوابدہ ہونا ہے تو یقیناً رسائل نئی نسل کی تربیت و رہنمائی کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ہمدرد:

شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کی سرپرستی میں یکم جنوری ۱۹۶۴ء کو ہمدرد فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کو ہمدرد (وقف) پاکستان کی علمی، ادبی، رفاہی اور فلاحی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لیے قائم کیا گیا۔ ۲۳-اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

ہمدرد فاؤنڈیشن نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اہلِ علم وفضل کے تجربات سے عوام الناس کو مستفید کرنے کے لیے ''شامِ ہمدرد'' آغاز کیا۔

> ''شامِ ہمدرد ایک ایسا ادارہ ہے جو پاکستان میں پورے تسلسل کے ساتھ تعمیر اذہان میں مصروف ہے۔ شاید پاکستان میں یہ واحد ادارہ ہے جسے چالیس سال سے دوام حاصل ہے۔ اس ادارۂ فکر و ذہن پاکستان کی عظیم المرتبت شخصیات نے حصہ لیا ہے اور محبت وخلوص کا مظاہرہ مسلسل کیا ہے۔ اب یہی صاحبانِ فہم و دانش ''شوریٰ ہمدرد'' کے رکن ہیں۔'' (۲۶)

شوریٰ ہمدرد بلاشبہ ایک نہایت پاکیزہ تحریک کا نام ہے۔ اوّلین مقصد اس کا یہ ہے کہ پاکستان کی عظمت و رفعت کا سامان کیا جائے۔ شامِ ہمدرد اور شوریٰ ہمدرد تفکر و تدبیر کا عنوان روشن ہیں۔ تعمیر اذہان ان کا مقصد ہے اور اہلِ وطن کی رہنمائی اولین مقصد ہے۔ شوریٰ ہمدرد پوری ہمدردی اور پورے خلوص کے ساتھ صراطِ مستقیم دینے کی کوشش کرتی ہے۔ چالیس سال سے خدمتِ ملک وملت کا یہ سلسلہ جاری رہے۔'' شوریٰ ہمدرد'' ہر ماہ باقاعدگی سے کراچی، لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور میں منعقد ہوتی ہے۔ جس میں اہم قومی و ملی مسائل پر مختلف شعبہ ہائے زندگی کی ممتاز علمی و ادبی شخصیات خطاب کرتی ہیں اور عوام الناس کی رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ہمدرد فاؤنڈیشن نے غالباً بڑوں کے لیے اتنا کام نہیں کیا جس قدر نئی نسل کے لیے اس کی ہمہ جہت سرگرمیاں کئی عشروں سے جاری و ساری ہیں۔ حکیم محمد سعید نے نونہالانِ وطن کے لیے ۱۹۵۳ء میں ''ہمدرد نونہال'' کا آغاز کیا جو گزشتہ ساٹھ سال سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت پاکستان کی چوتھی نسل اس سے استفادہ کر رہی ہے۔ مسعود احمد برکاتی اس کے آغاز سے ہی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔

ہمدرد نونہال کے بعد اگست ۱۹۸۵ء کو ہمدرد نونہال پڑھنے والے بچوں کے لیے ''بزم ہمدرد نونہال'' کے نام سے سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا۔ کراچی میں قیام کے ایک سال بعد راولپنڈی/ اسلام آباد، لاہور اور پشاور میں ہمدرد نونہال کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ بزم ہمدرد نونہال کے تحت تقریبات کا سلسلہ ۱۹۹۴ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں اس کا نام ''ہمدرد نونہال اسمبلی'' کر دیا گیا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک کراچی، لاہور، راولپنڈی/اسلام آباد اور پشاور میں ہر ماہ باقاعدگی سے سکولوں کے بچوں کے لیے رنگارنگ تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''نونہال اخبار'' کا اجراء کیا گیا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہے۔ جبکہ ماہ نامہ 'ہمدرد نونہال' کی اشاعت جاری و ساری ہے۔

> ''بچوں کی تربیت رہنمائی اور علم کا فروغ شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کا مشن رہا ہے۔ اسی مشن کے تحت حکیم محمد سعید نے ''ہمدرد پبلک سکول'' کا آغاز کیا۔ جس میں صبح کے وقت کراچی شہر کے پانچ ہزار سے زیادہ بچے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ جبکہ بعد دوپہر قریبی گوٹھوں کے غریب و نادار بچے علم کی دولت سے اپنے دامن بھرتے ہیں۔''(۲۷)

ہمدرد نونہال رسالہ، ہمدرد نونہال اسمبلی، نونہال اخبار اور ہمدرد پبلک سکول کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے ''نونہال ادب'' کے نام سے دلچسپ اور بامقصد ادب کی ترویج و اشاعت، حکیم محمد سعید کے بچوں کے لیے لاتعداد سفرنامے اور دیگر اصناف پر بہت بڑی تعداد میں کتب شائع ہو چکی ہیں۔

حکیم محمد سعید کو مظاہرِ قدرت، نظامِ فطرت اور بچوں سے بہت زیادہ پیار تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے وہ بچوں کو ایک اچھا اور کارآمد شہری بنا سکتے ہیں۔ اسی بنا پر آپ نونہالوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دیتے رہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے بہت زیادہ لٹریچر چھوڑا ہے جو سب کا سب اپنے اندر اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان رکھتا ہے۔ حکیم محمد سعید کو اس بات پر فخر تھا کہ انھوں نے نونہالوں کی ایسی تعلیم و

تربیت کی ہے کہ وہ انقلاب لانے کے قابل ہو چکے ہیں۔

''ہمدرد مطبوعات'' میں بچوں کے ادب کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے۔ اس میں حکیم محمد سعید کی کئی کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) نقوشِ سیرت (حصہ اوّل تا پنجم)

(۲) نور کے پھول

(۳) اقوالِ زریں

(۴) کہکشاں

(۵) سچ بولو

(۶) قرینہ حیات

(۷) نماز پڑھیے

(۸) نونہال دینیات (حصہ اوّل تا ہشتم)

(۹) عروس القرآن --- سورۃ رحمٰن

(۱۰) صراطِ مستقیم

(۱۱) جاگو جگاؤ

(۱۲) چند مشہور طبیب اور سائنسدان

(۱۳) کتابِ دوستان

(۱۴) ایک واقعہ جو مجھے پسند ہے

(۱۵) آپا صحت کی فکر کریں

(۱۶) بچوں کے حکیم محمد سعید

یہ اور بہت سی دیگر کتب ہیں۔ یہ سب بڑی پیاری باتصویر اور پُر تاثیر ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ''ہمدرد نونہال'' ایک ماہنامہ ہے جو بے حد پیارا اور دلچسپ ہے۔ اس میں بچوں کی ہر طرح سے تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ اس کو حکیم صاحب نے بچوں کے لیے ایک معیاری، حیات آموز اور دلچسپ جریدہ

بنانے کے لیے شب و روز محنت کی ہے۔

اکادمی ادبیات:

وفاقی وزارتِ تعلیم ، حکومتِ پاکستان کے تحت پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج اور ادیبوں اور شاعروں کی فلاح و بہبود کے لیے ۷۔ جولائی ۱۹۷۶ء کو اکادمی ادبیات قائم کی گئی۔ صدر دفتر اسلام آباد میں جبکہ صوبائی شاخیں کراچی، لاہور، کوئٹہ اور پشاور میں کام کر رہی ہیں۔

اکادمی ادبیات کا پہلا پروجیکٹ ڈائریکٹر احمد فراز کو مقرر کیا گیا۔ پھر یہ عہدہ چیئرمین کہلانے لگا۔ اس عہدے پر فائز ہونے والی پہلی شخصیت مشہور ادیب شفیق الرحمٰن تھے۔ اُردو میں ''سہ ماہی ادبیات'' جبکہ انگریزی میں 'پاکستانی لٹریچر' کے نام سے پرچہ شائع ہوتا ہے۔

۱۹۷۹ء سے کل پاکستان اہلِ قلم کانفرنسوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں اُردو اور دیگر زبانوں میں شائع شدہ کتابوں پر ایوارڈز کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکادمی ادبیات کے تحت ادبی اداروں کی اعانت، مستحق ادیبوں اور شاعروں کی مالی مدد کی جاتی ہے۔ ملک بھر کے ایک ہزار سے زیادہ ادیبوں کا بیمہ بھی کروایا گیا ہے۔ ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے علاوہ بھی بے شمار کتب شائع کی گئی ہیں۔

اکادمی ادبیات کے ہر دور کے چیئرمین صاحبان کی یقین دہانیوں کے باوجود بچوں کے ادب اور اس کے ادیبوں کو نظرانداز کر دیا جاتا رہا۔ حالانکہ ۲۱۔فروری ۱۹۸۴ء کو اکادمی ادبیات کے تحت وفاقی وزیرِتعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی زیرِصدارت اسلام آباد میں منعقد ہونے والے بچوں کے ادیبوں کے کل پاکستان سیمینار میں اس فیصلے کا اعلان کیا گیا تھا کہ بچوں کی کتب پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس حوالے سے بچوں کے ادب کی پانچ اصناف پر ایک لاکھ روپے دیے جائیں گے جبکہ پاکستانی زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی میں شائع شدہ بچوں کی کتابوں پر بھی اسی طرح کے انعامات دیے جائیں گے۔

اکادمی ادبیات نے کئی سال پہلے شیما مجید کی جانب سے بچوں کے ماضی کے ادیبوں کی نظم و نثر میں موجود تحریروں کا انتخاب شائع کیا تھا۔ اب اکادمی ادبیات کے تحت بچوں کے ادب کا غیرملکی تراجم نمبر اور بچوں کے ادب کا منظوم نمبر شائع کیے گئے ہیں اور ان دوضخیم نمبروں کے بعد تیسرا ضخیم نمبر پاکستانی ادیبوں کی نثری

نگارشات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ تینوں نمبر اپنے آپ میں آکادمی ادبیات کی طرف سے ایک بہت بڑا کام اور بچوں کے ادب میں ایک بہت بڑا اور قیمتی اضافہ ہیں۔

بچوں کا ادب (جلد اوّل)

اس جلد میں عالمی ادب سے منتخب کہانیوں کا اُردو میں ترجمہ کر کے اس میں پیش کیا گیا ہے۔

''بچوں کے ادب کے حوالے سے پاکستانی اور بین الاقوامی زبانوں میں بلاشبہ گراں قدر اثاثہ موجود ہے لیکن اُردو میں اس کے انتخاب کو یکجا صورت میں پیش کرنے کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ سہ ماہی ادبیات کا بچوں کا ادب نمبر اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ نہ صرف اس میں بین الاقوامی ادب سے محتاط انتخاب کو اُردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے بلکہ اُردو سمیت سبھی پاکستانی زبانوں میں بچوں کے لیے لکھے گئے ادب کا انتخاب بھی کیا گیا ہے۔''(۲۸)

ان ممالک میں آذربائیجان، آسٹریلیا، آئرلینڈ، استونیا، اٹلی، افریقہ، افغانستان، البانیہ، الجیریا، امریکہ، انڈونیشیا، انگولا، ایران، برازیل، برطانیہ، برما، بلغاریہ، بنگلہ دیش ، بھارت، پولینڈ، پیرو، تبت، ترکی، تھائی لینڈ، جاپان، جرمنی، چاڈ، چیکوسلواکیہ، چین، ڈنمارک ، روس، رومانیہ، سری لنکا، سعودی عرب، سکاٹ لینڈ، سوڈان، سویڈن، فرانس، فلپائن، فن لینڈ، کانگو، کینیا، گرین لینڈ، گمبیا، گھانا، لتھوینیا، متحدہ عرب امارات، مراکش، مصر، منگولیا، موریطانیہ، میکسیکو، ناروے، نائیجیریا، نیپال، ہالینڈ، ویت نام، ہنگری، یونان اور یمن شامل ہیں۔

بچوں کا ادب (جلد دوم: قومی ادب، حصہ نظم)

اس جلد میں پاکستانی زبانوں میں موجود بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔

''اس خصوصی شمارے میں پاکستانی زبانوں میں بچوں کے بارے میں لکھے گئے۔ ادب سے محتاط انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ اُردو میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی تمام منظوم تحریریں طبع زاد ہیں جبکہ بلوچی، پشتو، سندھی، براہوی، ہندکو، پنجابی، سرائیکی اور پوٹھوہاری زبانوں میں بچوں کے لیے لکھی گئی منظومات کے اُردو تراجم شامل کیے گئے

ہیں۔ ماضی میں جو لکھا گیا اس میں سے انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے
ممتاز اہلِ قلم سے بھی خصوصی طور پر بچوں کے لیے نگارشات حاصل کی گئی ہیں۔'' (۲۹)

اس جلد میں حمد، نعت، سوہنی دھرتی، ملت کا پاسبان، کلاسیکی شاعری سے انتخاب، نظم کہانی، تمثیل، اثاثہ (۱)، اثاثہ (۲) کے نام سے موضوعات بنائے گئے ہیں جن میں ایک ہی موضوع سے متعلق مختلف شاعروں کی نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی پاکستانی زبانوں کے ادب کے نام سے موجود موضوع میں بلوچی، براہوی، پشتو، ہندکو، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور پوٹھوہاری زبانوں میں موجود بچوں کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں شامل کی گئی ہیں۔

بچوں کا ادب (جلد سوم: قومی ادب، حصہ نثر)

اس جلد میں پاکستانی زبانوں میں موجود بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔

''موجودہ خصوصی شمارے میں پاکستانی زبانوں میں بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین سے انتخاب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مختلف علاقوں کی لوک کہانیاں بھی شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں حسبِ سابق براہوی، بلوچی، پشتو، سندھی، ہندکو، پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری، پہاڑی، شنا اور کشمیری زبانوں میں بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے اُردو تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ماضی میں بچوں کے لیے لکھے گئے ادب سے انتخاب کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے ممتاز اہلِ قلم سے بھی خصوصی طور پر بچوں کے لیے نگارشات حاصل کی گئی ہیں۔'' (۳۰)

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تین جلدوں پر مشتمل یہ خصوصی نمبر اس موضوع پر اُردو میں شائع ہونے والی پہلی سب سے ضخیم کاوش ہے اور بہت بڑا کام ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کیونکہ بچوں کے ادب پر یوں ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے مواد حاصل کرنا اور پھر اُن کے اُردو میں تراجم کرنا اور یوں ایک جگہ سب کو اکٹھا کرنا۔ یہ سب بہت محنت اور جانفشانی کا کام ہے اور بچوں کے ادب کے حوالے سے ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

شعبہ بچوں کا ادب، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

وفاقی دارالحکومت میں دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد میں شعبہ بچوں کا ادب ۲۵۔

مئی ۱۹۸۷ء کو قائم ہوا۔ محمد افتخار کھوکھر کو شعبہ بچوں کا ادب کا انچارج مقرر کیا گیا۔ جبکہ محمد شاہد رفیع اور عبدالعزیز خالد کو معاونین شعبہ بنایا گیا۔

''شعبہ بچوں کا ادب کے تحت گزشتہ پچیس برسوں سے تسلسل کے ساتھ بچوں کے لیے لکھنے والے نوجوان اہلِ قلم کے لیے سالانہ قومی وصوبائی تربیتی کیموں کا انعقاد۔ سکول کالج کے ذہین طلبہ کے لیے لیڈر شپ کیمپوں کا انعقاد، کالج سطح کے سکاؤٹ لیڈرز کے لیے تربیتی کیمپوں کا سلسلہ ملک بھر سے شائع ہونے والے بچوں کے رسائل کی ہر سال کسی خاص موضوع پر اشاعت، بچوں کے لیے میگزین کی صورت میں گلدستہ خط وکتابت کورس کا اجراء، بچوں کے لیے اُردو، انگریزی، سندھی اور پشتو زبانوں میں انعامی تحریری مقابلوں کا سلسلہ، بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کے مسودات پر انعامات کے لیے دعوۃ ادبی ایوارڈ کا اجراء اور اس کے تحت قابل اشاعت مسودات کی دعوۃ اکیڈمی سے اشاعت کا اہتمام، پاکستان کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی اورینٹ ایڈورٹائزنگ لمیٹڈ پاکستان کے مالی تعاون سے اورینٹ دعوۃ ایوارڈ برائے بچوں کا ادب کا ہر سال باقاعدگی سے انعقاد، اورینٹ دعوۃ ایوارڈ کے تحت بچوں کے ادب کی پانچ اصناف نظم، کہانی، ڈراما، مزاح اور ناول پر دس دس ہزار مالیت کے اسماعیل میرٹھی ایوارڈ، سید نظر زیدی ایوارڈ، میرزا ادیب ایوارڈ، سید امتیاز علی تاج ایوارڈ، عزیز اثری ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ دیے جاتے ہیں۔''(۳۳)

بچوں کے لیے لکھنے والے نوجوان اہلِ قلم الیکٹرانک میڈیا کیمپوں کا انعقاد جس کے ذریعے اب تک دو ڈرامے، تین ڈاکومینٹری (دستاویزی) اور دو ٹاک شوز تیار کیے جا چکے ہیں۔ بچوں کے ادب پر بیس سے زیادہ علمی، ادبی وتحقیقی منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ بچوں کے معروف ادیبوں کے لیے تسلسل کے ساتھ سیمینار اور ورکشاپس کا انعقاد، گلدستہ سیریز کے تحت بچوں کے رسائل کی بہترین تحریروں کا سالانہ انتخاب ''گلدستہ'' بچوں کے رسائل کے خاص نمبروں کی بہترین تحریروں کا انتخاب ''پھول اور تتلیاں'' کی اشاعت بچوں کے لیے پرائمری، مڈل اور میٹرک، تین مدارج کے لیے اُردو، انگریزی، سندھی اور پشتو زبانوں میں لٹریچر کی تیاری واشاعت، سکول کے

بچوں اور بچیوں کے لیے اسلامی تعلیمات پر مبنی بارہ یونٹس پر مشتمل میگزین کی شکل میں گلدستہ خط کتابت کورس کا اجراء، بچوں کے ادب پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی کام کرنے والے طلبہ و طالبات کی رہنمائی کا سلسلہ، بچوں کے والدین کی رہنمائی کے لیے کتب کی اشاعت، بچوں کے رسائل، بچوں کے اخباری صفحات، بچوں کے ٹی وی پروگراموں اور بچوں کی کتب کے حوالے سے ناقدانہ جائزوں کی اشاعت، بچوں کے ادیبوں، بچوں کے رسائل اور بچوں کی کتب کے ناشرین کے باہمی رابطے کے لیے ڈائریکٹریوں کی اشاعت، بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والے سرکاری و پرائیویٹ اداروں اور تنظیموں سے رابطہ۔

یہ وہ کام ہیں جو شعبہ بچوں کا ادب تین افراد پر مشتمل مختصر ٹیم کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ بچوں کے ادب پر اتنی جہتوں میں سرگرمیوں کے مسلسل انعقاد کی مثال دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک بھی پیش نہیں کر سکتے۔ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل و کرم ہے کہ اُس نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ بچوں کا ادب کو اس اعزاز سے نوازا۔

شعبہ بچوں کا ادب کے تحت ۱۹۸۷ء میں بچوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کے لیے بچوں کے ممتاز ادیبوں کی لکھی ہوئی جیبی سائز کی دس کتابیں شائع کی گئیں۔ کتب اور مصنفین کے نام یہ ہیں:

ج: بچوں کے رسائل و جرائد 'پھول'، 'تعلیم و تربیت'، 'ہمدرد و نونہال' میں بچوں کے لیے پیش کی جانے والی نظموں کا محاکمہ

ماہنامہ ''ہمدرد نونہال''

ماہنامہ ''ہمدرد نونہال'' نے ۱۹۵۵ء میں کراچی سے حکیم محمد سعید کی زیرادارت اپنی اشاعت کا آغاز کیا تھا اور گزشتہ ۶۰ سال سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں بچوں کے لیے علمی، سائنسی، معلوماتی، اخلاقی اور تفریحی تحریریں ہوتی ہیں یعنی بچوں کی دلچسپی کی تمام چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں۔ اب یہاں اس میں شامل نظموں کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ نظمیں بچوں کے حوالے سے کس طرح کی ہیں یعنی بچوں کے اخلاق و کردار کی نشوونما میں یہ نظمیں کس حد تک اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں اور کر رہی ہیں۔

''نونہال'' میں شائع ہونے والی نظموں کا زیادہ تر تعلق اُس مہینے سے ہوتا ہے جس میں وہ شائع ہو رہی ہوں

یعنی اُس مہینے کی خصوصیت کے حوالے سے زیادہ تر نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ یعنی اگر اگست کا مہینہ ہے تو آزادی کے حوالے سے نظمیں ہوں گی۔ اگر رمضان کا مہینہ چل رہا ہے تو ماہ رمضان اُن نظموں کا موضوع ہوگا۔ اس کے علاوہ بچوں کی اخلاقی نشوونما کے حوالے سے ہر شمارے میں ایک نہ ایک نظم ضرور ہوگی۔

''اے خدائے مہرباں، ربِ کریم
کیجیے مجھ کو عطا ، قلبِ سلیم

جس میں عشقِ مصطفیٰ ؐ آباد ہو
رنج و غم سے جو سدا آزاد ہو
نور ایمان سے بھی یہ پُرنور ہو — رغبتِ عصیاں سے کوسوں دور ہو
ہو میسر صحبتِ دل اہلِ صفا — زمزمِ مہر و محبت بھی پلا
خدمتِ انسانیت کا ذوق دے — رہبری حاصل کرے قرآن سے(۳۱)

☆☆

''یارب! میری دعا ہے تجھ سے — کام آؤں میں اپنے وطن کے
ملت کا میں بنوں سہارا — مجھ کو ہے ہر فرد ہی پیارا
پاک زمین کا روپ نکھاروں — محنت سے میں اسے سنواروں
لاچاروں کو گلے لگاؤں — عصا ضعیفوں کا بن جاؤں(۳۲)

ایسی مغنی حیدر اور ضیاء الحسن ضیاء دونوں اپنی نظموں دعا کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔اوپر دی گئی دونوں نظموں کا موضوع ''دُعا'' ہے۔ ایک میں دین کی بھلائی اور ہدایت کی دُعا ہے تو دوسری میں دنیا کی بھلائی اور انسانوں کے کام آنے کی دُعا ہے۔ پہلی نظم میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے ایسا دل مانگنے کی دُعا ہے جس میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہو اور ایسا دل ہو جو ایمان سے پُرنور ہو اور گناہوں سے دور رہے۔ جسے گناہ اور ثواب، حق اور باطل کی پہچان ہو جو صرف اللہ کی عبادت کرے اور اُسی کے احکام کے مطابق زندگی گزارے۔ اس نظم میں بہت سے ایسے الفاظ کا استعمال ہے جو بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں، جیسے قلبِ سلیم، رغبتِ عصیاں، مہر ومحبت، پاک باز، بے ریا، لذتِ توحید، دلداری، غم خواری، ملتِ بیضا، خوگر وغیرہ۔ یہ نظم بچوں کے اخلاق کو مذہبی نقطۂ نظر سے سنوارنے میں بے حد اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ نیز بچوں کو زندگی کا اصل مقصد سمجھا دیتی ہے۔

اسی طرح دوسری نظم میں دنیا میں ایک اچھا انسان بننے کی دُعا کی ہے کہ جو اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے کام آ سکے جو کمزوروں کو سہارا دینے والے بن سکے اور ہر طرف پیار او رمحبت پھیلا دے یعنی دونوں نظموں کا مقصد ایک ہی ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی جائے۔ بچے اس سے دنیا میں رہنے کا سلیقہ اور دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سیکھ سکیں گے۔

''پڑھائی سے نہیں رغبت، کسی کو کیا معلوم
ہمارے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم
ہر ایک ویسے تو معصوم ہم کو کہتا ہے
چھپی ہماری شرارت کسی کو کیا معلوم
پہن کے سوٹ نیا، شادی ہال میں جا کر
مزے سے کھاتے ہیں دعوت کسی کو کیا معلوم(۳۳)

ضیاء الحسن ضیاء اپنی اس نظم میں بچوں کے دل کی خواہشات بڑے خوبصورت انداز میں بیان کر رہے ہیں۔اکثر بچوں کو پڑھائی سے اتنی رغبت یا لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دوسرے ہر کام میں بہت دل لگاتے ہیں۔ شرارتیں کرنے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ گھر سے باہر جانے میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ شادیوں میں جانا، طرح طرح کے کھانے کھانا، اُن کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ چاہے وہ کھانے پینے میں طبیعت خراب ہوجائے۔کیونکہ بچوں کی طبیعت نازک ہوتی ہے۔لیکن نظم کے آخر میں بچوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ پڑھائی سے ان کا دل بھا گتا ہے۔ لیکن محنت کرنے میں ہی عظمت اور کامیابی ہے۔ آج کی محنت اور تھکن آنے والے وقت میں کامیابی کی علامت ہے۔لہٰذا بچوں کو ایسی محنت سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

''ملت کا غم کھانے والا ۔۔۔ پاکستان بنانے والا
حرص و ہوس سے دور بہت تھا ۔۔۔ دل میں اس کے نور بہت تھا
مل کر اپنا ہم کو بنایا ۔۔۔ محنت کرنا سب کو سکھایا
درس دیا ہے آزادی کا ۔۔۔ ہر دل کو وہ یاد رہے گا
عزم و عمل کا راگ سنایا ۔۔۔ سوئی ہوئی ملت کو جگایا
لے کر ہاتھ میں حق کا پرچم ۔۔۔ قوم کی خدمت کرنا ہر دم''(۳۴)

تنویر پھول اس نظم میں بانی پاکستان کی اس وطن کے لیے کاوشوں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی میں زندگی گزار رہے تھے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اُنھیں پاکستان کا ایک الگ ملک جواب دکھایا اور اس کو تعبیر بھی دی۔ قائداعظم نے محنت کا درس دیا۔ وہ خود بھی بہت محنتی تھے۔ کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ایمان، اتحاد، تنظیم کا درس دیا اور قوم کو مل کر رہنے کا درس دیا۔ لہٰذا ہمیں اپنے بانی پاکستان اور ان کے اقوال کو نہ صرف یاد رکھنا چاہیے بلکہ ان پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ بچوں کو اس سے نہ صرف پاکستان بننے کے عمل کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں گی بلکہ وہ اپنے بانی کی محنت سے بھی بہت کچھ سیکھ سکیں گے۔

”تو کہ ایک سمندر تھا	حکمت اور دانائی کا
بچوں کا ہمدرد تھا تو	حاصل تھا سچائی کا
تو ہے شہیدِ پاکستان	ملک و ملت کی پہچان
پاک وطن کی دھرتی پر	تنہا ایک ادارہ تھا
جہل خرد کی دنیا میں	علم کا تو گہوارہ تھا
تو ہے شہیدِ پاکستان	ملک و ملت کی پہچان“(۳۵)

اعجاز رحمانی حکیم سعید کی وطن کے لیے کاوشوں اور کوششوں کو اس نظم میں موضوع بناتے ہیں۔ ہمدرد ادارے کو بنانے والی شخصیت حکیم محمد سعید تھے۔ جن کی شب و روز محنت سے آج یہ ادارہ اس مقام پر ہے۔ آپ علم و حکمت کا سمندر تھے۔ آپ نے بچوں کے بہت کام کیا۔ خصوصاً بچوں کے لیے بے شمار کتب تصنیف کیں۔ ایسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جانے کے بعد ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ بچوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ اپنے اس پسندیدہ ادارے کے بانی کے متعلق معلومات رکھیں اور اُن ہی کی طرح محنت کو اپنا شعار بنائیں اور اُن کے دیے ہوئے اسباق کو یاد رکھیں اور اپنے ملک و قوم کا نام روشن کریں۔ جس طرح حکیم محمد سعید نے کیا ہے اور اس وطن کو سنوارنے میں اپنے خون پسینے کو بہایا ہے۔

”ہم بزرگوں کا احترام کریں	صبح اُٹھ کر اُنھیں سلام کریں
صبح ممکن نہیں تو شام کریں	روز ہم کوئی نیک کام کریں
جب ملاقات ہو کسی سے بھی	پہلے آداب، پھر کلام کریں“(۳۶)

اسی سلسلے کی ایک اور نظم بھی ملاحظہ ہو:

”ذکر پروردگار کرتے چلو اپنے دل کو بہار کرتے چلو
دل کی تسکین بس اسی میں ہے یہ عمل بار بار کرتے چلو
رب کا محبوب تم کو بننا ہے؟ اس کے بندوں سے پیار کرتے چلو“(۳۷)

کرشن پرویز اور شمس القمر دونوں ہی اپنی نظموں میں بچوں کے اخلاق کو سنوارنے کی بات کر رہے ہیں۔ اوپر دی گئی دونوں نظموں کا موضوع یا مقصد ایک ہی ہے کہ بچوں کے اخلاق و کردار کی نشوونما اور تشکیل کی جا سکے۔ اسی لیے اُنھیں زندگی گزارنے اور ایک اچھا انسان اور مسلمان بننے کے طور طریقے سکھائے جا رہے ہیں کہ بڑوں کا احترام کریں، اُن کو عزت دیں۔ جب بھی کہیں بڑوں یا بزرگوں سے ملیں تو پہلے سلام کریں۔ اُن سے محبت کریں۔ اُن کی باتوں پر عمل کریں اور اپنے کردار کو اتنا اچھا بنائیں۔ اتنے خوش اخلاق بن جائیں کہ ہر کوئی ہم سے پیار کرے۔

اسی طرح دوسری نظم میں ہر وقت اللہ کا ذکر اور شکر کی تلقین کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اللہ پاک کی خوشنودی اور محبت حاصل کرنے کا کلیہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس کے بندوں سے محبت کر کے اللہ پاک کی قربت حاصل کی جا سکتی ہے اور جو اللہ پاک نے نعمتیں ہمیں دی ہیں اُسے دوسروں کو بھی پہنچائیں۔ اگر کئی دُکھ بھی دے تو اُس پر صبر کریں اور اُس کے ساتھ بُرا نہ کریں۔ بلکہ دشمن کے ساتھ بھی محبت اور اپنائیت سے پیش آئیں۔ یوں ان نظموں کے ذریعے سے بچوں کو ایک اچھا انسان اور مسلمان بنانے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے۔ کیونکہ بچوں کے سیکھنے کی یہی عمر ہوتی ہے۔

”آیا ہے چھے ستمبر پیغام پھر یہ لے کر
چاہت وطن کی رکھنا جانوں سے اپنی بڑھ کر
ہمت کے آسمانو! اے فوج کے جوانو!
اپنے چمن کے یارو تم شیر دل ہو پیارو!
اس پاک سرزمین کے جاں باز جاں نثارو!
فولاد کی چٹانو اے فوج کے جوانو“(۳۸)

آفاق صدیقی بچوں کے حوالے سے اپنی اس نظم میں پاک فوج کے جوانوں کو عقیدت کے پھول پیش کر رہے ہیں۔ ٦-ستمبر کے حوالے سے یہ خصوصی نظم فوج کو خراجِ تحسین اور اُن کی قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش

کرنے کا طریقہ ہے۔ ہماری فوج کا شمار دنیا کی بہادر ترین افواج میں ہوتا ہے۔ ۶-ستمبر کو جب دشمن نے راتوں رات حملہ کر دیا تو یہ فوج ہی تھی جو سیسہ پلائی دیوار کی طرح اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ڈٹ گئی تھی اور دشمن کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔ ہماری فوج ہمارا فخر ہے اور جب تک پاک فوج ہے۔ پاکستان کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ بچوں کو افواج پاکستان کی بہادری، اہمیت اور قربانیوں کا علم ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے دل میں افواج پاکستان کے لیے عزت و احترام بڑھے گا بلکہ کل کو بڑے ہو کر وہ بھی ملک کی خدمت کرنے کے لیے افواج پاکستان کا حصہ بننا پسند کریں گے۔

"یہ دیس نظاروں کا　　پھولوں کا ستاروں کا
پھولوں سے سجے رہتے　　گویا کریں گل دستے
ہر سمت اُجالے ہیں　　ہم روشنی والے ہیں
یہ دیس مثالی ہے　　کیا شان نرالی ہے"(۳۹)

عباس المعزم کی یہ نظم وطن سے محبت اور وطن کی اہمیت پر مبنی ہے۔ اپنا وطن ہر کسی کو خوبصورت لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بہت سے معدنی وسائل اور خوبصورت نظاروں سے نوازا ہے۔ اس ملک میں اللہ نے چار خوبصورت موسم دیے ہیں اور ہر موسم اپنے آپ میں بے پناہ خوبصورتی اور فائدے لیے ہوئے ہے۔ یہ ملک بذاتِ خود اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت اور کرم ہے۔ اس لیے اپنے ملک سے محبت کرنی چاہیے اور اس کی ترقی میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

"پھر وہی ۱۴اگست آیا ہے، آزادی کا دن　　اپنے پاکستان میں خوشیوں کی آبادی کا دن
ہند میں جتنے مسلمان تھے بڑے رنجور تھے　　آج سے ۶۴ برس پہلے وہ سب مجبور تھے
اک صدی سے تھے وہ سب غلام ابنِ غلام　　راج گورے حاکموں کا تھا جوان پر بے لگام
رو نمائی پھر ملی قائد کی اُن کو دوستو!　　جس نے اُن کو متحد کر کے کہا: "میری سنو"!(۴۰)

۱۴راگست کے دن کی اہمیت کو محمد ظریف خان اس نظم میں کچھ یوں بیان کر رہے ہیں کہ پاکستان ۱۴-اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔ مسلمان برصغیر پاک و ہند میں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ انگریز اور ہندو ان پر حاکم بنے ہوئے تھے۔ مسلمانوں پر ہر طرح کے ظلم ہو رہے تھے۔ قائداعظم نے ان حالات میں سب کو جمع کیا اور ایک الگ ریاست بنانے کا عزم کیا۔ سب نے اس پر حامی بھری اور یوں دن رات کی

انتھک محنت کے بعد آخر کار پاکستان وجود پذیر ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم سب پر بہت بڑا کرم ہے کہ اُس نے ہمیں ایک آزاد ملک سے نوازا ہے اور اُسی ربِ کائنات سے دُعا ہے کہ یہ ملک رہتی دنیا تک قائم رہے۔ بچوں کے لیے یہ سب باتیں جاننا بے حد ضروری ہے۔

''اپنا ارادہ پکا رکھا　　میں نے پہلا روزہ رکھا
رات میں اُٹھ کر سحری کھائی
کھجلا، پھینی، دودھ ملائی
کانوں میں اذان جب آئی
شکر کیا پھر اپنے رب کا　　میں نے پہلا روزہ رکھا
سارا دن پھر کچھ نہ کھایا
بھوک لگی نہ جی گھبرایا
پیاس کو میں نے دور رکھا
نہ کچھ کھایا، نہ کچھ چکھا　　یں نے پہلا روزہ رکھا''(۴۱)

رفیع یوسفی بچوں کے حوالے سے اس نظم میں روزے کی اہمیت سے آگاہ کر رہے ہیں۔ روزہ رکھنا ہر کسی کو پسند ہوتا ہے۔ خاص طور پر بچے روزہ بڑے شوق سے رکھتے ہیں۔ وہ سحری کے وقت کا بڑا انتظار کرتے ہیں۔ پھر بڑوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی خوب پیٹ بھر کر سحری کرتے ہیں۔ سارا دن بھوک اور پیاس کو برداشت کرتے ہیں اور پھر شام کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ہی روزہ افطار کرتے ہیں۔ بچوں میں اگر بچپن سے ہی مذہبی فرائض سے لگاؤ پیدا ہو جائے تو یہ بہت خوشی کی بات ہوتی ہے اور بچپن میں شوق شوق میں پڑی ہوئی عادات جوانی میں ان فرائض کو نبھانے میں آسانی پیدا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی بچے مذہب کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر پاتے ہیں۔

''ارم نے ایک دن گڑیا کے گھر کو　　سجایا اس طرح جیسے محل ہو
پلنگ پہ قیمتی بستر لگایا　　اور اس پر اپنی گڑیا کو لٹایا
گراموفون دائیں ہاتھ رکھا　　اور ٹیلی ویژن بھی ساتھ رکھا
پھر ایک قالین بھی اس نے بچھایا　　بڑے سلیقے سے کمرے کو سجایا''(۴۲)

محسن احسان بچیوں کے حوالے سے گڑیا کے گھر کی اہمیت اور محبت اس نظم کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ کیونکہ لڑکیوں کو ابتداء سے ہی گڑیا اور گڑیا کے گھر بنانے اور سنوارنے سجانے سے بے حد دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے ایسے ہی جتن کرتی ہیں جیسے کوئی اپنے گھر کے لیے کرتا ہے۔ ویسے ہی اُس گڑیا کے گھر کی آرائش و زیبائش ہوتی ہے۔ ٹیبل، گلدان، الماری، برتن غرض گھر کے سارے لوازمات پورے کیے جاتے ہیں اور یوں گڑیا کے گھر کی سجاوٹ مکمل ہوتی ہے اور بچیوں کو یہ گھر بے حد عزیز ہوتا ہے۔ بچپن کی یہ معصوم عادات بڑے ہو کر پختہ ہو جاتی ہیں اور لڑکیاں صحیح طور پر اپنے گھر سجانے سیکھ جاتی ہیں اور سلیقہ شعار بن جاتی ہیں۔

''ارم نے علی سے کہا ایک دن چلو باغ کی سیر کرنے چلیں
بہاروں کا موسم ہے پیارا بہت کہیں بیٹھ کر ہم نظارہ کریں
یہ دونوں اُٹھے باغ میں آگئے یہاں ہر طرف پھول ہی پھول تھے
چنبیلی تھی، گیندا تھا، نرگس بھی تھا رتن جوت کے بھی تھے کچھ گل کھلے''(۴۳)

محسن احسان خدا کی نعمت پھولوں کو اس نظم میں بیان کر رہے ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں اور تتلیوں سے بچوں کو خصوصی لگاؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے باغ میں جانا اُنھیں بے حد پسند ہوتا ہے۔ وہاں وہ طرح طرح کے پھول ایک ہی جگہ دیکھ لیتے ہیں۔ جیسے اس نظم میں بھی مختلف پھولوں کا ذکر آیا ہے جیسے چنبیلی، گیندا، نرگس، گلاب، سوسن، کنول، نیلوفر وغیرہ ساتھ ہی نظم کے آخر میں بتا دیا ہے کہ پھول توڑنا اچھی بات نہیں ہے۔ یوں بچوں کی اخلاقی تربیت کا کام بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھول باغوں میں پودوں پر ہی اچھے لگتے ہیں اور اپنے شوق کی خاطر پھولوں کو اُن کی شاخوں سے جدا کر کے انھیں مار نہیں ڈالنا چاہیے۔ لہٰذا بچوں کو اس نظم سے سبق سیکھنا چاہیے اور پھولوں سے محبت کرنی چاہیے۔ انھیں مارنا نہیں چاہیے۔

''ابھی ہم عقل کے تھوڑے تھے کچے دیے کمرے میں اک چڑیا نے بچے
وہ چڑیا ان کو جب دانہ کھلاتی کہیں سے چونچ میں تنکے بھی لاتی
بڑی خواہش تھی اس کو دیکھنے کی مگر تھی گھونسلے کی حد بھی اونچی
وہ بچے کرتے تھے ہر وقت چیں چیں تصویر میں نظر آتے تھے رنگیں''(۴۴)

صبا اکبری اپنی اس نظم میں بچوں کے بچگانہ پن اور شوق بڑے خوبصورت انداز میں بتا رہے ہیں۔ بچے

کبھی بھی آرام سے ایک جگہ نہیں بیٹھتے۔ اُن کی پُرتجسس طبیعت اُنھیں کہیں سکون نہیں لینے دیتی۔ بلکہ وہ ہر وقت کچھ نیا کرنا اور سیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے اس نظم میں بھی بچے کمرے میں موجود چڑیا کے گھونسلے کو دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں اور اُس اونچے گھونسلے تک پہنچنے کے لیے بے شمار جتن کرتے ہیں اور آخر کار میز پر کرسی رکھ کر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن کرسی ڈگمگا جاتی ہے اور وہ پاس بستر پر گر جاتے ہیں۔ اب اس نظم میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسے خطرناک کام نہیں کرنے چاہئیں۔ جس سے جان کو نقصان ہو۔ لیکن بچے ہمیشہ اپنی مرضی کرتے ہیں اور بغیر کسی نقصان کا سوچے وہ یہ اُلٹا سیدھا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جو کہ بہت بُری بات ہے اور اس عادت کو بدل دینے میں ہی سب کا فائدہ ہے۔

”رم جھم ، رم جھم پانی برسے — جگمگ جگمگ بجلی چمکے
چھتری لگائے نکلا کوئی — اور کیچڑ میں پھسلا کوئی
بہہ نکلے ہیں ندی نالے — ہوئے پریشان چلنے والے
بادل گرجے تو گھبرائیں — بچے کمروں میں چھپ جائیں“(۴۵)

ضیاء الحسن ضیاء اپنی اس نظم میں بارش کی اہمیت بیان کر رہے ہیں۔ بارش کا موسم کسے پسند نہیں؟ بچے، جوان، بوڑھے سب اس رحمت پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس بارش کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی اس کی وجہ سے پھسل کر گر ضرور جاتا ہے۔ یہ بارش جہاں انسانوں کو خوش کرتی ہے وہیں فصلوں کو فائدہ بھی دیتی ہے اور وہ مزید پھلتی پھولتی ہیں۔ لیکن بے وقت اور بے موسمی بارش پکی ہوئی فصلوں کو تباہ بھی کر دیتی ہے۔ اسی طرح بارش کے پانی میں بچے نہاتے ہیں لیکن جو پانی گلیوں میں کھڑا ہوتا ہے وہ یقیناً گندا ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس میں نہانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بارش کے بعد ہر گھر اپنی بساط کے مطابق پکوان اور کھانا پکا کر خوشی ظاہر کرتا ہے۔ غریبوں کے گھر کچے اور کمزور ہوتے ہیں لہٰذا اُن کے لیے یہ بارش رحمت، زحمت بن جاتی ہے۔ جبکہ پکے گھروں والے اسی بارش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بارش جیسی بھی ہو اللہ سے یہی دُعا کرنی چاہیے کہ وہ باعثِ رحمت ہو اور بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ بڑوں کا کہا مانیں اور گندے پانی میں نہانے سے اجتناب کریں۔ ساتھ ہی وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اپنے اردگرد کے سفید پوش لوگوں کا بھی خیال رکھیں۔

تعلیم و تربیت:

پچپن سال قبل مولوی فیروز دین کی زیر سر پرستی بچوں کے لیے جاری ہونے والا رسالہ ''تعلیم و تربیت'' ہے۔ فیروز سنز والوں کا ماننا ہے کہ یہ بچوں کے سلسلے میں پاکستان کا سب سے پُرانا رسالہ ہے۔ تعلیم و تربیت کے پہلے مدیر جناب مقبول انور داؤدی آج بھی نصف صدی سے تعلیم و تربیت کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔ ان کے ساتھ جن معروف ادیبوں نے کام کیا۔ ان میں صائب ہاشمی، شیدا کاشمیری، سعید لخت، خالد بزمی اور ذوالفقار تابش شامل ہیں۔

تعلیم و تربیت نے اپنے آغاز سے لے کر آج تک اس بات کی کوشش کی ہے کہ بچوں میں ادب کا شوق پیدا کیا جائے اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ نئی نسل میں غیر محسوس طور پر دینی شعور اور جذبہ حب الوطنی بھی پیدا کیا جائے۔ اس ماہنامہ رسالے کے عمومی موضوعات حمد، نعت، اسلامی تعلیمات، شاعری، کارٹون، لطائف، مصوری، اقوالِ زریں اور پاکستان کی تاریخ ہیں۔

ان دنوں ''تعلیم و تربیت'' کے چیف ایڈیٹر عبدالسلام اور ایڈیٹر ظہیر السلام ہیں۔ جبکہ مجلسِ ادارت میں سعید لخت، مقبول انور داؤدی ڈاکٹر عبدالروٗف اور محمد اقبال ثاقب ہیں۔

ذیل میں تعلیم و تربیت میں شائع ہونے والی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ بچوں کے اخلاق و کردار کی نشو ونما میں کس طرح اپنا کردارا ادا کر رہی ہیں۔

''وہ خالق وہ مالک وہ سب سے بڑا
وہ سب سے الگ ہے وہ سب سے جُدا
خُدا سے فقط لو لگائے رہو
اُسی در پہ سر کو جھکائے رہو
کرو زندگانی میں اچھے عمل
تو ہو جائیں کی مشکلیں ساری حل''(۴۶)

کرامت بخاری اس نظم میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اس دنیا کو بنانے والی، اس کائنات کوسجانے والی، اور ہم سب کو پیدا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی سب کا خالق، مالک اور رازق ہے اور

اسی ذات سے لو لگانے یعنیٰ اُسی کی عبادت کرنے اور اُسی سے مدد مانگنے میں سب کی بھلائی اور فائدہ ہے۔ کیونکہ وہی سب کی مشکلیں دور کرنے والی اور مسائل حل کرنے والی ذات ہے۔ قرآن پاک پر عمل کرتے رہو۔ اُس کے مطابق زندگی گزارتے رہو۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے اور سب سے محبت اور حسنِ سلوک رکھو۔ کبھی کسی کا بُرا نہ چاہو۔ کسی کی کامیابی پر حسد نہ کرو۔ بلکہ محنت کو اپنا شعار بناؤ۔ دوسروں کے ساتھ اچھا کریں گے تو ہمارے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا۔ یہ سب باتیں بچوں کے حوالے سے بے حد اہم ہیں اور اُنھیں یہ سب معلوم ہونی چاہئیں۔

''جو آپؐ بلا لیتے میری ذات بنی رہتی
اغیار کی محفل میں میری بات بنی رہتی
ساون میں میرے آقاؐ طیبہ نہ بلا لیتے
بن موسمی آنکھوں میں برسات بنی رہتی
سہرا جو سجا رہتا انوارِ محمدؐ کا
خوشیوں کی میرے گھر میں بارات بنی رہتی''(۴۷)

سید شبیر احمد شاہ نبی پاکؐ کی شان میں نعت پیش کر رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے کسی بھی طرح محبت کا اظہار کریں کم ہے۔ اس نعت میں بھی آپؐ نے عقیدت و محبت کا اظہار ہو رہا ہے کہ اگر آپؐ اپنے در پر بلا لیتے تو ہم گنہگاروں کی بھی بات بن جاتی۔ آپؐ کے کرم سے ہمارے گھروں اور زندگیوں پر اللہ کی رحمت بنی رہتی۔ بچوں کو حضور اکرم ﷺ کے متعلق اسی طرح معلومات دینی چاہئیں تاکہ بچپن سے ہی وہ آپؐ کی سیرت کے بارے میں جان سکیں اور خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ نعت پڑھنا ہر کسی کو پسند ہے، خصوصاً بچے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں تو اگر نعت پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں نعت کے مطلب کی بھی سمجھ آ جائے تو اُن کی زندگیاں بھی سنور جائیں گی اور آخرت بھی۔

''آؤ بچو آزادی کا مل کر جشن منائیں ہم
پاک وطن سب کچھ اپنا ہے، اس کی شان بڑھائیں ہم
آزادی سے نعمت رب کی اس کی قدر کریں گے ہم
اپنی آزادی کی خاطر جئیں گے اور لڑیں گے ہم

چاہت اور اخوت کے ہم دیے جلائیں گھر گھر میں
بغض مٹا کر پیار کی خوشبو کو پھیلائیں گھر گھر میں‘(۴۸)

ضیاء الحسن ضیاء آزادی کی اہمیت کو اس نظم میں بیان کر رہے ہیں۔ آزادی کا مطلب اُن سے پوچھیں جو آج تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جس پر ہم اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں ہم مل جل کر، پیار محبت، بھائی چارے اور اخوت سے بھرپور زندگی گزار سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے بابرکت مہینے کی بہترین گھڑی یعنی ۲۷ رمضان کو ہمیں اس نعمت سے نوازا۔ اسی مہینے میں عید کی خوشی بھی دے دی۔ یوں بے شمار خوشیاں ہمیں ایک ساتھ مل گئیں۔ اب ہم سب کو اس وطن کے لیے مل جل کر کام کرنا ہے۔ محنت اور لگن سے اپنے اپنے میدان میں نام روشن کرنا ہے اور اس ملک کی حفاظت کے لیے تن من دھن کی بازی تک لگا دینے میں کوتاہی نہیں برتنی۔ بچوں کے لیے یہ ساری باتیں معلوم ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ آج کے بچے ہمارا کل کا مستقبل ہیں اور اگر بنیاد درست ہوگی، مضبوط ہوگی تو مستقبل میں پودا یقیناً تناور درخت بنے گا۔

”دریا اور کہسار ہمارے گُل بوٹے گلزار ہمارے
غلے کے انبار ہمارے اللہ کا ہم پر احسان
پاکستان ہے پاکستان
اس کی شان بڑھائیں گے علم کے جوت جگائیں گے
آگے بڑھتے جائیں گے کر دیں گے سب کو حیران
پاکستان ہے پاکستان‘(۴۹)

کرامت بخاری بھی آزادی جیسی نعمت کی اہمیت بیان کر رہے ہیں۔ اس نظم میں بھی بچوں کو آزادی جیسی نعمت کی قدر کرنا سکھایا جا رہا ہے کہ اپنے وطن میں مل جل کر رہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ دل لگا کر پڑھیں تاکہ اپنے ملک وقوم کا نام روشن کر سکیں اور ہر پاکستانی اپنا اپنا کام پوری ایمانداری اور محنت سے کرے تاکہ پاکستان ترقی کرے۔

"بادل کالے برسیں چھم چھم پل میں کر دیں مٹی کو نم
موسم کو یہ پیارا کر دیں دلکش منظر سارا کر دیں
آنکھ مچولی دُھوپ سے کھیلیں سُورج کو سایے میں لے لیں
گل کر دیں بتی یہ دن کی گڑ گڑ گڑ گڑ گرج ہے ان کی
کڑک کڑک کڑ کائیں بجلی پَل بھر کو ہو جائے روشنی
بادل تو ہیں واٹر ٹینک یا پھر یہ ہیں واٹر بینک
جمع ہے پانی بادل میں برسے شہر میں جنگل میں
سر کے اُوپر ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ
پیڑ کے نیچے چُھپ چُھپ چُھپ چُھپ" (۵۰)

ابصار عبدالعلی بارش اور موسم کو اس نظم میں موضوع بنا رہے ہیں۔ بارش اور بادل سے بچوں کو سب سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ بارش خاص طور پر بچوں کو بے حد پسند ہوتی ہے۔ بارش میں بھیگنا، ناچنا، شور مچانا، بچوں کے پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ شاعر بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لیے اُس نے بارش کی منظرکشی بالکل اُسی انداز میں کی ہے جیسے بچے حقیقت میں اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ساتھ ہی آخر میں یہ پیغام بھی دیا ہے کہ بارش میں نہانے کے بعد نل کے پانی سے اچھی طرح صابن لگا کر نہالیں۔ کیونکہ اس سے سارے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد کچھ کھائیں پیئیں۔

"موسم بدلا لال رت بھی بدلی، بدل گئے انداز
مئی مہینہ دھوپ کی شدت گرمی کا آغاز
ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں کھاؤ، پنکھے خوب چلاؤ
راتیں چھوٹی دن ہیں لمبے، دن کو بھی سو جاؤ

سرسوں پھولی، فصلیں پک گئیں، پیلے ہوگئے پات

خربوزے، تربوز کی آمد، آموں کی بہتات''(۵۱)

کرامت بخاری اس نظم میں گرمیوں کے موسم کو بیان کر رہے ہیں۔ بہار کا موسم ختم ہوتے ہی موسم گرما کا آغاز ہو جاتا ہے اور مئی، جون، جولائی، اگست یہ شدید گرمی کے چار مہینے ہوتے ہیں۔ گرمی کی شدت اور حدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ نہ صرف دن بلکہ راتیں بھی بہت گرم ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسے موسم میں زیادہ سے زیادہ ٹھنڈی چیزیں کھانی چاہئیں۔ خربوزہ، تربوز اور آم اس موسم کے خاص پھل ہوتے ہیں۔ اس کے لیے دودھ، دہی، لسی اور ستو کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ کاٹن کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ مالی لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں وہ اس موسم میں مری کا رُخ کر لیتے ہیں اور گرمی کا سارا وقت ادھر ہی گزار کر آتے ہیں۔ بہرحال گرمی اور دھوپ سے بچنا چاہیے اور خاص طور پر بچے جو ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کیونکہ اکثر بچے لُو لگنے سے بیمار ہو جاتے ہیں۔

''منے میاں کل چھٹی کے دن چڑیا گھر جا پہنچے

وہاں انھوں نے رنگ برنگے بچو طوطے دیکھے

آزادی سے اُڑنے والے قید میں تھے بیچارے

چھوٹے بڑے لوہے کے پنجروں میں تھے طوطے سارے

دیکھے جنوبی امریکا اور افریقہ کے طوطے

دلکش دلکش پیارے پیارے نئے نویلے طوطے

اُس خالق کے قربان ہیں ہم جس سے انھیں بنایا

ضیاؔ اُسی نے ہر ایک شے سے دنیا بھر کو سجایا'' (۵۲)

ضیاء الحسن ضیاء اس نظم میں بچوں کے حوالے سے چڑیا گھر کے رنگ دکھا رہے ہیں۔ چڑیا گھر جانا بچوں کو اسی لیے بے حد پسند ہے کہ وہاں ہر طرح کے جانور اور پرندے ایک ہی جگہ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ قسم قسم کے

جانور، کئی قسم کے پرندے ان چڑیا گھروں میں ہوتے ہیں۔ جیسے اس نظم میں بھی چڑیا گھر میں موجود کئی اقسام کے طوطوں کا ذکر ہے پھر یہ کہ یہاں سے دیکھ کر اکثر بچے گھروں میں طوطے پال لیتے ہیں۔ لیکن یہ پرندہ آزاد رہنے کا عادی ہے اور موقع ملتے ہی اُڑ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو یونہی بے شمار رنگوں سے سجایا ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ وہ ان پرندوں اور جانوروں سے محبت کریں۔

''گرمی کی فیضان ہیں
سب کتنے شادمان ہیں

میلے میں جا رہے ہیں — پکنک منا رہے ہیں
دیکھو جدھر بھی بچے — دھومیں مچار رہے ہیں

گرمی کی چھٹیاں ہیں
سب کتنے شادمان ہیں

جاتا نہیں ہے مکتب — اپنے ہیں روز اور شب
بھولے ہوئے ہیں سب کچھ — دل کو نہیں ہے غم اب
یہ بھولنا نہ کوئی — پڑھنا بھی ہے ضروری
مکتب کھلے تو بھائی — دیکھو نہ ہو پٹائی''(۵۳)

ضیاء الحسن ضیاء اس نظم میں گرمیوں کی چھٹیوں کی اہمیت اور بچوں کی نظر میں ان کی اہمیت بیان کر رہے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں سب سے طویل ہوتی ہیں اور یہ ایسی تعطیلات ہوتی ہیں جن میں گھر کے سب افراد کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے ضرور جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے تو سب سے زیادہ خوشی کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اُنھیں صبح نہ جلدی اُٹھنا پڑتا ہے۔ نہ وقت بے وقت کھیلنے اور سونے پر پابندی ہوتی ہے۔ بلکہ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے کے پروگرام بن رہے ہوتے ہیں۔ اکثر بچے اپنے ننھیال رہنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ یوں چھٹیوں کا ہر دن بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ نیا اور نرالا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی نظم کے آخر میں بچوں کو یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے

کہ چھٹیاں ضرور منائیں۔ لیکن اپنی پڑھائی کو بالکل بھی نہ بھول کے بیٹھ جائیں۔ بلکہ ساتھ ساتھ پڑھتے بھی رہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو چھٹیاں گزار کر جب سکول جائیں تو پہلے ہی دن پٹائی ہو جائے۔ لہٰذا کھیل اور پڑھائی ساتھ ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ کھیل کے وقت خوب کھیلیں اور پڑھنے کے وقت دل لگا کر پڑھیں تا کہ کل کو آپ کو پچھتانا نہ پڑے اور کسی قسم کی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

’’ٹریفک کے ہم ہیں عزیزو اشارے
محافظ ہیں ہم سب اشارے تمہارے
ہوا سامنے سرخ دیکھو اشارہ
اشارہ ہے گاڑی کو یہ روکنے کا
جونہی دیکھو پیلے کلر کا اشارہ
گرین ہوگا فوراً ہی اگلا اشارہ
اشارہ ہرے رنگ کا جس گھڑی ہو
تو پھر چل پڑو آگے میرے عزیزو‘‘(۵۴)

ضیاء الحسن ضیاء ٹریفک قوانین کی اہمیت اس نظم کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ ٹریفک قوانین کی پابندی ہر شہری پر لازم ہے۔ کیونکہ ان قوانین پر عمل کر کے نہ صرف ہم اپنے لیے سفر آسان بن سکتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کے لیے بھی آسانی کا سبب بن سکتے ہیں۔ سرخ، پیلی اور سبز بتیاں، رُکنے، تیار رہنے اور چلنے کا اشارہ ہیں۔ اس طرح سڑک کے دائیں بائیں لگے مختلف نشان سڑک پر ہماری آسانی کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کو ایسی چیزوں کا ضرور پتا ہونا چاہیے تا کہ وہ بھی اگر کبھی اکیلے باہر نکلیں تو انھیں سڑک پر چلنے اور سفر کرنے کے قوانین کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔

’’رب کا اک احسان ہے ماں
ہمارے نبیؐ کا مان ہے ماں
ماں کے قدموں کو چومو
جنت کا ایقان ہے ماں
باپ کا سایہ رب کا کرم
رب کے کرم کی شان ہے ماں
برکت، رحمت اور شفقت
فضلِ خُدا کی جان ہے ماں
رب اعلیٰ کا کرم ہے باپ
قبلہ و کعبہ حرم ہے باپ
ماں کی دُعا جنت کی ہوا
ماں کی دُعا کا بھرم ہے باپ
محنت، مشقت، جانفشانی
درسِ عمل ہر دم ہے باپ
پیارے نبیؐ کا رستہ دکھا دے
ایسا نقشِ قدم ہے باپ‘‘(۵۵)

سید ذوالفقار حسین نقوی ماں باپ جیسی عظیم ہستیوں کے متعلق اس نظم میں بتا رہے ہیں۔ ماں باپ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں ان دو خوبصورت رشتوں سے نوازا ہے جو ہمیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ ہماری پرورش میں اپنا دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ انہی قربانیوں کی وجہ سے جو ماں باپ اپنی اولاد کے لیے دیتے ہیں اور جو تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا مقام بہت بلند رکھا ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو باپ کی خوشی اللہ کی خوشی ہے اور باپ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ اس لیے بچوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ سے بھی اسی قدر محبت کریں۔ بلکہ جب بچے بڑے ہو جائیں اور اُن کے ماں باپ پیری کو پہنچ جائیں تو وہ بھی ان کی اس طرح خدمت اور پرورش کریں۔ جس طرح انھوں نے ہمیں بچپن میں پالا تھا تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

پھول:

ماہنامہ ’پھول‘ رسالہ، نوائے وقت گروپ کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۹۰ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا اور آج تک جاری و ساری ہے۔ یہ رسالہ بچوں میں بے حد مقبول ہے اور بچوں کی اچھی وقت گزاری کے ساتھ ساتھ یہ اُن کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں بھی بے حد اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اسے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے ’’تعمیر پاکستان نمبر‘‘ کے مقابلے میں بچوں کا بہترین رسالہ ہونے کا ایوارڈ ملا تھا۔ پھول میں بچوں کے حوالے سے کہانیاں، نظمیں، اقوالِ زریں، معلومات، مصوری وغیرہ شائع ہوتے ہیں اور زیادہ تر نظمیں اور کہانیاں اُس مہینے سے متعلق کسی خاص موقع یا واقعہ کی مناسبت سے ہوتی ہیں جو اُس مہینے میں گزرے ہوں۔ ذیل میں ’’پھول‘‘ میں شائع ہونے والی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ کس طرح سے بچوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بچے ان سے کیا کچھ سیکھتے ہیں۔

’’حُسن کی آرزو بھی تو ۔۔۔ عشق کی آبرو بھی تو
یہ دل تشنہ کام کی ۔۔۔ لذتِ جستجو بھی تو
تیرے بغیر فکر میں ۔۔۔ تشنۂ آگہی کہاں
میکدہ حیات میں ۔۔۔ جام و گل وسبو بھی تو

کیوں نہ سکوں کی چاندنی دل کے نگر میں ہو کہ جب
چاک دل و نگاہ کا میرے لیے رفو بھی تو''(۵۶)

ڈاکٹر صفی حسن اس نظم میں اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔ اللہ پاک نے یہ کائنات بنائی اور سجائی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی حسین ہیں اور حسن کو پسند کرتے ہیں۔ جب انسان خود کو پہچان جاتا ہے تو وہ اپنے رب کو پہچان جاتا ہے۔ پھر جب وہ اللہ کو پہچان جاتا ہے تو اُسے ہر شے پر نظارے میں صرف اور صرف اللہ کی قدرت نظر آتی ہے۔ اُسے ہر شے میں اپنے بنانے والے کا خیال نظر آتا ہے۔ اُسے اپنی کوئی فکر نہیں رہتی۔ صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کی پرواہ ہوتی ہے۔ صرف اپنے محبوب کا دیدار کرنا اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہ دنیا اور اس دنیا کی کشش اُس کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتی۔ یہ خودی کا وہ مقام ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور جس کو یہ مقام مل جائے، اُس سے بڑا خوش نصیب پھر کوئی نہیں ہوتا۔ بچوں کے لیے اس نظم میں بے شمار نئے الفاظ ہیں اور ساتھ ہی وہ اللہ اور انسان کی محبت کے اس نئے پہلو سے بھی آشنا ہوں گے جو پہلے کبھی نہ دیکھا اور نہ سُنا ہوگا۔

''نہ میں زادِ حرف سے مطمئن نہ تو اپنے ظرفِ کلام سے
کر بہت فرد ہیں سخن میرے، تیرے حلقۂ دوام سے
یہ کرم ہے تیری نگاہ کا کہ گزر رہی ہے کچھ اس طرح
کبھی دن سلام و درود میں کبھی شب درود و سلام میں
مرے کردگار کے فیض سے ترا اختیار کہاں نہیں
یہ زمین بھی تیرے ہی دم سے ہے یہ فلک بھی تیرے نام سے''(۵۷)

ڈاکٹر صفی حسن نبی اکرمؐ کی شان میں نعتیہ پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ آپؐ کو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور آپؐ پر نبوت کا اختتام ہوا۔ آپؐ کا مقام تمام پیغمبروں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ آپؐ تمام نبیوں کے امام ہیں۔ آپؐ کو ہمیشہ اپنی امت کی فکر رہی۔ آپؐ نے اس فکر میں آنسو بہائے۔ آپؐ اللہ

کے محبوب نبی ہیں۔ آپؐ کو اللہ پاک نے معراج پر بلایا۔ آپؐ کا مقام اتنا بلند ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ آپ نے معراج پہ کافی مقامات دیکھے۔ لیکن ایک مقام ایسا آیا جہاں سے آگے جبرائیلؑ بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہاں صرف اللہ کے نبیؐ گئے۔ آپؐ کا رتبہ اور مقام بہت اُونچا ہے۔ اللہ پاک نے یہ ساری کائنات بنائی اور سجائی ہی آپؐ کے لیے تھے۔ لیکن انسانی عقل آپؐ کے مقام کو نہ کبھی پہنچی ہے نہ پہنچ سکتی ہے۔ اقبال نے درست کہا تھا:

ے تیرے اوصاف کا اِک باب بھی پورا نہ ہوا
ہو گئیں زندگیاں ختم اور قلم ٹوٹ گئے

یوں آپؐ کا مقام اور رتبہ بہت بلند ہے۔ قیامت کے دن تمام اُمتی آپؐ کی شفاعت کے منتظر ہوں گے۔ آپؐ کی تعریف بیان کرنا یہ ہم گنہگاروں کے بس کی بات نہیں۔ بس درود و سلام کا سلسلہ ہے جو روز و شب جاری و ساری ہے۔ نبی اکرمﷺ کو مقام و مرتبہ اور سیرت کے متعلق بچوں کو بھی معلومات ہونا بے حد ضروری ہے۔

"نیکی کا تم کام کرو نیکی کو تم عام کرو
اچھے کو تم اچھا جانو بات بڑوں کی ہر دم مانو
محنت سے تم نام کماؤ محنت سے تم چلتے جاؤ
ہر سو بچو پھول کھلیں گے ہر سو پھر تو پھول ملیں گے"(۵۸)

شہریار احمد اچھے بچوں کی خصوصیات کو اس نظم میں موضوع بنا رہے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کو بہت ساری اچھی باتیں سکھائی جا رہی ہیں کہ نیکی کے کام کریں۔ یعنی دوسروں کے کام آئیں۔ دوسروں کی مدد کریں۔ ساتھ ہی بڑوں کا کہا مانیں۔ جس بات سے وہ منع کریں، رُک جائیں۔ جس چیز سے وہ روکیں۔ اُس سے دور رہیں۔ ساتھ ہی محنت کا درس دیا گیا ہے۔ کیونکہ محنت میں ہی عظمت اور کامیابی ہے۔ لہٰذا دل لگا کر پڑھیں۔ اس طرح دوسروں کی بھی مدد کریں۔ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں گے تو اللہ بھی ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے گا۔ دوسروں کا بھلا سوچیں گے تو ہمارے ساتھ بھی بھلا ہی ہوگا اور جو بھی ان باتوں پر عمل کرے گا اور اسی طرح

اچھے طریقے سے رہے گا۔ وہی دنیا اور آخرت میں کامیاب اور فلاح پائے گا۔

''مارچ کی تاریخ تئیس اور سن چالیس تھا ــــ تھی صدی جب بیسویں، لاہور میں نعرہ لگا
ملتِ اسلامیہ تو ملتِ خوددار ہے ــــ اِک وطن آزاد، مسلم کے لیے درکار ہے
دو برس پہلے ہوا تھا انتقال اقبال کا ــــ شاعرِ مشرق نے بھی ایسا تصور تھا دیا
قائداعظم اُٹھے، رہبر بنے اور ڈٹ گئے ــــ تھے غلامی کے جو بادل، فضلِ رب سے چھٹ گئے'' (۵۹)

تنویر پھول اپنی اس نظم مینار پاکستان میں کی اہمیت اور اس وقت کے حالات و واقعات روشناس کروا رہے ہیں۔ ۲۳-مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی جس میں یہ قرارداد شامل تھی کہ مسلمان اکثریتی علاقوں کو ایک الگ ریاست بنا دیا جائے۔ جہاں وہ مذہبی آزادی سے اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ کیونکہ انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی نے مسلمانوں پر زندگیاں بہت تنگ کر دی تھیں۔ مسلمان مالی لحاظ سے بھی بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ انہی حالات کو دیکھتے ہوئے اقبال نے ایک الگ وطن کو خواب دیکھا۔ جس کو تعبیر کی شکل قائداعظم نے دی اور شبانہ روز محنت اور بے شمار قربانیوں کے بعد یہ ملک حاصل کر سکے۔ اُس جگہ جہاں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ اس جگہ پر ایک عظیم یادگار کے طور پر مینارِ پاکستان بنایا گیا جو قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کو اُس تاریخی قرارداد اور عظیم قربانیوں کی یاددلاتا رہے گا کہ یہ وطن اسلام کے نام پہ کس قدر محنت سے حاصل کیا گیا ہے تاکہ وہ بھی اس کی قدر کریں۔

''وہ دیکھو وہ آئی چڑیا ــــ چونچ میں دانہ لائی چڑیا
بچہ بھی منہ کھول رہا ہے ــــ جیسے وہ یہ بول رہا ہے
امی کھانا مجھے کھلاؤ ــــ بھوک لگی ہے جلدی آؤ
چڑیا اس کے پاس آئے گی ــــ کھانا دے کر بہلائے گی
پُھر سے اُڑ جائے گی چڑیا ــــ دانہ پھر لائے گی چڑیا
خود نہ کھائے اُسے کھلائے ــــ یوں ممتا کا فرض نبھائے'' (۶۰)

سمر فارانی اپنی اس نظم 'ممتا' میں ماں جیسے خوبصورت رشتے کی اہمیت بیان کر رہی ہیں۔ ماں اپنے بچوں سے بے حد محبت کرتی ہے۔ بچوں کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی ہے۔ خواہ وہ خود کتنی بھی تھکی ہوئی کیوں نہ

ہو، بچوں کے کاموں کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ بچوں کی پریشانی ماں کو بھی پریشان کر جاتی ہے۔ ماں انسان کی ہو یا پرندے کی۔ دونوں کی ممتا ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ یہاں اس نظم میں چڑیا اپنے بچے کو دانے دُنکا کھلا رہی ہے۔ وہ اُڑ کر جاتی ہے کہیں دور سے دانہ ڈھونڈ کر اپنی چونچ میں لاتی ہے اور بچے کو کھلاتی ہے اور پھر سے اُڑ جاتی ہے جب تک بچوں کا پیٹ نہ بھرے وہ اسی طرح آتی جاتی ہے۔ خود بعد میں کھاتی ہے ار یوں وہ اپنے ماں ہونے کا فرض بڑی ایمانداری سے نبھا رہی ہوتی ہے۔ بچوں کو اس سے احساس ہوگا کہ مائیں ان کا کس قدر خیال رکھتی ہیں۔

''سڑکیں باتیں بھی کرتی ہیں	بوجھو تو یہ کیا کہتی ہیں
پیلی اور سفید لکیریں	غور سے پڑھنا یہ تحریریں
سائن بوڈ بھی پڑھتے جانا	اور سفر محفوظ بنانا
رنگ بدلتا سگنل کیا ہے	جس نے یہ پیغام دیا ہے
سرخ اشارے پہ رُک جاؤ	اچھے شہری تم کہلاؤ'' (۶۱)

اسی طرح اس نظم 'اچھے شہری' میں بھی سمر فارانی ایک ذمہ دار شہری کی خصوصیات بتا رہی ہیں۔ سڑکوں پر موجود مختلف اشارے یا سائن بورڈ شہریوں کے تحفظ کے لیے اور ان کا سفر محفوظ اور آسان بنانے کے لیے ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے لیے زیبرا کراسنگ کی جگہ پر پیلی اور سفید رنگ کی لکیریں ہوتی ہیں۔ اسی طرح رنگ برنگے سگنل بھی سفر میں آسانی کے لیے ہوتے ہیں۔ سرخ رنگ رُکنے کا اشارہ ہے۔ پیلا رنگ تیار رہنے کا اور سبز رنگ کی بتی چلنے کا اشارہ ہے۔ اگر تمام شہری سڑک پر سفر کرتے وقت سفری اُصولوں اور قوانین کی پابندی کریں گے تو وہ نہ صرف جلدی اپنی منزل پر پہنچیں گے بلکہ بہت سے حادثات سے بھی بچ سکیں گے۔ بچوں کو بھی اس طرح سڑک پر سفر کرنے کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے تاکہ وہ بھی محفوظ سفر کے عادی ہو جائیں۔

''گرمی کا ہے موسم آیا	شربت والا شربت لایا
اُف یہ گرمی اور پسینہ	کتنا ظالم جون مہینہ
بند ہوائیں دل گھبرایا	گرمی کا ہے موسم آیا
اس گرمی سے بچنا بچو	سر کو ڈھانپے رکھنا بچو
ہم کو ابو نے سمجھایا	گرمی کا ہے موسم آیا''(۶۲)

چوہدری عبدالخالق گرمی کے موسم کو اس نظم میں موضوع بنا رہے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے کا انحصار موسم کی تبدیلی کے مطابق ہوتا ہے جیسے ہی موسم بدلتا ہے۔ اُس کے مطابق ہمارے روزمرہ زندگی بدل جاتے ہیں۔ گرمی کا موسم آتے ہی شربت اور لسی کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور کافی اور چائے کی مانگ بہت کم ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈی چیزیں کھانا سب ہی پسند کرتے ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کو یہ خصوصی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس گرمی سے بچیں اور جب بھی باہر نکلیں سر کو ڈھانپ کر نکلیں ورنہ لُو لگنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

"گر نہ پڑھو گے مشکل ہوگی　　یونہی لڑو گے مشکل ہوگی
علم سے دوری کیسی عزت　　بات کرو گے مشکل ہوگی
پودے لگا کے پھل مانگو گے　　پانی نہ دو گے مشکل ہوگی
سورج سر پہ آیا سوچو　　سوئے رہو گے مشکل ہوگی
عالم لوگوں کی محفل میں　　جو بھی کہو گے مشکل ہوگی
اپنے حق کی خاطر بولو　　ظلم سہو گے مشکل ہوگی"(۶۳)

مظفر حسین اپنی اس نظم میں علم کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں کہ جس کے بغیر انسان شعور اور آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ انسان کو دنیا میں رہتے اور آگے بڑھنے کے لیے علم کی بے حد ضرورت ہے۔ صرف پڑھی لکھی اقوام ہی ترقی یافتہ اقوام کہلاتی ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر بچوں کو یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ پڑھنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔ ویسے بھی جہالت میں سکون کم اور لڑائی جھگڑے زیادہ ہوتے ہیں کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ لہٰذا علم حاصل کرنے میں ہی عزت ہے۔ لہٰذا بچوں میں شروع سے ہی علم سے محبت کا شوق پیدا کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ ایسے ہی ہے کہ انسان پودا لگا کر اُس کو پانی دیے بنا پھل کی تمنا کرے۔ جب تک پودے کی حفاظت نہ کی جائے اُس کو کھاد پانی نہ ڈالا جائے تو وہ کیسے پروان چڑھے گا یعنی کہ کامیابی کے لیے محنت ضروری ہے اور پڑھائی محنت مانگتی ہے۔ ورنہ جاہل کے جاہل رہ جاؤ گے اور جب پڑھے لکھوں کی محفل میں بیٹھو گے تو شرمندگی کا سامنا اُٹھانا پڑے گا۔ زندگی میں کوئی بھی چیز آسانی سے نہیں مل جاتی۔ اُس کے لیے محنت کرنا شرط ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھیں گے، تبھی کامیابی قدم چومے گی۔

''تیری باتیں تھی اٹل اور پُراثر تھی گفتگو | تیری کاوش رنگ لائی تو ہوا ہے سُرخرو
تونے پاکستان قائم کرکے پائی آبرو | تو امیر کارواں ہے رہنمائے قوم تو
خوابِ غفلت سے جگایا تو نے اپنی قوم کو | نقش منزل کا دکھایا تونے اپنی قوم کو
خواب اپنی قوم کے تونے حقیقت کر دیے | نغمۂ عظمت سنایا تونے اپنی قوم کو''(۶۴)

آصف شہزاد بانی پاکستان کی محنت اور کاوشوں کو اس نظم میں سراہ رہے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جب ایک بار علیحدہ وطن حاصل کرنے کی ٹھان لی تو پھر وہ اپنے اس مقصد سے بالکل بھی پیچھے نہیں ہٹے اور نہ ہی کمزور پڑے۔ آپ نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور علیحدہ اسلامی فلاح ریاست کا ارادہ ظاہر کیا۔ تمام مسلمانانِ ہند آپ کی رہنمائی میں چل پڑے اور یوں دن رات کی محنت اور بے شمار عظیم قربانیوں کے بعد یہ ملک حاصل ہوا۔ حالانکہ انگریزوں اور ہندوؤں کو لگتا تھا کہ قائداعظم کبھی بھی الگ ملک نہیں بنا سکیں گے اور اگر بنا بھی لیا تو اتنا کمزور ملک زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گا۔ بانی پاکستان نے اُن کی ساری غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ نہ صرف پاکستان حاصل کیا بلکہ اسے اپنے پیروں پر بھی کھڑا کر دیا۔ آج یہ ملک ہم سب کے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہے جس کی آزاد فضاؤں میں ہم سانس لیتے ہیں اور آپ یہ ذمہ داری اس قوم کی ہر آنے والی نئی نسل پر ہے کہ وہ نہ صرف اس ملک کی حفاظت کریں بلکہ اس کی ترقی وخوشحالی میں اپنا اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

حوالہ جات (باب اوّل)

۱۔ جامع ترمذی، ابواب البر والعلبتہ، باب رحمۃ العیان، حدیث نمبر ۱۹۱۹، مکتبۃ العلم، اردو بازار لاہور، ج ۴، ص ۳۲۱

۲۔ محمد ارشد، ڈاکٹر، "بچے کا حق اختیار" (فقہی مسالک اور مروجہ قوانین کا تقابل) غیر مطبوعہ، ذاتی مخزونہ

۳۔ ur.m.wikipedia.org/wiki/طفل

۴۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الم، غلبت الروم، حدیث نمبر ۴۴۹۷، ج ۴، ص ۷۹۲

۵۔ کنز العمال، حدیث نمبر ۴۴۱۵۴، ج ۱۶، ص ۱۲۸

۶۔ قاضی جاوید، "تعلیم و تربیت، روسو یورپی روشن خیالی کا نمائندہ" مشعل بکس، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۰۱ء، ص ۸۴

۷۔ ایضاً، ص ۸۵

8. Cahn, Steven, "The Philosophical Foundations of Education", New York, Harpev and Raw publishers, 1970

۹۔ محمد عارف ضیاء، ڈاکٹر، میاں محمد اسلم، "تعلیمی نفسیات اور اس کا دائرہ کار" تعلیمی نفسیات اور نصاب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، اشاعت ہفتم ۲۰۱۳، ص ۱۳

۱۰۔ ایضاً

11. Dewey, John (1938) "Experience and Education", New York, Ny: KAPPA DELTA. p1

12. ایضاً

۱۳۔ ایم اے قریشی، "فرائیڈ اور لاشعور" مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۰۷ء، ص ۴۹

14. en.m.wikipedia.org

15. en.m.wikipedia.org

16. en.m.wikipedia.org

17. en.m.wikipedia.org

۱۸۔ زیب النساء بیگم، "بچوں کے ادب کی ضرورت: اقبال اور بچوں کا ادب"، قومی کونسل برائے فروغ زبانِ اُردو"، نئی دہلی، اشاعت اول ۲۰۰۰، ص ۲۷

19. Walesonline.co.uk. (How Nursery rhymes can help children learn)

۲۰۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، "اُردو میں بچوں کا ادب" نیشنل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۷۰ء

۲۱۔ اسد اریب، ڈاکٹر، "بچوں کے ادب میں نئے رجحانات"، مکتبہ کتاب گھر، ملتان، ۱۹۹۴ء

۲۲۔ اسد اریب، ''بچوں کا ادب، تجزیے اور تجاویز''، مکتبہ کتاب گھر، ملتان، ۲۰۰۲ء

۲۳۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ''اُردو میں بچوں کا ادب''، نیشنل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۷۰ء

۲۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''پاکستان میں بچوں کا ادب''، ماہنامہ کتاب، لاہور، جلد۱۳، شمارہ۴، جنوری ۱۹۷۹ء

۲۵۔ مسعود احمد برکاتی، ''پاکستان میں بچوں کا ادب، انسائیکلوپیڈیا''، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۸ء

۲۶۔ صادق حسین طارق، پروفیسر (تالیف)، ''حکیم محمد سعید (شخصیت اور فن)''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، اشاعتِ اوّل ۱۹۹۰ء، ص ۸۵

۲۷۔ محمد افتخار کھوکھر، ڈاکٹر، ''روشنی کا سفر، بچوں کے ادب کے ۲۵ سال''، شعبہ بچوں کا ادب، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، اشاعت اوّل، ۲۰۱۳ء، ص ۲۹

۲۸۔ فخر زمان (مدیر)، ''بچوں کا ادب (جلد اوّل: عالمی ادب سے انتخاب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۲-۹۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱

۲۹۔ محمد عاصم بٹ (مدیر)، ''بچوں کا ادب (جلد دوم: قومی ادب، حصہ نظم)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۴-۹۵، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۱

۳۰۔ محمد عاصم بٹ (مدیر)، ''بچوں کا ادب (جلد سوم: قومی ادب، حصہ نثر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۹، اپریل تا جون ۲۰۱۳ء، ص ۱

۳۱۔ الیس مغنی حیدر، ''دعا'' ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ: ۲ جلد: ۶۳، فروری ۲۰۱۵ء، ص ۷

۳۲۔ ضیاالحسن ضیا، ''دعا''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ: ۹، جلد: ۶۲، ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۷

۳۳۔ ضیاالحسن ضیا، ''کسی کو کیا معلوم''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ ۲ جلد ۶۳، فروری ۲۰۱۵ء، ص ۸

۳۴۔ تنویر پھول، ''محمد علی جناح''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ ۹، جلد ۵۱، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۳۷

۳۵۔ اعجاز رحمانی، ''ملک و ملت کی پہچان''، ہمدرد نونہال، مدیر مسود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ ۱، جلد: ۵۲، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۳۷

۳۶۔ کرشن پرویز، ''نصیحت''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ: ۹، جلد: ۶۲، ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

۳۷۔ شمس القمر عاکف، ''پیغام''، ایضاً، ص ۳۹

۳۸۔ آفاق صدیقی، ''اے فوج کے جوانو!''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ: ۹، جلد: ۵۲، ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۶

۳۹۔ عباس العزم، ''دیس ہمارا''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ: ۸، جلد ۶۲، اگست ۲۰۰۹ء، ص ۷

۴۰۔ محمد ظریف خان، ''۱۴۔اگست''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ:۸، جلد ۵۹، اگست ۲۰۱۱ء، ص ۳۱

۴۱۔ رفیع یوسفی، ''پہلا روزہ''، ایضاً، ص ۶

۴۲۔ محسن احسان، ''گڑیا کا گھر''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ:۱، جلد: ۵۲، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۴

۴۳۔ محسن احسان، ''پھول ہی پھول''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ:۹، جلد: ۵۱، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۷

۴۴۔ صبا اکبری، ''بچگانہ شوق''، ایضاً، ص ۷

۴۵۔ ضیاء الحسن ضیا، ''بارش''، ہمدرد نونہال، مدیر، مسعود احمد برکاتی، کراچی، شمارہ:۸، جلد:۶۲، اگست ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۴۶۔ کرامت بخاری، ''حمد''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ: ۶، جلد: ۲۷، اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص ۲

۴۷۔ سید شبیر احمد شاہ، ''نعت''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۷، جلد: ۳۷، نومبر ۲۰۱۰ء، ص ۲

۴۸۔ ضیاء الحسن ضیاء، ''جشن آزادی''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۴، جلد:۲۷، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۳

۴۹۔ کرامت بخاری، ''پاکستان ہے پاکستان''، تعلیم و تربیت، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ۱۲، جلد:۲۷، اپریل ۲۰۱۲ء، ص ۳

۵۰۔ ابصار عبدالعلی، ''بادل کالے بادل''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۵، جلد:۲۷، ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۲

۵۱۔ کرامت بخاری، ''مئی کا مہینہ''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۱، جلد۲۷، مئی ۲۰۱۲ء، ص ۲۸

۵۲۔ ضیاء الحسن ضیاء، ''رنگ برنگے طوطے''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۱۲، جلد:۲۷، اپریل ۲۰۱۲ء، ص ۳۲

۵۳۔ ضیاء الحسن ضیاء، ''گرمی کی چھٹیاں''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۳، جدل:۶۹، جون ۲۰۰۹ء، ص ۵۷

۵۴۔ ضیاء الحسن ضیاء، ''ٹریفک کے اشارے''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۱، جلد:۲۷، مئی ۲۰۱۲ء، ص ۳۳

۵۵۔ سید ذوالفقار حسین نقوی، ''ماں باپ''، تعلیم و تربیت، مدیر، عبدالسلام، فیروز سنز، لاہور، شمارہ:۶، جلد:۲۷، اکتوبر ۲۰۱۴ء، ص ۳۶

۵۶۔ ڈاکٹر صفی حسن، ''حمد''، پھول، مدیر، محمد شعیب مرزا، نوائے وقت لاہور، شمارہ:۳۰۰، ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۲

۵۷۔ نعت، ایضاً

۵۸۔ شہر یار احمد، ''بچے اچھے''، پھول، مدیر، محمد شعیب مرزا، نوائے وقت لاہور، شمارہ: ۲۹۳، فروری ۲۰۱۵ء، ص ۲۷

۵۹۔ تنویر پھول، ''مینارِ پاکستان'' پھول، مدیر، محمد شعیب مرزا، نوائے وقت لاہور، شمارہ: ۲۰ء، ص ۱۷

۶۰۔ سحر فارانی، ''ممتا''، ایضاً، ص ۲۷

۶۱۔ ''اچھے شہری''، ایضاً

۶۲۔ چوہدری عبدالخالق، ''گرمی کا ہے موسم آیا''، پھول، مدیر، محمد شعیب مرزا، نوائے وقت لاہور، شمارہ: ۲۹۷، جون ۲۰۱۵ء، ص ۲۷

۶۳۔ مظفر حسین، ''مشکل ہوگئی''، ایضاً

۶۴۔ آصف شہزاد، ''عظیم قائد''، پھول، مدیر، محمد شعیب مرزا، نوائے وقت لاہور، شمارہ: ۳۰۰، ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۷

باب دوم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے موضوعات کا احاطہ: تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

۱۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم — مختصر تعارف

صوفی تبسم نے صوفی کا لقب دادا سے ورثے میں پایا ہے۔ پورا نام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ہے۔ لفظ صوفی تصوف سے نکلا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عربی ہے نہ فارسی بلکہ یونانی زبان کا لفظ ہے اور ''ص'' کی بجائے ''س'' سے لکھا جاتا ہے جس کے معنی حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی زبان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں ہوا تو لوگوں نے اہلِ تصوف کو صوفی کہنا شروع کیا اور حروف ''س'' کو ''ص'' سے بدل دیا۔

عربی زبان میں صوف کا لفظ پشمینہ، اون یا نمدہ کے معنوں میں آتا ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ کشمیر کے وہ لوگ جنھوں نے پشمینے کا کام اختیار کیا تھا۔ وہ اس لفظ کی معنوی نسبت کے سبب صوفی کہلائے۔ عام کشمیری گھرانوں کے افراد اور نانبائی کشمیریوں کا خیال ہے کہ یہ لقب انھیں ان کے آباؤ اجداد کی نیکی و شرافت کے صلے میں ملا مگر تحقیق سے یہ بھی واضح ہے کہ کشمیریوں میں نانبائیوں کو بھی صوفی کہتے ہیں۔ بہرحال جس فرقے کا پشمینہ سے جس طرح کا بھی تعلق رہا ہے۔ یہ فرقہ اس کی معنوی نسبت کے سبب صوفی کہلایا اور صوفی تبسم کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی اون بافی تھا۔

صوفی تبسم ۴۔اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام غلام مصطفیٰ اور لقب صوفی تھا۔ ان کے والد نے دو شادیاں کیں اور وہ اپنے والد کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام غلام فاطمہ تھا۔ صوفی تبسم کے آباؤ اجداد کشمیر میں سکونت پذیر تھے۔ جہاں یہ لوگ شال بافی اور پشمینے وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ اوسط درجے کا معمولی پڑھا لکھا یہ خاندان اپنے آغاز سے ہی بہتر پیشہ تھا۔ جب کشمیر میں قحط پڑا تو بہت سے کشمیری گھرانوں نے پنجاب کا رُخ کیا اور لاتعداد خاندان لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، امرتسر اور دیگر کئی شہروں

میں آباد ہوئے۔صوفی تبسم کے دادا بھی اپنے خاندان سمیت امرتسر میں آ کر آباد ہوئے۔

صوفی تبسم کے والد کا نام صوفی غلام رسول تھا۔ نانبائی کے پیشے کے ساتھ جائیداد کی خرید وفروخت کا کام بھی کرتے تھے۔ ان دونوں کاموں میں انھوں نے خاصی دولت کمائی اور یوں وہ امرتسر میں متعدد دکانوں اور امکانات کے مالک بن گئے۔

بچپن میں صوفی تبسم کے دادا نے انھیں ایک مسجد میں بٹھایا جس کے امام ان کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ مسجد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب ان کے دادا انتقال کر گئے تو انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مطب میں حکیم مفتی غلام رسول کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ ان سے صوفی تبسم نے اُردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب پڑھی۔ ابتدائی حساب اور لکھائی کا کام انھیں اپنی والدہ نے سکھایا۔ جب وہ سکول جانے کے قابل ہوئے تو ان کے والد نے انھیں شہر کے ایک مدرسے چرچ مشن ہائی سکول کی پرائمری برانچ میں داخل کر دیا۔ یہ مدرسہ اس وقت صوبے کی بہترین درس گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس مدرسے کی بابت صوفی تبسم لکھتے ہیں:

> ''انگلستان کی کلیسائی تبلیغی انجمن نے اس شہر میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا۔ چرچ مشن ہائی سکول وہی مدرسہ تھا جو الحاق پنجاب کے تین سال بعد انگریزی عمل داری میں جاری ہوا۔ .... عیسائیت کے خلاف عام تعصب کے باوجود ایک کامیاب تعلیمی درس گاہ تھا۔''(۱)

پرائمری کی تین جماعتیں پاس کرنے کے بعد وہ چوتھی جماعت میں داخل ہوگئے اور نظام رائج الوقت کے مطابق اسی جماعت سے ان کی فارسی اور انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں صوفی تبسم نے ضلع بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ ہائی سکول کے اساتذہ میں فارسی، انگریزی اور ڈرائنگ کے اساتذہ نے صوفی تبسم کو بطورِ خاص متاثر کیا۔صوفی تبسم نے ۱۹۱۷ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

میٹرک کا امتحان ایک اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کی وجہ سے صوفی تبسم کا ارادہ تھا کہ آئندہ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کریں گے۔مگر چونکہ وہ کم عمر تھے۔ اس لیے ان کے والد صاحب نے مشورہ دیا کہ ان کے لیے شہر کے کالج (خالصہ کالج امرتسر) میں داخلہ بہتر ہے۔ چنانچہ صوفی تبسم نے خالصہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۱۹ء میں اسی کالج سے آرٹس میں صوفی تبسم نے ایف۔ اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور بی۔اے میں

داخلہ لے لیا۔

کالج میں نصابی کتب کے علاوہ صوفی تبسم نے شعرالعجم اور دیوانِ غالب کا بھی مطالعہ کیا۔ جس سے ان کے ذوق شعر کو پختگی اور معیارِ شعر کو رفعت حاصل ہوئی۔ سکول کے زمانے میں صوفی تبسم نے شعر گوئی کے سلسلے کا آغاز کیا اور کالج میں پہنچ کر وہ معروف شاعر اور عالم علامہ فیروز طغرانی کے باقاعدہ شاگرد ہوگئے۔ امرتسر کے مشہور عالم اور شاعر جناب علامہ محمد عرشی بھی، جو انہی دنوں صوفی تبسم کے پڑوس میں آ کر آباد ہوئے تھے، ان کے دوست بن گئے۔ ان بزرگوں کی صحبت نے صوفی تبسم کے شعری ذوق کو جلا بخشی۔ اسی زمانے میں فارسی گوئی نے اُردو گوئی کے مقابلے شدت اختیار کی اور طبیعت شعر گوئی کی جانب اس قدر مائل ہوئی کہ وہ نصابی کتب کی طرف بھرپور توجہ نہ دے سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بی۔اے میں فیل ہوگئے۔ اس کے بعد صوفی تبسم نے لاہور آ کر ایف۔سی کالج میں بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کالج میں ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں ایم ڈی تاثیر، بشیر ہاشمی، کرنل مجید ملک اور پنڈت دیا ناتھ زتشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ایف۔سی کالج میں صوفی تبسم صاحب کے اُستاد پروفیسر میر چند سوری نے کالج میں ادبی محافل قائم کر رکھی تھیں۔

بی۔اے میں صوفی صاحب کے مضامین فلسفہ اور فارسی تھے اور بطور آنرز فارسی کا مضمون بھی لے رکھا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں فارسی آنرز کے ساتھ انھوں نے ایف۔سی کالج لاہور کی طرف سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

صوفی تبسم کے والد چونکہ کاروباری آدمی تھے۔ اس لیے انھوں نے بی۔اے کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو بھی کاروبار کی طرف راغب کرنا چاہا اور صوفی تبسم کو درآمدات و برآمدات کا ایک دفتر کھول دیا۔ صوفی تبسم نے یہ کام چند ماہ جاری رکھا۔ ایک دفعہ کاروباری سلسلے میں لاہور آئے۔ دوستوں کو کالج جاتے دیکھا تو خود بھی اسلامیہ کالج لاہور میں ایم۔اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ دیگر اساتذہ کے علاوہ یہاں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور پروفیسر قاضی فضل حق سے بھی انھوں نے پڑھا اور اسلامیہ کالج لاہور سے ایک ہی سال میں ایم۔اے فارسی کا امتحان پاس کر لیا۔

ایم۔اے کرنے کے بعد صوفی صاحب نے چند مہینے گورنمنٹ آف انڈیا آرمی ہیڈ کوارٹرز میڈیکل ڈائریکٹوریٹ میں ملازمت کی مگر چونکہ طبیعت معلّمی کی طرف راغب تھی اس لیے انھوں نے مذکورہ ملازمت ترک

کر کے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بی۔ ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۶ء میں بی۔ ٹی کا امتحان پاس کر کے تعلیم کا سلسلہ مکمل کیا۔

ایم ۔اے، بی۔ ٹی کرنے کے بعد صوفی صاحب ۷۔ جون ۱۹۲۶ء کو گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہوگئے۔ ۲-مئی ۱۹۲۷ء کو امرتسر ہی میں اے۔ ڈی۔ آئی (اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز) مقرر ہوگئے جہاں ۲۰ ستمبر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد ۱۱۰ روپے ماہانہ مشاہرے پر السنہ شرقیہ کے لیکچرر بن کر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور آ گئے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں ان کو اورینٹل ٹریننگ کلاسز کو فارسی کی تدریس کا کام سونپا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک محکمانہ فیصلے کے بعد جب مذکورہ کلاسیں ختم کر دی گئیں تو گورنمنٹ کالج لاہور اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل صاحبان کی باہمی رضامندی سے ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوگیا۔ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو پہلے عارضی طور پر فارسی کے ایڈیشنل لیکچرر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے اور پھر مارچ ۱۹۳۲ء کو اسی اسامی پر مستقل ہوگئے اور ریٹائرمنٹ تک اسی کالج میں رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں انھوں نے ایف۔ اے سے لے کر ایم۔ اے کی سطح تک طلبہ کو اُردو، فارسی پڑھائی ۔ انھوں نے انٹر کالجیٹ نظام کے تحت پنجاب یونیورسٹی میں بھی ایم۔ اے اُردو فارسی کلاسوں کو پڑھایا۔ ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر رشید احمد کے ریٹائر ہونے پر صدر شعبہ فارسی ہوگئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین "راوی" کے لیے فارسی، اُردو اور پنجابی زبانوں میں انھوں نے متعدد مضامین ، ڈرامے، غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ بہت سے انگریزی ڈراموں کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈرامیٹک کلب کے تحت یورپی ڈراموں کے مشرقی تراجم کا جو سلسلہ چلا تھا۔ اس میں صوفی تبسم کے اہم کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب کی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کے علاوہ گورنمنٹ کالج کی مشہور ادبی سوسائٹی "اُردو مجلس" میں پطرس بخاری اور صوفی تبسم کی باقاعدہ شرکت اور دلچسپی نے اس کو بے حد فعال بنایا۔ جس کے نتیجے میں اس مجلس کے شرکت کنندگان نے علم و ادب کی دنیا میں بہت نام پیدا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں گورنمنٹ کالج کو علم و ادب کا مرکز بنانے اور اس ادارے سے ملک گیر شہرت کے حامل شعرا اور ادباء پیدا کرنے میں صوفی صاحب کی کوششوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے اُردو اور ادیب فاضل کی کلاسوں کے اجراء میں بھی ان کی خصوصی دلچسپی اور کوشش کو بہت دخل ہے۔

صوفی تبسم پچپن سال کی عمر میں ۳۔اگست ۱۹۸۴ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہوئے۔ اسی زمانے میں حکومتِ ایران نے فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کی خاطر پاکستان کے مختلف شہروں میں اپنے مراکز قائم کیے۔صوفی صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ چنانچہ لاہور میں خانۂ فرہنگ ایران کا نظم ونسق چلانے کے لیے ان کو اس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔اسے صوفی تبسم کا قابلِ فخر امتیازیوں بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے دیگر مقامات پر ان اداروں کے ڈائریکٹر ایرانی تھے۔لیکن لاہور میں یہ اعزاز ایک پاکستانی کو بخشا گیا۔ پہلے دو سال وہ بطور ڈائریکٹر کام کرتے رہے اور نومبر ۱۹۵۸ء سے وہ یہاں معلم مقرر کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں صوفی تبسم سول سروس اکیڈمی اور فنانس سروس اکیڈمی لاہور میں بھی ان اکیڈمیوں کے طلبہ کو اُردو پڑھاتے تھے۔مئی ۱۹۲۱ء میں وہ خانہ فرہنگ ایران کی ملازمت سے الگ ہوگئے۔

صوفی تبسم اپنی علمی و ادبی خدمات کے عوض مارچ ۱۹۶۲ء میں پرگرایسو پیپر لمیٹڈ کے ہفت روزہ رسالے ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ وہ دو سال تک اسی رسالے کے مدیر رہے اور اس دوران ہر شمارے میں وہ بعنوان ''حرف و سخن'' باقاعدگی کے ساتھ لکھتے تھے۔ علاوہ ازیں تحقیقی وتنقیدی مضامین اور بچوں کے لیے ان کی متعدد کہانیاں اور نظمیں بھی اس میں شائع ہوئیں۔ اپنی ادارت کے دور میں صوفی صاحب نے لیل و نہار کی صوری ومعنوی خوبیوں میں اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ تاہم ۱۹۶۴ء میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر رسالہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

لاہور میں ریڈیو سٹیشن کا قیام ۱۹۳۷ء میں عمل میں آیا مگر صوفی صاحب اس سے پہلے بھی ریڈیو کے لیے مختلف پروگرام لکھتے چلے آ رہے تھے۔ لاہور میں ریڈیو سٹیشن کے قیام تک صوفی تبسم اور ان کے چند دیگر رفقاء جن میں پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، سید عابد علی عابد وغیرہ نمایاں ہیں، انہی علمی و ادبی شہرت کے اعتبار سے معروف ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے لاہور ریڈیو سٹیشن پر اپنے مختلف پروگرام بڑی باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ پیش کیے۔ مذکورہ بالا ادیبوں اور شعراء نے اپنی شبانہ روز محنت سے ریڈیو کے لیے مختلف پروگرام لکھے۔ چنانچہ ایک طرف تو ریڈیو نے ان ادیبوں کے لیے ان کی ادبی کوششوں کے مواقع فراہم کیے جبکہ دوسری طرف ریڈیو کا ایک اچھا خاصا ادب پیدا ہوا اور ریڈیائی ادب کی ایک روایت نے جنم لیا۔

صوفی تبسم کی ریڈیو ملازمت کے دوران ہی ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ کے

دوران صوفی تبسم کا قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش کارنامہ ان کے وہ پُراثر ، ولولہ انگیز پنجابی گیت ہیں جنھوں نے عوام اور خواص کے قلوب کو گرما کے رکھ دیا۔ اس جنگ کے دوران ہر محبّ وطن شہری کے جذبات کو صوفی تبسم نے الفاظ اور ملک کی مشہور گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں نے آواز کا روپ بخشا۔

۱۹۷۰ء میں ریڈیو پاکستان لاہور کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد صوفی تبسم ۱۹۷۰ء-۱۹۷۲ء کے دوران پنجاب یونیورسٹی اور ینٹل کالج لاہور میں ایم۔ اے پنجابی کی سب سے پہلی کلاس کو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں وہ فیملی پلاننگ کے ماہانہ رسالے ''سکھی گھر'' کے اعزازی مدیر بنا دیے گئے اور اسی سال وہ کچھ مدت کے لیے امریکہ چلے گئے۔ جہاں سے واپس آنے کے بعد وہ تقریباً دو سالوں تک پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کے ماہنامہ ''اطفال'' کے نگران کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ حکومتِ پنجاب کے ایک فیصلے کے تحت پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے صدر بنا دیے گئے اور تادم آخر وہ اس عہدے پر فائز رہے۔

اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر کے عہدے پر ان کا تقرر محکمۂ تعلیم کی طرف سے ۱۹۶۷ء میں ہوا اور آخری دم تک وہ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ اس عہدے پر ان کا تقرر اقبالیات کے میدان میں ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف کے طور پر تھا۔ اکادمی کے آئین کی رو سے وہ اس کی مجلس منتظمہ کے صدر بھی تھے اور اکادمی کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر بھی تھے۔

صوفی تبسم اپنی طویل ادبی زندگی کے دوران مختلف رسائل کے مدیر و نگران رہے۔ ان کی مدیرانہ مصروفیات کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوا اور آخری دم تک جاری رہا۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے مشہور ادارہ میگزین ''مخزن'' کے دور جدید میں جناب حفیظ جالندھری کے ساتھ مل کر اس رسالے میں بطور مدیر اعزازی کام کرنا شروع کیا۔ اس سے پیشتر ۱۹۲۴ء میں جب رسالہ ''نیرنگ خیال'' کا اجراء ہوا تو صوفی صاحب اگرچہ اس کی ادارت میں شامل نہیں تھے۔ مگر انھوں نے ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ مل کر حکیم یوسف حسن کی مدد کی اور آغاز میں اس رسالے کی کامیابی کے لیے بہت کوشش کی۔ دو سال بعد آپ رسالہ ''مخزن'' کی ادارت سے الگ ہوگئے اور ۱۹۳۲ء کے قریب امتِ مسلمہ امرتسر کے ماہوار دینی رسالے ''بلاغ'' میں اعزازی مدیر رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔ ۱۹۴۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' کے تتمہ کے طور پر شائع ہونے والے میگزین ''دوست'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جس کا مقصد تعلیم بالغاں کو فروغ دینا تھا۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں وہ ماہنامہ ''پنجابی ادب'' کے نگران مقرر

ہوئے اور ۱۹۷۱ء تک رہے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں وہ امتیاز علی تاج کے رسالے ''پھول'' کی مجلس مشاورت میں شریک ہوئے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں وہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے بچوں کے رسالے ماہنامہ ''اطفال'' کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۶ء تک مدیر رہے۔

۵۔ فروری ۱۹۷۸ء کو وہ پاکستان ٹیلی ویژن پر علامہ اقبال کے لیے ایک پروگرام کے سلسلے میں لاہور سے پنڈی روانہ ہوئے۔ ۶۔ فروری کو پروگرام ریکارڈ کرایا اور ۷۔ فروری کی صبح کو وہ بذریعہ ریل کار راولپنڈی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ راولپنڈی سے لاہور تک تقریباً پانچ گھنٹے کا یہ سفر بالکل ٹھیک ٹھاک گزرا۔ اور دورانِ سفر اپنے ایک بہت پُرانے شاگرد جناب محمد صادق راجپوت کے ساتھ تمام وقت لطیفہ گوئی اور خوش گپیوں میں گزرا۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ریل کار پہنچی، اپنے شاگرد کی مدد سے اپنا سامان اُٹھا کر وہ تیز تیز سٹیشن سے باہر نکل رہے تھے کہ سیڑھیوں پر ہی دل کا شدید دورہ پڑا اور اسی لمحے دن کے ڈیڑھ بجے جناب صادق راجپوت کے ہاتھوں میں ہی جان آخرین کے سپرد کر دی اور یوں ۷۔ فروری ۱۹۷۸ء یہ ہستی ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ دوسرے دن ۸۔ فروری کو نمازہ جنازہ میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی اور لاتعداد سوگواروں کی موجودگی میں میانی صاحب قبرستان میں دفن کیے گئے۔ صوفی تبسم نے تقریباً ۷۹ سال عمر پائی اور اس دوران وہ کچھ عرصہ امرتسر اور زیادہ مدت لاہور میں مقیم رہے۔

تصانیف:

صوفی تبسم نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے مضامین اور کلام کالج میگزین کے ساتھ ساتھ ملک کے باوجود علمی جرائد مثلاً مخزن، نیرنگ خیال وغیرہ میں شائع ہونا شروع ہوگئے۔ انھوں نے تاریخ اسلام، تصوف، تحقیق، تنقید، شعر، اصناف، ڈرامہ، سوانح، اقبالیات وشرح، ترجمہ، مقالہ اور دیباچہ غرض کہ ادب کی کئی اصناف میں لکھا۔ ان کی ادبی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۳۲ اور نصابی کتب کی تعداد ۴۰ ہے۔ دونوں کو ملا کر ۷۲ کتابیں بنتی ہیں۔

تخلیقات:

۱۔ انجمن (مجموعہ کلام فارسی، اُردو، پنجابی)

۲۔ پنجاب کی شاعری پہ فارسی روایات کا اثر (اُردو)

۳۔ ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں (اُردو)

۴۔ ٹول مٹول (اُردو)

۵۔ جھولنے (اُردو)

۶۔ دامنِ دل (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)

۷۔ سرشکِ تبسم (نعتوں، نظموں، گیتوں اور ملی ترانوں کا مجموعہ)

۸۔ کلیاتِ صوفی تبسم (بچوں کے لیے)

۹۔ نظراں کر دیاں گلاں (پنجابی کلام)

۱۰۔ کلیاتِ صوفی تبسم

۱۱۔ علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں -- کچھ یادیں

۱۲۔ کلیاتِ صوفی تبسم (فارسی، اُردو، پنجابی)

تراجم:

۱۳۔ جاہ جلال (اُردو)

۱۴۔ حکمتِ قرآن (اُردو)

۱۵۔ دو گونہ (فارسی، اُردو)

۱۶۔ دوٹانک: ساون رین دا شفنا، خطرناک لوک (پنجابی)

۱۷۔ سرپردہ افلاک (فارسی، اُردو)

۱۸۔ علامہ اقبال (اُردو)

۱۹۔ مسلمانوں کا علمِ جغرافیہ اور شوقِ سیاحت (اُردو)

۲۰۔ نقشِ اقبال (فارسی، پنجابی)

شرحیں:

۲۱۔ روحِ غالب (اُردو، فارسی)

۲۲۔ شرح صد شعرِ اقبال (اُردو)

۲۳۔ شرح غزلیاتِ غالب فارسی جلد اوّل و دوم (اُردو)

۲۴۔ صد شعرِ اقبال (فارسی)

تالیفات:

۲۵۔ اقبال اور بچے (اُردو)

۲۶۔ انتخاب کلام اقبال (اُردو، فارسی)

۲۷۔ انتخابِ کلام امیر خسرو طوطی شکر قصال (فارسی)

۲۸۔ تیر و نشتر (اُردو، فارسی)

۲۹۔ حروف صوت (اُردو، فارسی)

۳۰۔ زندہ نغمے (اُردو، فارسی)

۳۱۔ شعر فارسی معاصر (فارسی، اُردو)

۳۲۔ کلیاتِ طغرائی (اُردو، فارسی)

۳۳۔ یک ہزار و یک سخن (فارسی، اُردو)

نصابی کتب:

صوفی صاحب نے پہلی جماعت کے قاعدے سے لے کر ایف۔ اے کی سطح تک اُردو فارسی کی متعدد درسی کتب تصنیف و تالیف کیں۔ یہ کتب سال ہا سال تک صوبہ پنجاب، سرحد، فیڈرل ایریا، کراچی اور آزاد کشمیر میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ان نصابی کتب میں صوفی تبسم کی مصنفہ کتب کی تعداد ۲۳ اور مؤلفہ کتب کی تعداد ۹ ہے۔ علاوہ ازیں وہ پانچ (۵) کتابوں کے مدیر اور تین (۳) کے ناظم ترتیب و طباعت بھی رہے۔

صوفی تبسم کی اُردو شاعری کا آغاز تقریباً بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا۔ اُردو غزل کی جس روایت کے سائے میں صوفی تبسم کا شعری و ادبی شعور پروان چڑھا وہ غزل کی کلاسیکی روایت تھی جس کے نمائندہ شعراء میں میر، سودا، آتش، ذوق، غالب، مومن اور داغ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک شاعر نے اپنے مخصوص طرزِ فکر اور مروجہ سیاسی و سماجی حالات کے تحت مضامین غزل میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کیا۔

صوفی تبسم کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور آغاز سے ۱۹۳۰ء تک ہے۔ دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک ہے اور تیسرا اور آخری دور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۸ء تک محیط ہے۔ صوفی تبسم کی شاعری سیاسی

و سماجی اور ادبی موضوعات پر مشتمل ہے۔ لیکن یہاں ہم اُن کی بچوں کے لیے کی گئی شاعری کا جائزہ لیں گے کہ انھوں نے بچوں کے حوالے سے کس طرح کی شاعری کی ہے۔

صوفی تبسم کی بچوں کی شاعری کے آغاز سے پیشتر اُردو میں اس کی ایک مستحکم روایت قائم ہو چکی تھی۔ محققین نے اُردو میں بچوں کے ادب کا سراغ نویں صدی ہجری سے لگایا ہے اور تیرھویں صدی ہجری کے دو شاعروں نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب کو بچوں کے ادب کا روشن مینار ثابت کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو ادب کے علاوہ ادبِ اطفال میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر بیسویں صدی تک بچوں کے شعری ادب میں محمد حسین آزاؔد، مولانا حالؔی اور مولوی اسماعیل میرٹھی قابلِ ذکر نام شمار کیے جاتے ہیں۔ ان تینوں میں سے ہر شاعر نے منفرد انداز میں بچوں کی شاعری کو آگے بڑھایا۔ محمد حسین آزاؔد نے بچوں کے لیے ریڈریں تیار کیں۔ پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب اپنی نوعیت کی منفرد درسی کتب تھیں جو آزاد نے بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کیں اور ان میں بچوں کی دلچسپی کا عنصر قائم رکھا۔

مولانا حالی نے بچوں کے لیے اخلاقی اور مذہبی موضوعات مثلاً خُدا کی شان، بڑوں کا حکم مانو جیسے موضوعات پر نظمیں لکھیں اور بچوں کے اخلاق و کردار کی تربیت کرنا چاہی۔ آزاد اور حالی کے ہم عصر شاعر مولوی اسماعیل میرٹھی کا رتبہ بچوں کے ادب میں خاصا بلند ہے۔ مولوی صاحب نے بچوں کے لیے متنوع موضوعات پر نہایت دلکش انداز میں نظمیں لکھیں جو بچوں کی نفسیات کے قریب ہیں۔ ان میں نغمگی، حسن اور سلاست بھی موجود ہے۔ بیسویں صدی میں بچوں کے لیے اقبال کی نظمیں بھی ان کے دل میں جاگزیں ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ ان نظموں میں دُعا، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک لکڑا اور مکھی، ایک گائے اور بکری، جگنو اور پرندے کی فریاد قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے بعد اور صوفی تبسم سے پچھلے بچوں کی شاعری میں اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محرؔوم، حامد اللہ افسر اور چند دیگر شعراء نے بھی بچوں کے لیے مقبول نظمیں لکھیں۔

صوفی تبسم اپنی فارسی اور اُردو شاعری کے طویل عرصے بعد بچوں کی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ بچوں کی شاعری کی طرف توجہ کے ایک فوری محرک کا ذکر خود بچوں کی شاعری کی زبانی سُنیے:

> ''ہوا یہ کہ میں بھائیوں کے میدان (لاہور) میں رہتا تھا۔ پُرانے زمانے میں گھر میں جو بڑی اماں ہوتی تھیں تو بچے ان کے گرد بیٹھ جاتے تھے اور کہتے تھے کہانی سناؤ

.... یہاں لاہور میں ہمارے ہاں کوئی نہ تھا۔ میری والدہ اور پھوپھیاں وغیرہ امرتسر میں رہتی تھیں۔ بچوں نے جو ہوش سنبھالا تو تنگ کرنا شروع کیا کہ ہمیں کہانی سناؤ۔ دو چار دن مجھے بہت تنگ کرتے رہے۔ چنانچہ ایک دو کہانیاں جو میں نے اپنی اماں سے سُنی تھیں وہ میں نے اُنھیں سُنا دیں اور وہ ختم ہوگئیں۔ آخر تنگ آ کے میں نے کہا کہ بھئی کوئی شعر کہو تو سُنا سکتا ہوں۔ کہانی نہیں سُنا سکتا تو بچوں نے کہا کہ وہی سُنائیں۔ چنانچہ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی بیٹی ثریا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر کہے:

ثریا کی گڑیا نہانے لگی
نہانے لگی ڈوب جانے لگی
بڑی مشکلوں سے بچایا اُسے
کنارے پہ میں کھینچ لایا اُسے

اس کے دو چھوٹے بھائی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ نظم سنتے ہی ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ انھوں نے تالی بجائی اور خوش خوش لوٹ گئے۔‘‘(۲)

بچوں کی شاعری کی طرف صوفی تبسم کی توجہ مبذول کرانے میں یقینی طور پر ان کے اپنے بچوں کی طفلانہ ضد کو دخل ہے۔ مگر اس ضمن میں صوفی تبسم کے مزاج میں بچوں سے بے پناہ محبت کے فطری جذبے کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور اسے بھی ایک قوی محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو میں ادبِ اطفال کی روایت اور انگریزی ادب کے مطالعے نے بھی انھیں بچوں کے ادب کی طرف راغب کیا۔

بچوں کے لیے صوفی تبسم کی پہلی کتاب ’’جھو لنے‘‘ ۱۹۴۸ء اور دوسری کتاب ’’ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں‘‘ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ بچوں کے لیے ان کی یہ دونوں کتاب انعام یافتہ ہیں۔

صوفی تبسم کی بچوں کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل اس بات کا علم بھی ضروری ہے کہ بچوں کی نفسیات کیا ہے اور اس نفسیات کی روشنی میں بچوں کے لیے کس طرح کی شاعری تخلیق کرنی چاہیے۔

بچوں کی نفسیات بلحاظ عمر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بچے کی عمر کے پہلے شعوری دور کو چار سے سات یا اس

سے لگ بھگ عمر پر محیط بتایا گیا ہے۔ صوفی تبسم کے مخاطب بچوں کا تعلق بھی زیادہ تر عمر کے اسی حصے سے ہے۔ بچپن کے اس ابتدائی حصے میں بچوں کو عموماً موسیقی ، کھانے پینے کی چیزوں، مختلف رنگوں والی اشیاء، سادہ قسم کی کہانیاں، عام طور پر نظر آنے والے جانور مثلاً بلی، چوہے، کتاب ، گھریلو پرندے، گڑیا، کھلونے اور زور شور سے چلنے والی گاڑیاں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ ہر نئی اور عجیب شے کو دیکھنا اور پرکھنا ماہرینِ نفسیات کے نزدیک اس عمر کے بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ حیرت افزاء عناصر انھیں جن بھی چیزوں میں نظر آئیں وہ ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت شاعر یا ادیب کو ان کی دلچسپیوں کو مدنظر رکھنا چاہیے ۔ کہا جاتا ہے کہ بچے اپنے پسندیدہ ادب کا فیصلہ خود کرتے ہیں۔

بچوں کے شاعر کی حیثیت سے صوفی تبسم اپنے پیشرو اور ہم عصر شعراء میں ایک ممتاز مقام کے حاصل ہیں۔ موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے بچوں کے لیے ان کی شاعری پُرکش اور دلفریب ہے۔ ان کی نظموں کا بیشتر حصہ مزاحیہ ہے۔ مزاح و زندہ دلی کے اعتبار سے خود صوفی تبسم کی شخصیت ان کی نظموں میں بڑی حد تک جلوہ گر ہے۔ جو اس فن کے ساتھ ان کے بھرپور فنی خلوص کی مظہر ہے۔ شوخ و شریر اور نٹ کھٹ بچے صوفی صاحب کو پسند تھے اور اپنی نظموں میں ان بچوں کے لیے انھوں نے بھرپور ذہنی تفریح مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔

صوفی تبسم نے بچوں کے لیے ہنسی مزاح پر مبنی جو نظمیں تخلیق کی ہیں۔ بچے انھیں پڑھ کر مسکراتے اور خوش ہوتے ہیں اور ان کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ اپنی نظموں میں اس طرح کا مزاح انھوں نے زیادہ تر الفاظ اور کہیں کہیں واقعات کی مدد سے پیدا کیا ہے۔ بچوں کے ذوقِ مزاح کو تحریک دینے کی ضرورت صوفی تبسم کو کیوں پیش آئی اور اس کے لیے انھوں نے کس چیز کو بنیاد بنایا؟ ان سوالات کو صوفی تبسم کی بچوں کی شاعری کے بارے میں بنیادی اور اہم سوالات قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ گزشتہ سطور میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ ان کی نظموں کا بیشتر حصہ مزاحیہ ہے اور یہ کہ صوفی صاحب ان نظموں کے ذریعے بچوں کو بھرپور ذہنی تفریح مہیا کرنا چاہتے تھے۔

انگریزی شاعری میں نرسری رائمز (Nursery Rhymes) قدیم عرصے سے رائج اور مقبول ہیں اور تقریباً ہر انگریزی دان بچے میں ان نظموں کی بے پناہ مقبولیت سے آگاہ ہے۔ صوفی تبسم نے بھی آغاز میں بے شک اپنے بچوں کی فرمائش پر نظمیں لکھنا شروع کیں۔ مگر ''جھولنے'' کی بیشتر نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے

کہ انھوں نے نرسری رائمز کی شہرت و مقبولیت اور بچوں میں ان انگریزی نظموں کی گہری دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسے ہی تجربات اُردو نظموں میں کیے اور بلاشبہ "جھولنے" کا شاعر اس میں خاصا کامیاب رہا۔ نرسری رائمز میں نان سنس پوئٹری (Non-Sense Poetry) اور آنوماٹو پائیا (Onomato Poeia) کے نمونوں کو بھی صوفی تبسم نے اُردو نظموں میں کامیابی سے اپنایا۔

ذیل میں نرسری رائمز اور صوفی تبسم کی نظموں میں سے ایک دو مثالیں درج کی جاتی ہیں جن میں اندازِ بیان اور فنی ڈھانچے کے اعتبار سے قریبی مماثلت موجود ہے۔

"One, two, three, four, five
Once I caught a fish alive
Six, Seven, eight, nine, ten
I let it go again

ایک ، دو ، تین، چار
آؤ مل کر بیٹھیں یار
پانچ، چھ، سات
سنو ہماری بات
آٹھ، نو، دس
بات ہماری بس" (۳)

ذیل میں ایک انگریزی نظم کا ترجمہ صوفی تبسم نے اُردو نظم میں کہا:

"Hickory, dickory, doct
The mouse ran up the clock
The clock struck one
The mouse was gone
Hickory, dickory, dock

چیچوں، چیچوں چاچا
گھڑی پہ چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا
چوہا نیچے آیا‘‘(۴)

صوفی تبسم مختلف الفاظ اور واقعات کی مدد سے اپنی نظموں میں مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اس سے بچوں میں حیرت و استعجاب اور ان کا تجسس بڑھتا ہے۔ ان واقعات کا بے ہنگم انداز بچوں کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ چنانچہ صوفی تبسم نے نرسری رائمز میں موجود نان سنس پوئٹری (Non-Sense Poetry) کے عناصر کو اُردو نظموں میں سمونے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں صوفی تبسم کی چند نظمیں ملاحظہ ہوں:

’’ایک نرالا شہر شہر کے اندر نہر
نہر کے بیچ میں آگ آگ میں کالا ناگ
ناگ کے اوپر پیڑ پیڑ کے نیچے بھیڑ
بھیڑ کے سر پر مور مور مچائے شور

☆☆☆

چمچہ لمبا تھالی گول بندرے لے کر آیا ڈھول
پیڑ پہ ناچا کالا ناگ چوہا گاتا آیا راگ
چاند پہ جا کر کودا شیر بلی کھا گئی سارے بیر
چمچہ تھالی لے گیا ساتھ منارہ گیا خالی ہاتھ‘‘(۵)

مذکورہ بالا طریقوں سے جس طرح صوفی تبسم نے بچوں کے ذوقِ مزاح کو تحریک دینے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کا اعزاز جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

’’لیکن اس میں سب سے زیادہ کامیابی ’’جھولنے‘‘ کے خالق صوفی تبسم کو نصیب ہوئی۔ بچوں کے ذوقِ مزاح کو تحریک دینے اور انھیں ناہمواریوں کا احساس دلانے میں صوفی صاحب کی کامیابی کا اندازہ اس ایک نمونے سے ہوسکتا ہے: ’ایک تھا لڑکا

ٹوٹ بٹوٹ' صوفی صاحب نے اس طرح 'نہر میں آگ'، 'دونوں شیر' اور 'کالا ریچھ' میں بچوں کے لیے الفاظ اور واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور خاصے کامیاب رہے ہیں۔''(۶)

صوفی تبسم نے گونرسری رائمز سے متاثر ہوکر یہ نظمیں تحریر کیں مگر انھوں نے اپنی نظموں میں مغربی ماحول اور فضا کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔''جھولنے'' کی تمام نظمیں مشرقی نظموں میں مغربی ماحول اور فضا کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔''جھولنے'' کی تمام نظمیں مشرقی فضا اور بچوں کے گردوپیش کے ماحول سے اتنی قریب ہیں کہ کھیل تماشے اور تفریح کی یہ ساری دنیا بچوں کو ان کی اپنی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ شاعر نے ان بچوں کے لیے جو مانوس دنیا سجائی ہے اس میں کبھی خوانچے والا آواز لگاتا ہے۔ کبھی ریچھ اور بندر والا بچوں کو بُلا رہا ہے۔ کہیں گڑیا کو کہانی سُنا کر منایا جا رہا ہے اور کبھی منے کے کھانے سے کی چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

انگریزی ادب کی ایک صنف آنویاٹوپوئیا (Onomato Poeia) کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ صوفی تبسم نے اپنی نظموں میں اس کا بھی تجربہ کیا ہے اور ان نظموں میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے جن کی آواز ان کے معانی سے ہم آہنگ ہے۔ مثلاً چھم چھم، ٹم ٹم، ٹرٹر، غُوں غُوں، چوں چوں، میں میں، پھوں پھوں، ٹیں ٹیں وغیرہ۔ ایسے الفاظ کا متواتر استعمال موسیقی کے ساتھ بچوں کی طبعی مناسبت کا تقاضا بھی پورا کرتا ہے۔ وزن و آہنگ کے مفہوم سے چھوٹا بچہ آگاہ نہیں ہوتا۔ مگر صوفی تبسم نے ترنم آمیز الفاظ کی تکرار سے اس کے ذہن میں اس کا شعور پیدا کرنے کی کوششیں ضرور کی ہے اور بار ہا کامیاب بھی ہوئے۔

صوفی تبسم نے بچوں کے ذوقِ ترنم کوملحوظ رکھتے ہوئے اکثر جگہوں پر بچوں کی نفسی کیفیات سے ہم آہنگ بعض خاص حروف مثلاً ج، ن، م، س اور ش کو نسبتاً زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں نظم چچوں، دونوں شیر، ایسے کو تیسا، آؤ آؤ سیر کو جائیں اور بعض دوسری نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ بچوں کی نظموں میں بچوں کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے صوفی صاحب نے انھیں خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ نصیحت آموز باتوں کو فراموش کر گئے اور کبھی زبان کی صحت بھی متاثر ہوئی۔ چنانچہ ایسے شاعر پر کچھ اعتراضات بھی متوقع ہوتے ہیں جس کا جواب ''جھولنے'' کے دیباچہ نگار پطرس بخاری نے بڑے مدلل انداز میں دیا ہے:

''بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ چچوں چچوں چاچا۔ گھڑی پہ چوہا ناچا اور خوش ہولیے۔ بڑے کہیں گے چچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں ہے اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟ یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں یا جو تہیہ کیے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا۔ وہ اس دنیا میں اب نہ دُہرائی جائیں گی۔ تک ملانا بے فائدہ بات ہے۔ بوجھوں مارنا چاہیے۔ خُدا کا شکر ہے کہ صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ وہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب وغریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور بلیاں بیر کھاتی ہیں اور ٹرٹر موٹر چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہوکر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خُدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسان ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔''(۷)

صوفی تبسم نے اُردو زبان میں ''نرسری رائمز'' کے نہایت کامیاب تجربے کیے ہیں۔ یہ صنفِ سخن اس لحاظ سے بہت کٹھن ہے کہ اس کے لیے نہ صرف ننھے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ درکار ہوتا ہے بلکہ یہ اشعار بظاہر بے معنی ہونے کے باوجود بچوں کے لیے اپنے اندر معانی کی ایک دنیا لیے ہوتے ہیں۔ یہ بڑا ستم ہے کہ ہم سب جو اِن ادوار میں سے گزرے ہیں، اس دور کو بہت جلد بھول جاتے ہیں اور جب بچوں کے ذہنوں کی خود دمیدہ سوچوں کو خود سینچنے بیٹھتے ہیں تو بڑوں کا اب کرو، جھوٹ مت بولو، آج کا کام کل پر مت چھوڑو کے سوا انھیں کچھ دے ہی نہیں سکتے۔ جب صوفی تبسم کہتے ہیں ''نہر میں اک دن لگ گئی آگ' ...... تو بعض لوگ کہیں گے یہ کیا بات ہوئی؟ لیکن یہ کہنے والے ذرا اپنے بچوں سے بھی پوچھ دیکھیں، یہ الفاظ سُن کر ان کی آنکھوں میں ایک

پیاری چمک پیدا ہوگی اور وہ ہنسی ضبط نہیں کرسکیں گے۔ وہ کس بات پر ہنسیں گے، یہ سوال صرف وہی پوچھ سکتے ہیں جو بچپن کے بعد سیدھے مستقبل پیوست کے دور میں داخل ہو سکتے ہیں۔

بچوں کی شاعری میں صوفی تبسم کا ایک ناقابلِ فراموش اور منفرد کارنامہ ٹوٹ بٹوٹ کے کردار کی تخلیق ہے۔ جسے بچوں کی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ بچوں کی شاعری میں ایسے مقبول ترین کردار کی بدولت جس قدر شہرت ومقبولیت صوفی تبسم کو حاصل ہوئی۔ بچوں کی شاعری کی تاریخ میں ایسی شہرت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔صوفی تبسم نے اپنے نظموں میں اس کردار کو مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے اور ایک طرح سے بچوں کی دنیا اسی کردار کے مختلف پہلوؤں کے گرد گھومتی ہے اور بقول جناب احمد ندیم قاسمی، صوفی تبسم نے ٹوٹ بٹوٹ کی تخلیق کرکے اسے بچوں کی دنیا کا ایک زندہ کردار بنا دیا ہے۔ٹوٹ بٹوٹ بچوں کا محبوب ترین کردار ہے اور بہت دلچسپ کردار ہے۔ بچے نفسیاتی طور پر خود ٹوٹ بٹوٹ بن جاتے ہیں یا اپنے کسی ساتھی کو ٹوٹ بٹوٹ کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ کا عنوان ہی اپنے اندر گنجائش لیے ہوئے ہے کہ یہ کوئی تخیلی لڑکا نہیں، حقیقی لڑکا ہے۔صوفی تبسم نے ٹوٹ بٹوٹ کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے اور اس کا ہر انداز بڑا دلچسپ اور نرالا ہے اور بچے اس انداز میں فطرتاً بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

صوفی تبسم نے چھوٹے بچوں کے لیے تفریحی اور مزاحیہ رنگ سے ہٹ کر سنجیدہ موضوعات پر بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں جو ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لیے ہیں اور ان کے مجموعے ''ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں'' بھی شامل ہیں۔ان میں بامقصد نظموں کے علاوہ نعتیں اور حمدیں بھی موجود ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں:

میرا خُدا، تو زمین آسمان کا مالک، اپنا راج، اقبال کا خواب، قائدِاعظم، ہمارا دیس، آیا بسنت میلہ نظموں کے موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی صاحب بچوں کو اسلاف اور ان کے کارناموں سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

چھوٹے بچوں کے لیے صوفی تبسم کی نظموں کی ایک فنی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحریں مختصر ہیں اور نظمیں بھی اتنی چھوٹی ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی یہ نظمیں آسانی کے ساتھ یاد کرسکتا ہے۔ متعدد مختصر نظموں میں سے ایک نظم بطور مثال پیش کی جاتی ہے:

عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے
گھنٹی بجاؤ اس کو جگاؤ

تو یہ ہے میری میں نہ جگاؤں
وہ رو پڑے گی مجھ سے لڑے گی

بچوں کی نظموں میں موزوں الفاظ اور پُرکشش انداز بیان بچوں کے دیدہ دل کو محصور کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔صوفی تبسم کی بچوں کی شاعری کی تمام لغت پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تو بچوں کی عمر کے مطابق ان کے ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور دوسرے وہ اپنی بناوٹ اور ترنم کے اعتبار سے بچوں کو بے حد مانوس معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صوفی تبسم اس حوالے سے بچوں میں شاعرانہ ذوق کی تربیت میں مصروف رہے۔صوفی تبسم نے ان نظموں میں ہیئت کے بندھے ٹکے اُصولوں کی پیروی کی بجائے بعض دفعہ نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ اب صوفی تبسم کی نظموں کا بچوں کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا کہ ان کے ذریعے سے کس کو کس انداز میں اور کیا کچھ سکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب: صوفی تبسم کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا فکری تنقیدی و تحقیقی تجزیاتی مطالعہ

''ٹوٹ بٹوٹ'' صوفی تبسم کی نظموں کا ایک مقبول ترین کردار ہے۔'ٹوٹ بٹوٹ' کی پہلی نظم ''ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ'' بچوں کی نظموں کے پہلے مجموعے 'جھولنے' میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ان نظموں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں سے بعض نظمیں رسالوں میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں اور بچوں کی زبان پر آ گئیں۔ جن کا بہت چرچا ہوا ہے۔ بچے بڑی بے تابی سے نظموں کے شائع ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ یہ بے تابی صرف بچوں تک محدود نہ تھی۔ والدین بھی ان نظموں کی طباعت کی تلاش میں رہتے تھے۔

صوفی تبسم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک روز میں مال روڈ کے فٹ پاتھ پر جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، ایک ننھا سا بچہ کہہ رہا تھا:امی وہ ٹوٹ بٹوٹ جا رہا ہے۔ اس کی امی نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی ۔لیکن بچہ پھر بڑے شوق سے چلایا۔نہیں امی! آپ نے دیکھا نہیں، وہ ٹوٹ بٹوٹ ہی ہے۔ میں چلتے چلتے رُک گیا، بچے سے ملا، اسے پیار کیا۔ وہ بے حد خوش ہوا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ اُسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔''(۸)

لیکن یہ ایک بچے کی بات نہیں ہے۔ بلکہ سب بچوں کو ٹوٹ بٹوٹ کی تلاش ہے کہ آخر یہ ٹوٹ بٹوٹ ہے کون؟ لیکن اب ٹوٹ بٹوٹ کوئی فرضی کردار نہیں رہا۔ بلکہ اب یہ بچوں کی دنیا کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ بچے اس سے ملتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ اس کردار کو اپنے اردگرد کسی نہ کسی دوست، بہن بھائی میں تلاش کر لیتے ہیں۔ صوفی تبسم نے ٹوٹ بٹوٹ کو مختلف کرداروں میں پیش کیا ہے اور یہ کردار اپنے آپ میں نرالا اور زندگی سے بھرپور ہے اور بچے ہر کردار کو کہیں نہ کہیں خود سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اب یہاں ٹوٹ بٹوٹ سے متعلق تمام نظموں کا جائزہ لیا جائے گا اور ان نظموں سے بچوں کو کیا پیغام پہنچایا ہے، یہ دیکھا جائے گا۔

'ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے' ہماری پہلی نظم ہے۔ جس میں ٹوٹ بٹوٹ کے دو مرغوں کا ذکر ہے۔ گیٹو اور گٹار ان کے نام ہیں۔

"ٹوٹ بٹوٹ کے دو مرغے تھے دونوں تھے ہشیار
اِک مرغے کا نام تھا گیٹو اِک کا نام گٹار" (۹)

دونوں مرغے اپنی اپنی عادات اور خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اک کی دم کالی اور دوسرے کی لال ہے۔ ایک چلنے میں نرالا ہے اور ایک کی چونچ خوبصورت ہے۔ اسی طرح دونوں لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف پہنتے ہیں۔ ایک مرغا انگریزی لباس کا شوقین ہے تو دوسرا مشرقی لباس زیب تن کرتا ہے۔ انگریزی لباس میں پتلون، نیکر، شرٹ، ٹائی اور ٹوپی آ جاتے ہیں۔ جو کہ پہلے وقتوں میں بھی اور آج بھی کافی مشہور ہے اور مشرقی لوگ بھی اسے بہت شوق سے پہنتے ہیں۔ یا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انگریزی لباس پہننے والے خود کو بڑا پڑھا لکھا اور معزز سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں اور یوں وہ اپنے لباس اور اپنی روایات سے بھی دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب لباس انگریزی ہوگا تو کھانا پینا بھی انگریزی ہوگا۔ دال، روٹی کی جگہ کیک اور بسکٹ کو زیادہ پسند کیا جائے گا۔ دوسری طرف مشرقی لباس کی بات کی جائے تو وہ شلوار، قمیض اور دستار پر مشتمل ہے اور جو نہ صرف اپنی تہذیب اور روایات کی نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ سادگی کے ساتھ ساتھ آرام دہ بھی ہے۔ لیکن آج کل مشرقی لوگ ہی اس مشرقی لباس سے دور بھاگتے ہیں اور اس پر انگریزی لباس اور روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی ترقی یافتہ اور پڑھی لکھی قوم کو دیکھ لیں۔ وہ اپنی روایات، تہذیب اور لباس کو کبھی نہیں بھولتے اور اِسی میں اُن کی ترقی کا بھی راز ہے کہ وہ آج تک اپنی جڑوں سے جُڑے ہوئے ہیں۔

دونوں مرغے ایک دن چار آنے یعنی کچھ رقم لے کر شہر گھومتے پھرنے کے ارادے سے جاتے ہیں۔ پہلے ادھر اُدھر گھومتے ہیں۔ پھر دونوں کھانا کھانے ہوٹل میں جاتے ہیں۔ چونکہ دونوں مرغوں کے مزاج مختلف ہیں اس لیے کھانے پینے میں بھی وہ مختلف پسند اور ناپسندیدگی رکھتے ہیں جو مرغا مغربی روایات کا دلدادہ ہے۔ اس نے انڈے اور سوڈا واٹر سے پیٹ بھرا اور دوسرا مرغا جو کہ مشرقی رہن سہن اپناتا ہے اُس نے پائے اور چائے پی۔ انسان ہو یا جانور جیسے ہی اُس کے پیٹ میں کچھ جاتا ہے، اُس کو ہوش آ جاتا ہے۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی حس تیز ہو جاتی ہے۔ مرغوں کا بھی یہی حال ہے کہ کھانے بعد دونوں خوب اُچھلے کودے اور جوش میں آ گئے۔ باتوں باتوں میں دونوں کی ہاتھا پائی ہوگئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب مارا پیٹا۔

اِک مرغے نے تیغ اُٹھائی — اِک مرغے نے ڈانگ
اِک کے دونوں پنجے ٹوٹے — اِک کی ٹوٹی ٹانگ
تھانے دار نے ہنٹر مارا — چیخے چوں چوں چوں
ٹوٹ بٹوٹ نے گلے لگایا — بولے گکڑوں گوں'' (۱۰)

دونوں مرغوں نے دل کھول کر ایک دوسرے کو مارا پیٹا اور دونوں نے اس میں نقصان اُٹھایا۔ ایک مرغے کے پنجے ٹوٹے اور ایک کی ٹانگ ہی ٹوٹ گئی۔ لڑائی جھگڑے میں ہمیشہ دونوں طرف نقصان ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہی کہا جاتا ہے کہ لڑنے جھگڑنے سے بچو کیونکہ اس میں کسی کا فائدہ نہیں ہے۔ نرا نقصان ہی نقصان ہے اور جہاں لڑائی ہوگی وہاں پولیس تو آئے گی۔ کیونکہ ایک تو لوگ اسی صورت میں لڑائی چھوڑتے ہیں۔ جب اُنھیں پولیس کا اور قانون کا خوف ہو۔ دوسرے یہ پولیس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات اور لڑائی جھگڑوں کو حل کرے۔ اس سے نہ صرف پولیس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پولیس کے معاملوں میں پڑنے سے بچنے کے لیے اور پولیس کی مار سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ لڑائی سے جس قدر ہو سکے بچا جائے۔ کیونکہ جب پولیس کا ڈنڈا پڑتا ہے تو ہر کوئی بندہ بن جاتا ہے۔ اس طرح ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے بھی پولیس کے ہنٹر پر چیخے اور پھر ٹوٹ بٹوٹ کے پاس چلے گئے اور لڑائی سے توبہ کی۔

صوفی تبسم نے اس نظم میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں، جیسے ٹھی، ٹھوں، ہی، ہوں، جوں یہ ایسے الفاظ ہیں کہ نفسیات کے مطابق گو کہ یہ لفظ اپنے کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ یہ آوازیں ہیں اور بچے ایسی آوازیں نکالتے اور

پسند کرتے ہیں۔ نیز ایک تو یہ الفاظ بچوں کو بہت جلد متاثر کرتے ہیں ۔ دوسرے بچے انھیں جلدی یاد بھی کر لیتے ہیں اور ویسے بھی بچوں کے ذہن کے مطابق یہ الفاظ آسان بھی ہوتے ہیں۔

''ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار'' بھی ایک بہت خوبصورت نظم ہے۔ ردیف قافیہ بھی بہترین ہے۔ بچوں کو اپنے کھلونے بہت عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ صوفی تبسم نے اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ نظم لکھی ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

اس موٹر کی شان نرالی　　دو سیٹوں دو پہیوں والی

تین انجن اور ہارن چار　　ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار کی بے شمار خصوصیات اس نظم میں بتائی گئی ہیں کہ یہ بہت نرالی موٹر کار ہے۔ دو سیٹوں اور دو ہی پہیوں پر مشتمل ہے اور اس میں بے شمار ہارن بھی ہیں۔ یہ بہت تیز اُڑتی پھرتی ہے۔ سارا دن گھومتی رہتی ہے ۔ کوئی کہتا ہے یہ بائیسکل ہے۔ کوئی ٹرائیسکل کہتا ہے۔ اس موٹر کار کا رنگ کالا ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے۔ اس کا صرف ایک ہی سوار ہے جو کہ خود ٹوٹ بٹوٹ ہے۔ سارا دن چپ رہتی ہے جب ہارن بجتا ہے تو بولنے لگتی ہے۔

صوفی تبسم نے اپنے بہترین انداز میں ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار کی تعریف کی ہے کہ بچے اسے سُن کر فوراً دلچسپی لینے لگتے ہیں اور بچوں کے لیے ویسے بھی ایسے کھلونے جن کی آواز ہو اور خوبصورت ہوں۔ جن میں ہارن وغیرہ ہوں، بہت متاثر کن ہوتے ہیں۔

بچے جب بھی کوئی نیا کام کریں تو ان کو شاباشی کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی تو وہ کچھ بھی نیا سیکھنے میں دلچسپی نہیں لیں گے اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب بچہ کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اُس کے لیے نیا ہو تو گھر کے بڑے، آس پڑوس والے، رشتہ دار سب اُس پر تحسین کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے بچے میں مزید سیکھنے کا حوصلہ اور کچھ نیا کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ ''ٹوٹ بٹوٹ نے بین بجائی'' ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں ٹوٹ بٹوٹ جو کہ نیا نیا بین بجانا سیکھتا ہے۔ اس کی تعریف کی گئی ہے۔

''چوہے شور مچاتے آئے　　مینڈک بھی ٹراتے آئے

بلی گانا گاتی آئی　　ٹوٹ بٹوٹ نے بین بجائی

کوا کوئل مینا مور تیتر، تلیر، چیل ، چکور
سب نے مل کر دھوم مچائی ٹوٹ بٹوٹ نے بین بجائی“(۱۱)

چوہے، بلی، کوا، کوئل، مینا، مور، تیتر، تلیر، چیل، چکور یہ سب جانور اور پرندے جو کہ ٹوٹ بٹوٹ کے دوست ہیں۔ وہ سب ٹوٹ بٹوٹ کے بین بجانے پر اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔کوئی گانا گاتا ہے تو کوئی شور مچاتا ہے۔ یوں بچے اس نظم سے بہت سے جانوروں اور پرندوں سے متعارف ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی آوازوں کے بارے میں بھی جان سکتے ہیں کہ کس جانور یا پرندے کی کیا آواز اور کیا خصوصیات ہیں۔

ٹوٹ بٹوٹ کے بین بجانے پر جہاں اُس کے دوست خوش ہیں، وہیں گھر والے، ہمسائے سب خوش ہیں۔ درزی، دھوبی، نائی بھی ناچتے رہے ہیں۔ یہ سب وہ پیشے ہیں۔ جن کے بارے میں عمومی رویہ نفرت یا حقارت کا ہوتا ہے۔صوفی تبسم ان کردار وں اور پیشوں کو پیش کر کے ان کا ذکر کر کے اُن سے محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہیں کہ ان طبقات کا معاشرتی عمل میں گہرا رشتہ ہے۔ ان کے بغیر بہت سے کام ادھورے رہ جاتے ہیں کیونکہ کوئی بھی انسان سب کچھ خودنہیں کرسکتا۔ اس لیے پیشوں کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے نہ کوئی حقیر ہے اور نہ کوئی ادنیٰ ہے۔

”ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلا“ یہ نظم بہت آسان انداز میں لکھی گئی ہے اور یاد کرنے میں بھی آسان ہے۔صوفی تبسم نے ایسے نرالے انداز میں ٹوٹ بٹوٹ کے بنگلے کا ذکر کیا ہے کہ کیا کہنے۔ دومصرعوں سے شروع ہونے والی نظم دس مصروں پر جا کر ختم ہوتی ہے۔

”اس گھر کے باہر جنگلا ہے یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلا ہے
یہ انڈے ہیں
یہ انڈے گھر میں رکھے تھے اس گھر کے باہر جنگلا ہے
یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلا ہے
یہ چوہا ہے
چوہے نے انڈے چکھے تھے یہ انڈے گھر میں رکھے تھے
اس گھر کے باہر جنگلا ہے یہ ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلا ہے“(۱۲)

جس طرح بچے اپنے گھر کی ایک ایک چیز کا ذکر کرتے ہیں اور بڑھا چڑھا کر اپنے گھر کی چھوٹی سے چھوٹی شے کی بھی خوبی بیان کرتے ہیں اور اکثر ایک ہی بات بار بار کر جاتے ہیں۔ بالکل اسی انداز میں صوفی تبسم نے یہ نظم کہی ہے۔

ہر بند کے شروع میں کسی نہ کسی شے جیسے انڈے، چوہا، بلی، لڑکی، بڑھیا اور کٹیا، جنگل، گاؤں،.............کا اضافہ کیا ہے اور اسی اضافے کو لے کر بڑے ہی خوبصورت انداز میں بات آگے بڑھائی گئی ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد یقیناً بچے بھی اپنے گھر کا نقشہ اسی خوبصورت انداز میں کھینچنے کی کوشش کریں گے۔ لفظوں اور مصروں کی تکرار جیسے جنگلا، بنگلا بچوں کو جہاں نظم یاد کرنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں، وہیں موسیقیت بھی پیدا کرتے ہیں۔

اگلی نظم ''ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی'' ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹوٹ بٹوٹ کے کھیر پکانے میں کس طرح سب نے اُس کی مدد کی۔ بچے کوئی بھی کام اکیلے نہیں کر سکتے۔ ہر کام کے لیے انھیں اپنے سے بڑوں کا تعاون اور مدد درکار ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اتفاق اور مل بانٹ کر کام کرنے میں برکت ہوتی ہے۔

''خالہ اُس کی لکڑی لائی　　پھوپھی لائی دیا سلائی
امی جان نے آگ جلائی　　ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی''(۱۳)

ٹوٹ بٹوٹ کے کھیر پکانے سب نے اس کی مدد کی۔ خالہ، پھوپھی، امی، بھائی، بہنیں، ابا، خالو سب نے اپنے اپنے حصے کی مدد فراہم کی۔ کوئی لکڑی لایا تو کوئی دیا سلائی۔ کسی نے چاول، شکر لا کر دیے تو کسی نے دودھ اور ملائی فراہم کی اور کسی نے پیسوں سے مدد کی۔ اکنی، دونی اور دہائی برصغیر کے سکے تھے۔ یوں سب کے تعاون سے کھیر تیار ہوئی۔

جیسے ہی سب کو پتہ چلا کہ کھیر پک گئی ہے۔ سب دوڑے ہوئے آئے۔ مینڈک، چوہے، بلی، کوا، طوطے، بلبل سب جانور بھی آ گئے۔ دھوبی، پنساری، حلوائی بھی آ گئے۔ لیکن چونکہ اتنے سارے لوگ کھیر کھانے ایک ساتھ آ گئے تو کھیر تو کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ البتہ لڑائی ضرور ہوگئی۔ جس طرح مل کر کام کرنے میں برکت ہے۔ اسی طرح مل بانٹ کر کھانے میں بھی برکت ہے۔ لیکن یہاں چونکہ سب نے اُدھم مچا دیا اور لڑائی ہوگئی۔ لہٰذا کھیر تو کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ قابلِ غور یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ ٹوٹ بٹوٹ کی جانوروں سے بھی بہت اچھی دوستی ہے۔

اس سے بچوں کو پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کی طرح جانور بھی پیار کے طالب ہوتے ہیں اور محبت سے انھیں بھی اپنا دوست بنایا جا سکتا ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار'' بھی بڑے مزے کی نظم ہے۔ بچوں کو لطف کے ساتھ ساتھ کھیل ہی کھیل میں حساب بھی سکھا دیتی ہے۔ صوفی تبسم کی نظموں کی یہی خوبی ہے کہ ہر نظم میں بچوں کو کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ضرور ملتا ہے جیسے اسی نظم کو دیکھیں:

''ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار   لے آیا مرغے چار

ہر مرغے کی اِک اِک مرغی

ہر مرغی کے انڈے چار''(۱۴)

اب بچے جب بھی نظم پڑھیں گے۔ ساتھ ساتھ وہ ہر چیز کو شمار کرتے جائیں گے کہ چار مرغے اور چار مرغیاں، یہ تو آٹھ ہو گئے۔ اسی طرح مزید بھی جمع کرتے جائیں گے۔ اپنے ساتھیوں سے بھی یہ سب کرنے کا کہیں گے۔ تیسرا بچے اس نظم کے ذریعے سے بازار سے واقفیت حاصل کریں گے۔ انھیں پتا چلے گا کہ بازار کیا ہے؟ یہ کیسی جگہ ہے؟ اور پھر معلوم کریں گے کہ وہاں سے کیا کیا ملتا ہے؟ بازاری اشیاء کے ناموں سے بھی آشنا ہوں گے اور یوں بہت کچھ وہ اپنی آئندہ عملی زندگی کے لیے بھی سیکھ لیں گے۔

صوفی تبسم کی زیادہ تر لفظوں میں پرندوں اور جانوروں کی انسان دوستی دکھائی گئی ہے اور ٹوٹ بٹوٹ ایسا کردار ہے جیسے بچے خود میں بھی کہیں نہ کہیں تلاش کر لیتے ہیں اور بچے دوسروں کو دیکھ کر خاص طور پر دوسرے بچوں کو دیکھ کر بھی بہت جلد بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ جب وہ ٹوٹ بٹوٹ کی اپنی بلی یا طوطے سے محبت دیکھیں گے تو یقیناً وہ بھی اپنے اردگرد موجود پرندوں اور جانوروں سے محبت کرنے لگیں گے۔ مار کی بجائے پیار سیکھیں گے۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا'' ایک ایسی ہی انسان اور پرندے کی دوستی سے متعلق ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کا اِک طوطا ہے   عمر ہے اُس کی ہفتے آٹھ

میاں مٹھو نام ہے اُس کا   سب کہتے ہیں میاں ماٹھ

واہ میاں مٹھو تیرے ٹھاٹھ''(۱۵)

ٹوٹ بٹوٹ نے ایک طوطا پال رکھا ہے اور جس کی عمر دو ماہ ہے۔ نام اس کا میاں مٹھو ہے۔ عموماً بچے

کوئی نہ کوئی جانور پال لیتے ہیں۔ جس سے نہ صرف وہ بہت محبت کرتے ہیں بلکہ اُس کا ہر وقت بہت خیال بھی رکھتے ہیں۔ اس کے کھانے پینے پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ چاہے خود کو کھانا پینا یاد نہ ہو۔ اپنے پالتو جانور کو وقت پر کھانا دینا کبھی نہیں بھولتے اور شاید یہ بچوں کی محبت کا ہی ایک انداز ہے۔ طوطا تو ویسے بھی پالتو جانور ہے۔ ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا بھی ہر شے کھا لیتا ہے جو اُسے دی جائے۔ وہ ہر شے چبا لیتا ہے۔ کیونکہ اُس کے کافی سارے دانت ہیں اور ہر شے کی سواری بھی کرتا ہے۔ یعنی جہاں اس کا مالک جاتا ہے وہ بھی ساتھ ہی جاتا ہے۔

ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا بہت ہی پیٹو قسم کا ہے۔ رات کو چُوری کھاتا ہے تو دن میں حلوہ پوری کھا لیتا ہے۔ صبح کو لڈو اور شام کو انڈے بھی کھاتا ہے لیکن جو مقدار لکھی ہے یقیناً اُس میں صداقت نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بچوں کے لیے ہے اور عموماً بچے بھی جب کوئی بات اپنے پالتو جانور کے بارے میں بتاتے ہیں تو اکثر مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا اس نظم کا بھی تھوڑا پر تجسس ہونا ضروری ہے اور جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ یقیناً بچوں کو طوطے دیکھنے اور پالنے کی طرف ضرور متوجہ کرے گا۔

''ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی'' اگلی نظم ہے جس میں صوفی تبسم نے ٹوٹ بٹوٹ کے چار بھائیوں کا تعارف بڑے ہی خوبصورت انداز میں کروایا ہے۔

''اِک بڑا ہے اِک چھوٹا ہے　　　اِک دُبلا ہے اِک موٹا ہے

دو کہتے ہیں اس کو بھیا　　　دو کہتے ہیں اس کو بھائی

ٹوٹ بٹوٹ کی شامت آئی

ٹوٹ بٹوٹ کے چار ہیں بھائی''(۱۶)

چاروں بھائی ایک دوسرے سے مختلف خدوخال اور ڈیل ڈول کے مالک ہیں اور ٹوٹ بٹوٹ اس میں سب سے بڑا ہے اور یہ چاروں اس سے چھوٹے ہیں۔ بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے ٹوٹ بٹوٹ پر ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔ اُسے اپنے چاروں بھائیوں کا بیک وقت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بڑے بھائیوں کی عزت بھی زیادہ ہوتی ہے او ران پر ذمہ داریاں بھی بڑی اور بھاری ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کا نہ صرف ہر طرح خیال رکھنا پڑتا ہے بلکہ ان سے شفقت سے بھی پیش آنا پڑتا ہے۔ چھوٹے عموماً غلطیاں زیادہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں بڑے بھائیوں کو بڑے دل کا مظاہرے کرنا پڑتا ہے اور اُنھیں معاف کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح

چھوٹوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے سے بڑے بہن بھائیوں کی نہ صرف عزت کریں بلکہ ان کا کہنا بھی مانیں اور کوشش کریں کہ ایسی غلطیاں اور کام نہ کریں جن سے بڑوں کو تکلیف ہو۔ ساتھ ہی چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں کم اور بڑے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی حال ٹوٹ بٹوٹ کا بھی ہے۔ چاروں بھائیوں کی عادات مختلف ہیں اور چاروں بے حد خوبصورت ہیں۔

"اِک بھائی لنگوٹی پہنے — دوسرا نِکر چھوٹی پہنے
تیسرا پہنے طبا کُرتا — چھوٹا پہنے سوٹ اور ٹائی
ٹوٹ بٹوٹ کی شامت آئی
ٹوٹ بٹوٹ کے چار ہیں بھائی" (۱۷)

چاروں بھائی ایک دوسرے سے مختلف کپڑوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ایک دیسی طبیعت کا ہے جو کہ لنگوٹی پہنتا ہے۔ دوسرا نِکر پہنتا ہے۔ تیسرا بھی کُرتا پسند کرتا ہے اور چوتھا انگریزی طبیعت کا مالک ہے۔ وہ سوٹ اور ٹائی پسند کرتا ہے۔اسی طرح کھانے پینے میں بھی سب کے ذائقے اور شوق مختلف ہیں۔ ایک کو حلوہ پوری پسند ہے تو دوسرے کو چوری، تیسرا گرم پکوڑوں کا شوقین ہے اور چوتھا برف ملائیا کا دلدادہ ہے یعنی کہنے تو سب بھائی ہیں لیکن ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ صرف نظم کی حد تک نہیں بلکہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ سگے بہن، بھائیوں کی عادتوں، مزاج اور پسند ناپسند میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور ویسے بھی یہ انسانی مزاج کا حصہ ہے۔ کہ وہ یکسانیت پسند نہیں کرتا۔ بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ بھی تبدیلی کو پسند کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ رہن سہن ہو یا کھانا پینا ہو۔ ہر شے میں تبدیلی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس نظم میں جن کھانوں کا ذکر ہے۔ بچے اُن کی پہچان کر سکیں گے اور ذائقوں کے بارے میں بھی جان سکیں گے کہ ہر شے ایک دوسرے سے مختلف ذائقہ اور شکل رکھتی ہے۔

"ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے" چھوٹے چوہے کے بلند حوصلہ پر نظم ہے۔

"یہ جتنے چوہے دیکھتے ہو — کچھ گاؤں کے ہیں کچھ جنگل کے
کچھ رہنے والے جہلم کے — کچھ باسی کتھو ننگل کے
کچھ لنڈن کچھ مدوٹ کے ہیں — ہم جو ہے ٹوٹ بٹوٹ کے ہیں

ہم شاہی نسل کے چوہے ہیں　　یہ تخت اور تاج ہمارا ہے
ہر گاؤں میں اپنی شاہی ہے　　ہر شہر میں راج ہمارا ہے
ہم راجے شاہی کوٹ کے ہیں　　ہم چوہے ٹوٹ بٹوٹ کے ہیں
ہم چوہے ٹوٹ بٹوٹ کے ہیں۔"(۱۸)

اس نظم میں چوہوں کا کہنا ہے کہ وہ سب ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے ہیں۔ چاہے وہ جنگل کے چوہے ہوں یا آبادی میں رہتے ہوں۔ سب کے سب ٹوٹ بٹوٹ سے خود کو منسوب کرتے ہیں۔ ان چوہوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ شاہی نسل کے چوہے ہیں اور یہ تخت اور تاج انہی کی ملکیت ہے۔ ہر جگہ یہ شہر میں انہی کی بادشاہت ہے یعنی خود کو یہ بہت اعلیٰ نسل کا سمجھتے ہیں۔

ان چوہوں کا ماننا ہے کہ بڑے ہی محنتی چوہے ہیں اور یہ شہر سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں اور بہادری میں بھی یہ شیر کو خود سے بہت کم سمجھتے ہیں۔ بلی بھی ان چوہوں سے ڈرتی ہے۔ خواہ دیکھنے میں یہ کمزور ہیں لیکن جب موج میں آتے ہیں تو شیر اور گیدڑ کیا شے ہے۔ یہ تو کتے کو بھی کھا جاتے ہیں کیونکہ یہ خود کو بہت بہادر سمجھتے ہیں۔

بے شک بچوں کے لیے بے حد سبق آموز نظم ہے کہ خواہ دیکھنے میں آپ کمزور اور چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر آپ کے حوصلے بلند ہیں۔ ہمت اور جوش ہے تو آپ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی پسپا کر سکتے ہیں ۔اگر آپس میں اتفاق ہو تو ایک ساتھ مل کر شیر جیسے جانور یا مصیبت کو بھی ہرایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے ارادے بلند ہوں با ہمت ہو۔ اسی صورت میں وہ آگے زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے ۔لیکن اگر اپنے سے بڑی مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جائیں گے۔ ہمت ہار جائیں گے یا مصیبتوں کو دیکھ کر راستہ بدل دیں گے تو کبھی آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ نہ ہی منزل پر پہنچ سکیں گے۔ صرف اور صرف ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ طاقت صرف سوچ سے پیدا ہوتی ہے۔ نہ کہ چھوٹے یا بڑے ہونے سے ۔ بلی جب بند گلی میں پھنس جائے تو وہ شیر سے بھی بہادر ہو جاتی ہے۔ مرغی کے اگر چوزوں پر حملہ ہو تو وہ بلی کو بھی ہرا دیتی ہے۔

"ٹوٹ بٹوٹ کی بکری" اگلی نظم ہے جس میں انسان اور جانور کی دوستی دکھائی ہے۔ سب سے پہلے بکری کا تعارف ہے کہ وہ دیکھنے میں دُبلی پتلی ہے۔ دن ، رات مکھن، دودھ کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود کمزور ہے۔ ایک دن بکری نے اپنی نانی کے پاس جانے کی ضد کی۔ ٹوٹ بٹوٹ نے بہت سمجھایا کہ وہ اکیلی

نہ جائے۔ لیکن وہ اکیلی ہی چل پڑی اور راستے میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ شیر نے اُسے آ لیا۔

''جنگل کو چل پڑی اکیلی — بکری تیرا اللہ بیلی
مَیں مَیں مَیں کرتی تھی وہ — جس میں لیکن ڈرتی تھی وہ
یااللہ کوئی شیر نہ آئے — یونہی مجھ کو کھا نہ جائے
وہی ہوا جس بات ڈر تھا — رستے میں اِک شیر کا گھر تھا
مَیں مَیں سن کر باہر آیا — بکری دیکھ کر جی للچایا
شیر کو دیکھ کر ڈر گئی بکری — ڈر گئی کیا بس مر گئی بکری''(۱۹)

جب بکری نے شیر کو دیکھا تو گھبرا گئی اور شیر سے التجا کی کہ انھیں مجھے نہ کھانا میں بہت کمزور ہوں۔ تھوڑی صحت مند ہو جاؤں، پھر کھانا۔ شیر نے اُسے جانے دیا۔ پھر نانی کے گھر جا کر سارا قصہ سنایا۔ نانی نے شاباش دی کہ تو اپنی عقل مندی سے بچ کے آئی ہے۔ اب جو چاہو کھاؤ اور واپسی پر خاموشی سے چلی جانا تاکہ شیر کو خبر نہ ہو۔

جب ڈھول وہاں سے گزرا تو شیر گرجا اور کہا میری بکری کہاں ہے؟ شیر جانتا تھا کہ بکری بے وقوف ہے۔ وہ فوراً بولی کہ یہاں ہے۔ شیر نے اُسے پکڑ لیا اور فوراً کھا گیا۔ بچوں کو اس نظم میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ہر وقت کی ضد اور من مانی اچھی بات نہیں ہے۔ کیونکہ بچے وہ باتیں نہیں جانتے جو بڑے جانتے ہیں۔ ویسے بھی بڑوں کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر بڑے کسی بات سے منع کریں تو بات مان لینی چاہیے کہ اسی میں ہی چھوٹوں کی بھلائی ہوئی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں نقصان اُٹھائیں گے اور یہاں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ جیسا کہ بکری نے اپنی ضد اور بے وقوفی سے اپنی جان کو گنوا دیا۔ جبکہ شیر اپنی عقل مندی اور تجربے کی وجہ سے فائدے میں رہ گیا۔

''ٹوٹ بٹوٹ کا نانا'' اور ''ٹوٹ بٹوٹ کی آپا'' دونوں تعارفی انداز کی نظمیں ہیں۔ جن میں ٹوٹ بٹوٹ کے نانا اور آپا کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ ان کی عادات واطوار کے متعلق بھی بتایا گیا ہے۔

''اس دنیا میں ایک گاؤں ہے — اُس گاؤں کا نام گڑاؤں ہے
اس گاؤں میں جتنے رہتے ہیں — وہ سب کے سب یہ کہتے ہیں
یہ گاؤں بڑا پُرانا ہے — یہاں ٹوٹ بٹوٹ کا نانا ہے''(۲۰)

نانا کا گاؤں گڑاؤں ہے۔ گاؤں کا نام گڑاؤں اس لیے ہے کہ دونوں ہم قافیہ اور ہم آواز ہیں اور اس سے بچوں کو پڑھنے اور سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ بہت پُرانا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے لوگ نرالے ہیں۔ پورے گاؤں میں ایک ہی شخص گاتا ہے اور وہی ٹوٹ بٹوٹ کا نانا ہے۔ گاؤں میں اسے بہت سیانا اور عقل مند سمجھا جاتا ہے۔ ایک مثالی گاؤں کا نقشہ دکھایا گیا ہے جہاں سب مل کر رہتے ہیں اور بڑوں کی عزت کرتے ہیں۔

اسی طرح ٹوٹ بٹوٹ کی آپا دکھنے میں ننھی منھی سی لڑکی ہے لیکن بہت لڑاکا ہے۔

''اِک ننھی منھی لڑکی ہے — وہ اپنے گھر میں رہتی ہے
گھر والے اس سے ڈرتے ہیں — وہ ہر اِک سے یہ کہتی ہے
میں ٹوٹ بٹوٹ کی آپا ہوں — ظاہر میں ''اکا باکا'' ہوں
لیکن وہ بڑی لڑاکا ہے — کچھ کہو تو فوراً لڑتی ہے
سن لو میں بے بی باکا ہوں — میں ٹوٹ بٹوٹ کی آپا ہوں''(۲۱)

گھر والے سب اس سے ڈرتے ہیں۔ ہر وقت لڑتی اور شور مچاتی ہے۔ اُس کی ہر بات نرالی ہے۔ بلی اور چوہے پال رکھے ہیں اور اُن کو بھی ڈراتی رہتی ہے۔ ان دونوں نظموں میں بس نانا اور آپا کا ذکر ہے۔ بچوں کو رشتوں کے متعلق سکھاتی ہیں کہ ایک طرف بڑوں کا احترام کرنا ضروری ہے اور دوسری طرف یہ سکھایا ہے کہ ہر وقت کا لڑائی جھگڑا اور شور شرابا بھی اچھی بات نہیں ہے۔ لڑاکا بچوں سے نہ صرف گھر والے ڈرتے ہیں بلکہ اُن کو کوئی بھی پیار نہیں کرتا۔ اس لیے بچوں کا بھی اچھے اور نرم مزاج کا مالک ہونا ضروری ہے تاکہ سب اُن سے محبت کریں۔

''ٹوٹ بٹوٹ کیا کرے یار'' جانوروں سے دوستی سے متعلق نظم ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کیا کرے یار — ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے چار
ٹوٹ بٹوٹ کی دو بہنیں ہیں — ہر اِک بہن بڑی ہشیار
ہر اِک کے پاس ہے اِک چوہا — ٹوٹ بٹوٹ کے پاس ہیں چار
اِک پہنے ہے اچکن کالی — اِک پہنے بنیان ہی خالی
اِک ہوتا ہے ننگے پاؤں — اِک کے سر پہ ہے دستار
ٹوٹ بٹوٹ کیا کرے یار — ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے چار'' (۲۲)

یوں ٹوٹ بٹوٹ کے چوہوں اور اُن کی عادات پر مشتمل یہ ایک طویل نظم ہے۔ جس میں چوہوں کی عادات واطوار کا بڑی خوبصورتی سے ذکر ہے کہ اُنھیں پہننے، کھانے، پینے میں کیا پسند ہے۔ چاروں چاہوں کی پسند و ناپسند مختلف ہے اور چاروں ظاہری خدوخال میں بھی ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں بچے بہت سے نئے الفاظ بھی سیکھتے ہیں اور اُن کے اصل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے اچکن، دستار، چُورن، تندرست، شیطان، نادان وغیرہ۔ اچکن اور دستار ہمارے لباس کا وہ حصہ ہیں جو پہلے پہل بہت مقبول رہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی جگہ انگریزی لباس نے لینا شروع کر دی۔ حالانکہ اچکن اور دستار عزت و وقار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اہمیت میں کمی آتی جا رہی ہے۔

صوفی تبسم اپنی بہت ساری نظموں میں موسیقیت پیدا کرنے کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جن کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہوتے۔ لیکن اُن کے بغیر شعر بھی ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے چُوں چُوں کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھا جا رہا ہے کہ چوہوں کی طرح ہر وقت کھیلنا بھی صحیح نہیں ہے اور بے کار بیٹھنا بھی غلط ہے۔ انسان ہو یا جانور، کچھ نہ کچھ کرتے رہنے میں ہی بھلائی ہے۔ فارغ اوقات کا کوئی نہ کوئی مصرف ہونا چاہیے۔ ساتھ مل جل کر کھیلیں ضرور لیکن فضول کے شوروغوغا سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ نے کر لی شادی'' اگلی نظم ہے جس میں شادی کے بعد ٹوٹ بٹوٹ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

''کچھ ہمجولی کچھ ہمسائے　　　کچھ اپنے کچھ لوگ پرائے
ٹوٹ بٹوٹ کو ملنے آئے　　　ٹوٹ بٹوٹ کی بولی دادی
ٹوٹ بٹوٹ نے کر لی شادی
اب نہ وہ شوخی اب نہ وہ شیخی　　　اب نہ وہ اس کی دھینگا مشتی
ختم ہوئی سب ہا ہا ہی ہی　　　ختم ہوئی ساری آزادی
ٹوٹ بٹوٹ نے کر لی شادی
اب نہ وہ رونق نہ وہ میل　　　دن بھر گھر میں رہے اکیلا
بیوی لے گئی پیسا دھیلا　　　میرے اللہ یہ بربادی
ٹوٹ بٹوٹ نے کر لی شادی'' (۲۳)

صوفی تبسم کا اس نظم میں کہنا ہے کہ ٹوٹ بٹوٹ شادی کرنے کے بعد بہت بدل گیا ہے۔ اب نہ اس میں وہ پہلے جیسی شوخی رہی ہے اور نہ ہی وہ شرارتی طبیعت رہی ہے اور غصہ بھی اب پہلے کی طرح نہیں کرتا۔ اب اس کی ساری آزادی ختم ہوگئی ہے۔ گھر سے باہر نکلنا بھی اب کم ہوگیا ہے۔ جو کماتا ہے وہ سارا بیوی کو دے دیتا ہے اور یوں وہ شادی کر کے خود کو برباد کر بیٹھا ہے۔ یہ نظم جس قدر بچوں کے لیے لطف کا باعث ہے۔ اُسی قدر بڑوں کے لیے بھی ہے۔ بچے اس نظم کو پڑھ کر جب بڑوں سے نہ سمجھ آنے والی باتوں کا پوچھیں گے تو کہیں نہ کہیں بڑے بھی اس سے محظوظ ہوں گے۔

شادی کرنے کے بعد ہر کوئی بدل جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کی ذمہ داری بھی بدل جاتی ہیں۔ اُس کی سماجی حیثیت میں فرق آ جاتا ہے۔ اُسے پہلے سے زیادہ سمجھ داری اور ذمہ داری سے کام لینا پڑتا ہے۔ طبیعت میں سنجیدگی کا آجانا بھی ایک معمولی بات ہے۔ کیونکہ اب اُسے ملازمت کرنا پڑتی ہے۔ خود کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی ذمہ داری (یعنی بیوی کی صورت میں) آن پڑتی ہے۔ لہٰذا انسان ہو یا جانور شادی کے بعد اُس کی ذاتی زندگی اور معاشرتی زندگی میں کافی فرق آ جاتا ہے۔ پہلے وہ اکیلا ہوتا ہے تو زندگی کے سارے مزے اُٹھاتا ہے۔ دوست یار ملنا ملانا ہوتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد نئی رشتے داریاں اور ذمہ داریاں اُس کے حصے میں آتی ہیں۔

''مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ'' میں ٹوٹ بٹوٹ کے مدرسے جانے کی بڑے خوبصورت انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔

''آج چپ چاپ سب کھڑے ہو جاؤ شان سے آ رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ
آج کوئی نہ اور بات کرو مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ

آج ٹوٹ بٹوٹ کے احترام میں سب چوکس کھڑے ہیں اور ٹوٹ بٹوٹ کے بھی آج ٹھاٹھ ہیں۔ کیونکہ وہ مدرسے جا رہا ہے۔ جس طرح بچوں کو پہلے دن سکول (مدرسے) بھیجنے پر جو تیاریاں ہوتی ہیں اور جو ناز نخرے اُٹھائے جاتے ہیں۔ کچھ وہی مناظر اس نظم میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح ٹوٹ بٹوٹ کے مدرسے جانے پر سب بے حد خوش ہیں۔ اس کے سب دوست جن میں جانور بھی شامل ہیں۔ وہ بھی اپنے اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

''ایک نوکر اُٹھائے ہے کاپی ایک نوکر لیے ہوئے ہے کتاب
ایک جھک کر کہے حضور حضور ایک اُٹھ کر کہے جناب جناب''(۲۴)

نوکر بھی آج اُس کے ایک اشارے کے لیے چوکنا کھڑے ہیں۔ کسی نے کاپی پکڑی ہوئی ہے تو کسی نے کتاب ۔ٹوٹ بٹوٹ کے آج خوب نخرے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا رہا ہے کہ گھر میں تو ٹوٹ بٹوٹ کی بہت خدمتیں ہوئی ہیں۔ اسے کھانے پینے کو ہر شے حاصل ہے۔ جو وہ چاہتا ہے اُسے کھانے کو مل جاتا ہے لیکن مدرسے سے اُسے ہر وقت سزا ملتی رہتی ہے۔ وہاں اُس کی کوئی عزت نہیں ہے۔

مدرسے میں اُسے الف ب بھی نہیں آتی۔ اُسے کوئی سبق یاد نہیں رہتا۔ اس طرح مدرسے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس لیے ٹوٹ بٹوٹ مدرسے جانے سے گھبرا رہا ہے۔ کیونکہ وہاں صرف اُس کو مار پڑتی ہے۔ بچوں کو اس نظم سے یہ اہم ترین سبق ملے گا کہ عزت اُسی کی ہوتی ہے جو پڑھتا ہے اور جو مدرسے جاتا ہے۔ لیکن جو بچہ پڑے گا نہیں ۔سبق نہیں یاد کرے گا اُسے نہ صرف مدرسے میں سزا ملے گی بلکہ گھر میں بھی اُس کی کوئی عزت نہیں ہوگی ۔ یوں اس نظم سے وہ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہوں گے اور خود بھی تعلیم کو فوقیت دیں گے۔ دوسرا یہ کہ یہاں مدرسے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے بچے نئے الفاظ اور خاص طور پر اُردو میں درست الفاظ سیکھ پائیں گے۔ ورنہ یہاں یہ سکول کا لفظ بھی استعمال ہوسکتا تھا۔ لیکن صوفی تبسم نے لفظ مدرسے کا ذکر کرکے اُردو میں بچوں کی دلچسپی کو بڑھانے کی کوشش ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ نرالا ہے'' یہ ٹوٹ بٹوٹ کے کردار پہ تعارفی نظم ہے۔ جس میں ٹوٹ بٹوٹ کی ظاہری شکل وصورت کے ساتھ ساتھ اس کی عادات و اطوار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شہر کے تمام رہنے والے اس کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سب سے منفرد ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کی بہنیں کالی
ابا، امی، نانی، کالے
چچا کالا، چچی کالی
ماموں اور ممانی کالے
گھر والے تو کالے ہی تھے
ہمسایہ بھی کالا ہے
ٹوٹ بٹوٹ کی بات نہ پوچھو
ٹوٹ بٹوٹ نرالا ہے''(۲۵)

بچوں کو ان سے معلوم ہوگا کہ کون سا رشتہ ماں کی طرف سے ہے اور کون سا باپ کی طرف سے ہے۔ ساتھ ہی ہمسایوں کے متعلق بھی جاننے لگتے ہیں۔ یہاں جو بات قابلِ غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ قریبی رشتے داروں کے ساتھ ہی ہمسایوں کا ذکر آیا ہے تاکہ بچے شروع سے ہی ہمسایوں کی اہمیت دینی اور دنیاوی نقطۂ نظر دونوں سے جان سکیں اور ہمسایوں کی بھی اسی طرح عزت کریں جس طرح خود سے منسوب رشتے داروں اور عزیز و اقارب کی عزت کرتے ہیں۔

ٹوٹ بٹوٹ بے حد شرارتی ہے جس طرح عموماً اس عمر کے بچے شرارتی ہوا کرتے ہیں۔ ٹوٹ بٹوٹ بھی ویسا ہی ہے اور اس کی اس حد درجہ شرارتی طبیعت کی وجہ سے سب اسے شیطان کا شاگرد کہتے ہیں۔ دیکھنے میں تو ٹوٹ بٹوٹ بہت بھولا لگتا ہے۔ لیکن اصل میں بہت غصے والا ہے۔ اسی لیے سب اُس سے ڈرتے ہیں۔ بچوں کا شرارتی ہونا تو جائز ہے لیکن لڑاکا، جھگڑالو اور بدتمیز ہونا کسی صورت جائز نہیں ہے۔ ایسے بچوں کو نہ تو کوئی پسند کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ان سے پیار کرتا ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی ایسی تربیت دینی چاہیے کہ وہ نہ صرف بڑوں کی عزت کریں۔ ان سے ادب سے بات کریں بلکہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ بھی دوستی کا رویہ رکھیں۔ ان سے محبت کریں۔ اگر شروع بچپن سے ہی بچے کی درست اخلاقی تربیت نہیں ہوگی تو وہ جھگڑالو اور بدتمیز ہی ہوگا۔ جسے سب ہی دور بھاگیں گے۔ لہٰذا بچوں کی تربیت بہت مشکل اور اہم ذمہ داری ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کی کہانی'' میں ایک پُرانی کہانی کا ذکر ہے۔ ایک راجا اور چند لوگوں کا ایک قصہ ہے۔

''چھوٹی سی اِک کہانی ہے — لیکن وہ بڑی پُرانی ہے
ملتان کے پاس اِک بستی ہے — بستی میں خلقت بستی ہے
اس بستی میں جو رہتے تھے — سب اُس کو نگری کہتے تھے
اس نگری میں سب نائی تھے — سب ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی تھے
کوئی کہیں کا رہنے والا ہو — کوئی گورا ہو یا کالا ہو
وہ لمبے ہوں یا چھوٹے ہوں — وہ دُبلے ہوں یا موٹے ہوں
ہاں جتنے لوگ بھی آتے تھے — یہ نائی انھیں ڈراتے تھے
ہم اس بستی کے نائی ہیں — ہم ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی ہیں''(۲۶)

بڑے خوبصورت انداز میں کہانی سے متعلقہ علاقے کا تعارف کرایا گیا ہے۔ بستی کے لفظ کی تکرار موجود

ہے لیکن یہ گراں نہیں گزرتی ۔ بلکہ موسیقیت پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ علاقے میں رہنے والے زیادہ تر نائی تھے۔ سب ہی خود کو ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی بتاتے تھے۔ یہاں بھائی سے مراد دوست بھی ہو سکتے ہیں اور یہ خود کو اس علاقے کا لیڈر سمجھتے تھے یا حاکم سمجھتے تھے اور جو بھی لوگ اس علاقے میں آتے تھے وہ نہ صرف ان سے ڈرتے تھے بلکہ یہاں اُنہی کی بات مانی جاتی تھی۔

یہ نائی جسے سب کو ڈراتے تھے ۔ اسی طرح وہ اس بستی کے راجا کو ڈرانے دھمکانے آ گئے۔ لیکن راجا اُن سے نہ ڈرا بلکہ اُلٹا انھیں ڈرا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بچوں کی اکثریت کو یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ایک گروہ کی صورت میں کسی نہ کسی علاقے پر اپنا رُعب رکھتے ہیں۔ یا اُن کی نظر میں وہ علاقہ اُن کی ملکیت ہوتا ہے اور جو کوئی بھی باہر سے وہاں آتا ہے۔ وہ اُس کو ڈرا دیتے ہیں یا بھگا دیتے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کی اسی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی نائی کے پیشے سے واقفیت دی گئی ہے کہ اس پیشے سے منسلک لوگ دوسروں کے بالوں کی تراش خراش کا کام کرتے ہیں۔ یوں بچے اس پیشے سے منسلک چیز کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اہم بات یہ کہ بچوں کو یہ اس پیشے سے منسلک افراد کا احترام کرنا چاہیے۔ کیونکہ نسلی تعصب رکھنا بہت ہی زیادہ بڑی بات ہے۔ رنگت، شکل وصورت خُدا کی دین ہے اور ہمارے مذہب میں بھی یہ ہے کہ عظمت کی بنیاد پر نہ کسی کو فوقیت حاصل ہے نہ کوئی کمتر ہے۔ اصل بات اخلاق اور کردار کی ہوتی ہے۔ اگر انسان بااخلاق ہے تو کسی بھی پیشے سے ہو، کسی بھی علاقے سے ہو، وہ عزت ہی پاتا ہے اور راجا کو یہاں ایک سمجھدار انسان کے روپ میں دکھایا گیا ہے جو اس شریر گروہ سے نہیں ڈرتا اور سب کو اس پریشانی سے بچا لیتا ہے۔

''اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں'' قدیم سے جدید اور مشرق سے مغرب کی طرف سفر کی ایک داستان نما نظم ہے جو بدلتے وقت، حالات اور عادات کی بھرپور عکاس ہے۔

''اب دال چپاتی کیا شے ہے
سب کیک اور بسکٹ کھاتے ہیں
کیا مطلب دودھ اور لسّی سے
سب انگلش سوپ اُڑاتے ہیں
سب کوکا کولا پیتے ہیں
کھاتے ہیں کیونکر اوٹ میاں
اب ایک ہی ٹوٹ بٹوٹ نہیں
اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں
اب ننگے سَر سب پھرتے ہیں
اب ٹوپی اور دستار کہاں

اب چرچا ہے پتلونوں کا اب پاجامہ ، شلوار کہاں
اب کام ہے کالر ٹائی سے اب پہنتے ہیں سب کوٹ میاں
اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں''(۴۷)

دراصل اس نظم میں ٹوٹ بٹوٹ سے مراد اس انسان کو لیا جا راہ ہے جو اپنی قدیم مشرقی روایات سے دور جاتا جا رہا ہے اور دھیرے دھیرے مغربی روایات کو اپنانے لگا ہے۔ اب اس کا کھانا، پینا، اوڑھنا سب تبدیل ہو رہے ہیں۔ پہلے لوگ سَر کو ڈھانپ کر رکھتے تھے اور دستار کو عزت کی علامت بھی کہا جاتا تھا لیکن اب سب ننگے سر گھومتے ہیں۔ شلوار کی جگہ پتلون نے لے لی ہے اور قمیض پر اب شرٹ اور ٹائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یعنی مشرقی لباس ختم ہوتا جا رہا ہے اور مغربی لباس اپنایا جا رہا ہے۔ بلکہ کسی رمانے میں شرٹ ، ٹائی اور سوٹ انتہائی مہذب لباس قرار دیا جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے لیکن موجودہ مغربی لباس' نوعمر لڑکوں' کے لباس کے فروغ دے رہا ہے، یعنی ٹی شرٹ اور بے ہودہ انداز میں پہنی ہوئی پتلون جو کہ ایک غیر سنجیدہ شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ لباس نہ صرف لڑکے، لڑکیاں بلکہ تمام عمر کے لوگ مغربی ثقافتی یلغار کے نتیجے میں پہن رہے ہیں اور اب تو باقاعدہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں جو اس طرح کا لباس تیار کرتی ہیں اور یہ اکثر غیر ملکی ہوتی ہیں۔ مثلاً لیوائز(Levis)، ایڈی ڈاس(Addidas)، پولو(Polo) وغیرہ اور ان کے ذریعے وہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کرکے نہ صرف بھرپور پیسہ کمارہے ہیں بلکہ ہمیں ہماری تہذیب سے بہت دور لے جا رہے ہیں۔

بدلتی ہوئی ثقافت، خوراک پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مغربی ثقافت کی یلغار نے مشرقی خوراک کو بھی متاثر کیا ہے اور یہاں تک کہ اب گاؤں میں بھی لسّی کی جگہ کوکا کولا پیش کی جاتی ہے۔ یہ غیر فطری تبدیلی ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ تمام اشیاء مثلاً کیک بسکٹ، کوکا کولا، سُوپ وغیرہ مغرب کی پیداوار ہیں اور ہمارا مشرقی معاشرہ ان کے لیے بہترین منڈی ہے۔ ہم ایک صارف معاشرہ ہیں۔ اُن کی پیداوار کو صرف استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ہماری دولت سرمایہ دارانہ ممالک میں چلی جاتی ہے اور پاکستان غریب سے غریب تر اور قرضوں کے بوجھ تلے دبتا چلا جا رہا ہے۔ آج کل یہ کام کثیرالاقوامی کمپنیوں کے ذریعے کیا جا رہا ہے جو ہمارے میڈیا کے ذریعے اشتہار بازی سے لوگوں کی اشتہا بڑھاتے ہیں اور گلوبل ورلڈ کی ثقافت کو پھیلانے کی اصطلاح دراصل مقامی ثقافت کو برباد کرنے کی ایک سازش ہے اور اس کے پس پردہ معاشی مفادات پوشیدہ ہیں۔ دنیا بھر

میں صرف مغربی ثقافت کا رواج اور فاسٹ فوڈ کا کلچر پیدا کیا جا رہا ہے جس کی نمائندہ کمپنیاں کے اینڈ ایس، کے ایف سی، میکڈونلڈ، سب وے، پیزاہٹ وغیرہ کا ایک تسلسل ہے جو ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور یہ خوراک کھانے والے بچوں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے اور ان کمپنیوں کا منافع اور اصل کمائی بھی مغربی ممالک کو جا رہی ہے۔ لہٰذا اپنی ثقافت، اپنی خوراک کی حفاظت اورانھیں اپنانے کے لیے صوفی تبسم نے ٹوٹ بٹوٹ کے ذریعے نہ صرف اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ اپنی خوراک سے بھی متعارف کرایا ہے تاکہ بچے اپنی علاقائی فطرت کے مطابق خوراک لیں۔ جس میں موجود تمام غذائیت جو صدیوں سے جاری ہے، بچوں کو میسر آ سکے۔

''اب موٹر کاریں چلتی ہیں | اب ٹانگا ٹم ٹم کیا شے ہے
اب شور ہے جیپ کے انجن کا | گاڑی کی چھم چھم کیا شے ہے
اب جو بھی پیدل چلتا ہے | لگتی ہے اُس کو چوٹ میاں
اب ایک ہی ٹوٹ بٹوٹ نہیں | اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں''(۴۸)

ریل کے انجن کی جگہ اب گاڑیوں نے لے لی ہے۔ سب کے پاس اپنی اپنی ذاتی گاڑیاں ہیں او رریلوے کا سفر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور جو غریب آج بھی پیدل چلتا ہے اُسے ٹھوکر لگتی ہے یعنی جس کے پاس یہ سہولتیں نہیں ہیں وہ چوٹ کھاتا ہے۔یا جو ان بدلتے حالات کے ساتھ خود کو نہیں بدلتا وہ نہ صرف منہ کے بل گرتا ہے بلکہ وقت سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایک طرح سے اس میں یہ بات بھی بیان کی جا رہی ہے کہ بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ بدلنا ضروری ہے اور جو تبدیلی کو نہیں اپناتا (جو وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ نہیں بھاگ سکتا)وہ اکیلا رہ جاتا ہے اور وقت تو ویسے بھی کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ لہٰذا ترقی کی بجائے تنزلی اُس کا مقدر بنتی ہے۔

اور بدلتا وقت جہاں ذاتی زندگی میں تبدیلی لا رہا ہے۔ وہاں اجتماعی معاشی اور معاشرتی زندگی بھی اس تبدیلی کو اپنا رہے ہیں۔ پہلے لوگوں کی ضرورتیں گلی محلوں میں موجود کریانے کی چھوٹی چھوٹی دکانوں سے پوری ہو جاتی تھیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ جب ہم نے اپنی ضرورتوں میں اضافہ کر لیا اور اپنا رہن سہن بھی بدل دیا تو وہیں کریانے کی دکانوں کی جگہ بڑے بڑے بازاروں اور سٹورز نے لے لی۔ اور ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھ گئے اور پیسے دھیلے سے کی جانے والی خریداری اب نوٹوں سے ہونے لگی جو کہ معاشی تبدیلی کی علامت ہے۔ یعنی انفرادیت سے اجتماعیت تک ہر جگہ تبدیلی نظر آنے لگی اور پہلے پہل اس تبدیلی کو قبول کرنے والے صرف چند لوگ

تھے۔ یا ایک مخصوص طبقہ تھا لیکن پھر اُن کی دیکھا دیکھی سب ہی اس طرزِ زندگی کے عادی ہو گئے۔

اس نظم میں مختلف شہروں کا ذکر بھی ہوا ہے ۔ جیسے لاہور، راولپنڈی، پشاور، کیمبل پور، گجرانوالہ، جہلم، روڑی ، سکھر وغیرہ اس سے نہ صرف شہروں کے متعلق بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ ان شہروں کی خصوصیات سے بھی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ نیز ان شہروں کے علاوہ بھی جو کوئی شہر ہیں سب چڑیا کوٹ ہیں۔ چڑیا کوٹ یہاں شہروں کی زندگی کی گہما گہمی یا پُرہجوم کے پیشِ نظر استعمال کیا گیا ہے۔ زندگی چاہے کوٹھی یا بنگلے میں ہو یا تنگ مکانوں میں وہ ہر جگہ ہی ایک جیسی ہے۔ سب کے طور طریقے اب ایک ہی ہیں۔ کیونکہ اب سب ہی ٹوٹ بٹوٹ ہیں۔

صوفی تبسم کی ساری نظموں کوئی نہ کوئی پیغام یا سبق لیے ہوئے ہوتی ہیں اور بچوں کو ہر بار ان سے کچھ نیا سیکھنے یا جاننے کو ملتا ہے۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے گھر آئے دو چوہے مہمان'' بھی اسی سلسلے کی ایک نظم ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کے گھر میں آئے، دو چوہے مہمان

اک چوہا تھا بھولا بھولا

اِک چوہا شیطان

ٹوٹ بٹوٹ کے گھر میں آئے دو چوہے مہمان

ٹوٹ بٹوٹ نے ہاتھ ملایا

جھک کر کیا سلام

پھر بولا یہ گھر ہے تمہارا

سمجھو مجھے غلام

جو کچھ چاہو منہ سے مانگو حاضر ہے یہ جان

ٹوٹ بٹوٹ کے گھر میں آئے دو چوہے مہمان''(۲۹)

دراصل یہ نظم بچوں کو مہمان نوازی کا مطلب اور اُصول سکھاتی ہے کہ گھر آئے مہمان کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔ اُسے بہت اچھے انداز میں خوش آمدید کہنا چاہیے اور اُس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنا چاہیے۔ نیز مہمان کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیے ۔ ہمارے مذہب اسلام میں بھی مہمان کی بہت اہمیت ہے۔

اسے خدا کی رحمت سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ مہمان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھنی چاہیے اور جو کچھ گھر میں ہو اُسے مہمان کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ یوں بچوں کو نہ صرف مہمان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا بلکہ وہ خود بھی پھر اس اچھے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں گے۔

اور بچے یہ جان سکیں گے کہ مہمان نوازی کا مطلب یہ بھی ہے کہ مہمان کی رضا اور مرضی بھی شامل ہو تا کہ مہمان کی بہتر طور پر خدمت کی جا سکے۔

''چٹنی میں تھا مرچ مصالحہ، دینے لگے دہائی
پان میں چونا تیز لگا تھا، فوراً ہچکی آئی
سی سی سی سی ، سُو سُو سُو سُو، کھُو کھُو کھُو کھُو کھان
ٹوٹ بٹوٹ کے گھر میں آئے دو چوہے مہمان
چوہوں کی حالت نہ پوچھو، ڈر کے بھاگ چوہے
پیچھے پیچھے ٹوٹ بٹوٹ تھا، آگے آگے چوہے
اب کیسی مہمانی یارو، اب کیسے مہمان
ٹوٹ بٹوٹ کے گھر میں آئے دو چوہے مہمان''(۳۰)

ہمارے روایتی کھانے بہت مزیدار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں اکثر مرچ مصالحے کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان مرچ مصالحہ تیز ہی کھاتا ہو۔ جیسے ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے تیز مرچ اور مصالحہ کھا کر بھاگ گئے۔ صوفی تبسم نے سی ،سُو، کھُو جیسے الفاظ کا بار بار استعمال کیا۔ نظم میں موسیقیت پیدا کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہاں ان الفاظ کا کوئی معانی نہیں بنتا۔ دوسری بات یہ کہ مہمان اگر ناراض ہو جائے یا اُسے کچھ پسند نہ آئے تو یہ میزبان کے لیے بہت پریشانی کی بات ہے۔ لہٰذا بچوں اور بڑوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مہمان نوازی کے تمام اُصولوں سے واقف ہوں بلکہ اخلاق کے وہ معیار بھی سیکھ پائیں جو مہمان نوازی کے لیے اہم ہیں۔

''ٹوٹ بٹوٹ بڑا ہشیار'' بچپن کی بھرپوری عکاسی کرتی نظم ہے۔ جس طرح عموماً بچے اپنے بچپن میں ضدی اور لڑاکا ہوتے ہیں، اپنی مرضی کرتے ہیں۔ اس نظم میں ٹوٹ بٹوٹ کو بھی بالکل ویسا ہی دکھایا گیا ہے۔ ہر کوئی اس کو جانتا ہے۔ اپنے غیر سب ٹوٹ بٹوٹ سے واقف ہیں۔ کیونکہ وہ ہر کسی سے دوستانہ رویہ رکھتا ہے۔ بڑا

چھوٹا سب اسے پسند کرتے ہیں۔

''بھائی بہنوں کو ترسائے　　جو مل جائے خود ہی کھائے
نقد ملے یا ملے اُدھار　　ٹوٹ بٹوٹ بڑا ہشیار
یوں تو سب سے لڑتا ہے　　ہاتھ لگے تو رو پڑتا ہے
کرتا ہے وہ چیخ پکار　　ٹوٹ بٹوٹ بڑا ہشیار''(۳۱)

بچے عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جو ملتا ہے، خود کھا لیتے ہیں اور دوسرے بہن بھائیوں کو نہیں دیتے۔ بچے اکثر بانٹنے اور مل جل کر کھانے کے جذبے سے دور بھاگتے ہیں۔ کچھ شاید اُن کا تقاضا بھی ہوتا ہے کہ ابھی یہ سب باتیں اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں اور وہ ہر چیز صرف اور صرف اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور خود تک محدود رکھتے ہیں اور دوسرے بچوں میں برداشت کا مادہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ دوسروں کو مارنا آسان لگتا ہے لیکن بچے پر جب خود مار کھانے کی باری آتی ہے تو رونا دھونا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا بچوں میں بہت شروع سے اخوت، بھائی چارہ، قربانی، ایثار اور محبت جیسے جذبات اور عادات پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہی بچے آگے چل کر ایک معاشرہ بنائیں گے اور مہذب معاشرے کی بنیاد تبھی رکھی جا سکے گی جب اس معاشرے کے بچوں کو شروع سے ہی اجتماعیت میں اچھے طریقے اور رویے رکھنا سکھایا جائے گا۔

دوسرا یہ کہ ٹوٹ بٹوٹ کو لالچی بچہ دکھایا گیا ہے جو پیسوں کے لالچ میں سبق سناتا ہے۔ بے شک بچے لالچی ہوتے ہیں۔ لیکن لالچ تو بُری بات ہے۔ لہٰذا کسی اچھی بات پر انعام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن لالچی ہونا بہت بُری بات ہے۔ اس لیے لالچ کی عادت نہ ڈالی جائے۔

''آنکڑا بانکڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ'' نظم کے عنوان سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ ٹوٹ بٹوٹ بڑا عجیب ہے۔

''شہر سے دور اک گاؤں ہے　　گاؤں کا نام دھوپ چھاؤں ہے
اس میں رہتے ہیں ٹوٹنے سارے　　ان میں سب سے بڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ
آنکڑا بانکڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ
باپ کی بات بھی نہیں سُنتا　　آپ کی بات بھی نہیں سُنتا
دوسروں سے تو لڑتا رہتا ہے　　مجھ سے بھی لڑ پڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ
آنکڑا بانکڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ''(۳۲)

ایک فرضی گاؤں کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہاں سب ہی چھوٹے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ٹوٹ بٹوٹ ہے۔ جانوروں کے ساتھ رہ رہ کر حرکتیں بھی اُن جیسی ہی کرتا ہے۔ دراصل ایسے بچے کا ذکر ہے جو اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ جیسے اپنے اردگرد کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اُس کی اپنی دنیا ہے۔ اپنی من مرضی کا مالک ہے۔ ماں باپ کی بات بھی نہیں مانتا۔ صرف وہ کرتا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ اس لیے ایسے عجیب وغریب بچوں کا ذکر ہے جو بے حد لڑاکا اور جھگڑالو ہونے کے ساتھ اپنی مرضی کرتے ہیں۔ ایسے بچوں سے نہ کوئی محبت کرتا ہے، نہ دوستی رکھتا ہے۔ بچوں کا با اخلاق ہونا بہت ضروری ہے اور ساتھ ہی بڑوں کی عزت اور احترام بھی ان پر فرض ہے۔

''پیارا ٹوٹ بٹوٹ'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی بھی تعریف کی ہے۔

''اللہ کی قدرت ہے نیاری — ہر اِک چیز ہے پیاری پیاری
سب سے پیارا ٹوٹ بٹوٹ — میرا پیارا ٹوٹ بٹوٹ
کوئی آدھا ٹوٹ بٹوٹ
کوئی پورا ٹوٹ بٹوٹ
میرا پیارا ٹوٹ بٹوٹ
کبھی تمہارے گھر میں جائے — کبھی ہمارے گھر میں آئے
کبھی تمہارا ٹوٹ بٹوٹ — کبھی ہمارا ٹوٹ بٹوٹ''(۳۳)

بے شک اللہ نے ہر شے بہت خوبصورت بنائی ہے۔ دنیا کا نظام بھی بڑا خوبصورت بنایا ہے۔ ہر شے دن یا رات، سورج، چاند، ستارے، دھوپ، چھاؤں اپنے مقررہ وقت پر آتے اور جاتے ہیں۔ بہترین موسم بنائے ہیں اور سب سے اعلیٰ تخلیق انسان یعنی اشرف المخلوقات کو بنایا ہے۔ ویسے تو اللہ کی بنائی ہر مخلوق اُس کی عظمت اور قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن سب سے بہترین مخلوق انسان ہے۔ اس نظم میں ٹوٹ بٹوٹ سے مراد صرف یہ کردار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کی عمر کا ہر وہ بچہ ہے جو اسی کی طرح ہے۔ جس کی حرکات اسی کے جیسی ہیں۔ پسند ناپسند بھی اسی کی طرح ہے جو سب کی آنکھ کا تارا ہے۔ جو جانوروں اور پرندوں سے محبت کرتا ہے یعنی ہر وہ بچہ جو اس کردار کو پسند کرتا ہے اور سمجھتا ہے وہ ٹوٹ بٹوٹ ہے اور یہ ایسے بچے ہیں جو ہر گھر میں کسی نہ کسی شکل اور نام کے ساتھ موجود

ہیں۔لیکن عادتوں میں سب ایک جیسے ہیں۔

''شعر کہنے لگا ہے ٹوٹ بٹوٹ'' شرارتی ٹوٹ بٹوٹ کے ایک اور نئے روپ پر ایک نظم ہے۔

''شعر کہنے لگا ہے ٹوٹ بٹوٹ
آج شاعر بنا ہے ٹوٹ بٹوٹ
باتیں کرنے کی اس کو عادت ہے
ورنہ اچھا بھلا ہے ٹوٹ بٹوٹ
شعر سُنتا ہے جب وہ جمن کے
شوق سے جھومتا ہے ٹوٹ بٹوٹ''(۳۴)

بچے عموماً وہی سیکھتے ہیں جو وہ اپنے سے بڑوں کو کرتا دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ اچھی بات یا عادت ہو یا بُری۔ وہ ویسا ہی پہننے کی کوشش کرتے ہیں جیسا اُن کے بڑے بزرگ یا بڑے بہن بھائی اُن کے سامنے کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بڑوں کو بچوں کے سامنے ہمیشہ اچھی مثال بننا چاہیے۔ نہ تو اُن کے سامنے لڑنا چاہیے۔ نہ ہی کوئی غلط بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ بچے بہت جلد نئی چیزیں اپنا لیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ یقیناً ٹوٹ بٹوٹ نے کسی بڑے کو شعر کہتے سُنا اور دیکھا ہے اور وہ اب ویسے ہی عینک لگا کر اُسی انداز میں شعر کہنے لگا ہے۔ ویسے تو ٹوٹ بٹوٹ پڑھائی سے دور بھاگتا ہے۔ سارا سال مشکل سے ہی وہ پڑھتا ہے اور نہ اُسے شعر کہنا آتا ہے۔ لٰہذا بچوں کے سامنے ہمیشہ اچھے کام کرنے چاہئیں تاکہ وہ بچپن سے ہی اچی باتیں سیکھ سکیں۔ کیونکہ بچے بڑوں سے ہی اثر لیتے ہیں۔

بچے ہمیشہ وہ کام کرتے ہیں جن سے اُن کو منع کیا جائے ''ٹوٹ بٹوٹ نے کھایا پان'' اس نظم میں اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ نے کھایا پان ٹوٹ بٹوٹ بڑا شیطان
گھر والوں نے روٹی کھائی قیمہ کھایا بوٹی کھائی
ٹوٹ بٹوٹ نے کھایا پان ٹوٹ بٹوٹ بڑا شیطان
منہ میں اُس کے دانت نہیں ہے پیٹ میں اُس کے آنت نہیں ہے
پھر بھی کھاتا جائے پان ٹوٹ بٹوٹ بڑا شیطان''(۳۵)

اکثر بچوں کی طرح ٹوٹ بٹوٹ کو بھی گھر کے کھانے میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اسی لیے جب گھر والوں نے قیمہ اور روٹی کھائی تو ٹوٹ بٹوٹ نے کھانا نہیں کھایا اور پان کھانے کو ترجیح دی۔ پان بالکل بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ بہت سے لوگ اپنی پان کھانے کی عادت کی وجہ سے منہ اور معدے کی مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ بچوں کے لیے تو نہایت ہی نقصان دہ ہے۔ بچوں کا اندرونی نظام ویسے ہی نازک ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی اشیاء کھانے سے منہ اور پیٹ دونوں کے خراب ہونے کا خدشہ ہے اور ایسی چیزیں انھیں دوگنا نقصان دیتی ہیں۔ ٹوٹ بٹوٹ نے یوں تو چھپ کر پان کھایا۔ لیکن جب کھانے کی میز پر سب کھانا کھانے میں مصروف تھے تو ٹوٹ بٹوٹ منہ کھولنے پر پکڑا گیا۔ ٹوٹ بٹوٹ کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اُسے سب شیطان کہتے ہیں۔ بچوں کو اس نظم سے نہ صرف گھر کے کھانے کی اہمیت کا اندازہ ہوگا بلکہ وہ باہر کی چیزوں کے مضر اثرات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی پتہ چلے گا کہ بڑوں سے چھپ کر کوئی بھی کام کرنا۔ اُن کی اجازت نہ لینا یا اُن کی بات نہ ماننا بہت بُری بات ہے۔ بڑوں کو بھی چاہیے کہ وہ بچوں کے سامنے ایسی اوٹ پٹانگ چیزوں سے اجتناب کریں تاکہ بچے بھی ایسی اشیاء کو کھانے کی غلطی نہ کریں۔

بچے جہاں کہیں بھی ہوں کسی بھی خطے یا علاقے سے ان کا تعلق ہو ان کا مزاج، عادتیں اور بچپن ایک سا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے تو صوفی تبسم کہتے ہیں۔ ''ہر جگہ ایک سا ہے ٹوٹ بٹوٹ''۔

''گرچہ چھوٹا بڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ
ہر جگہ ایک سا ہے ٹوٹ بٹوٹ
گیند بلے کا وہ کھلاڑی ہے
ٹیسٹ میں کھیلتا ہے ٹوٹ بٹوٹ
کام آتا نہیں ہے یاروں کے
کس مرض کی دوا ہے ٹوٹ بٹوٹ''(۳۶)

کہیں پہ ٹوٹ بٹوٹ چھوٹا ہے کہیں بڑا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عادتوں میں ہر جگہ ایک سا ہے۔ بلے اور گیند کا کھلاڑی ہے۔ دوستوں کی مدد نہیں کرتا۔ خودغرض ہے صرف خود کے بارے میں سوچتا ہوں۔ بہت کمزور ہے۔ نظر بٹو کا کام ٹوٹ بٹوٹ کرتا ہے کیونکہ خود کو اتنا صاف رکھتا ہی نہیں ہے کہ اُسے نظر لگ سکے۔ بچے ہمیشہ

کھیل کود میں مصروف اور خوش رہتے ہیں اور فٹ بال اور کرکٹ جیسے کھیل تو بہت پسند کرتے ہیں۔ کھیل میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ نہ کھانے پینے کا ہوش ہوتا ہے نہ پڑھنے لکھنے کی کوئی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی صفائی ستھرائی کا کوئی خیال رکھتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کو شروع سے ہی ایک نظم و ضبط اور با اُصول زندگی کا عادی بنائیں کہ کھیل کے وقت کھیلیں۔ پڑھنے کے وقت پڑھیں اور شروع سے ہی انھیں اچھی خوراک کا عادی بنائیں اور صاف ستھری زندگی گزارنا سکھائیں تا کہ انھیں اپنے نہانے، دانت صاف رکھنے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کی بچپن سے ہی سمجھ ہو۔

بچپن میں جو ایک سوال بچوں سے اکثر پوچھا جاتا ہے وہ یہ ہی ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟ اور بچے ہمیشہ ڈاکٹر، پائلٹ، فوجی یا اُستاد وغیرہ بننے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں یعنی مجموعی طور پر کسی نہ کسی شکل سب ہی افسر بننے کا خواب دیکھتے ہیں۔ ''ٹوٹ بٹوٹ ایک افسر ہے'' نظم بھی کسی ایسے خیالات کی عکاس ہے۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

''اب ٹوٹ بٹوٹ کی بات نہ کر
اب ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے
اب چھوٹوں کا تو ذکر ہی کیا
اب بڑے بھی سہمے رہتے ہیں
اب جو وہ منہ سے بات کرے
سب جی ہاں جی ہاں کہتے ہیں
اب ٹوٹ بٹوٹ کلرک نہیں
اب ٹوٹ بٹوٹ اِ ک افسر ہے''(۳۷)

جیسا کہ نظم میں بتایا جا رہا ہے کہ اب ٹوٹ بٹوٹ سے چھوٹے بڑے سب عزت سے پیش آتے ہیں۔ اب اُس کی کسی بات کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ اب ٹوٹ بٹوٹ کوئی معمولی کلرک نہیں رہا جسے گھر اور باہر سے باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ بلکہ اب وہ ایک افسر بن گیا ہے جس کی نہ صرف گھر میں بلکہ معاشرے میں بھی عزت ہے اور رُعب و دبدبہ ہے۔ اس سے ایک تو بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا مقصود ہے کہ وہ جب پڑھ لکھ جائیں گے تو انھیں

بہت اچھی نوکری ملے گی اور افسر بننے کا موقع ملے گا اور سب اُن کی عزت کریں گے۔ دوسرے اس سے معاشرے میں انسان کے مقام کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کی عزت کی وجہ اس کا نوکری میں رتبہ اور گریڈ ہوتا ہے یعنی معمولی کلرک کی نہ گھر میں عزت ہوتی ہے نہ باہر۔ لیکن ایک افسر بننے پر وہی گھر والے اور معاشرہ اس کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ اُس کے آگے بچھ بچھ جاتے ہیں اور اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ یہ شاید ایک طرح سے ہمارے معاشرے کے دوغلے پن کی بھی عکاسی ہے۔

''پہلے اِک کمرہ دفتر تھا
اب پورا بنگلہ دفتر ہے
ہر پھاٹک پہ چپڑاسی ہے
ہر دروازے پہ نوکر ہے
اب ٹوٹ بٹوٹ کلرک نہیں
اب ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے'' (۳۸)

وہی بات جب تک ٹوٹ بٹوٹ کلرک تھا تو ایک کمرے میں اس کا دفتر تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ افسر بنا۔ اُس کی ترقی ہوئی تو اس کے دفتر کو بھی ترقی مل گئی اور اب اُس کا دفتر پورے بنگلے پر محیط ہے اور ہر دروازے پر نوکر اور چپڑاسی ہر وقت اُس کے حکم کی بجا آوری کے لیے موجود ہیں یعنی جیسے ہی انسان کلرک سے افسر کی کرسی پر آتا ہے تو نہ صرف اس کی مراعات بڑھا دی جاتی ہیں بلکہ اُسے ہر طرح سے سکون اور آرام دینے کے لیے نوکروں کی ایک فوج بنا دی جاتی ہے۔ کیونکہ اب افسر کی بات ہو رہی ہے تو افسران کے ٹھاٹھ باٹھ بنگلوں سے کم نہیں ہوتے۔

جب تک انسان کلرک ہوتا ہے تو اس کی تنخواہ اتنی محدود ہوتی ہے کہ اُس کا گزارہ ہی مشکل سے ہوتا ہے۔ لہٰذا خود کو بہتر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ آمدن کم اور اخراجات ویسے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے دفتر جانے کے لیے وہی سادہ لباس اور کھلا جوتا ہوتا ہے اور دفتر پہنچنے کے لیے مقامی بسوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ لیکن افسر بننے کے بعد پیروں میں بوٹ آ جاتے ہیں اور سادہ لباس کی جگہ پتلون، شرٹ اور ٹائی آ جاتی ہے۔ اب دفتر جانے کے لیے خود کی موٹر سائیکل بھی ہے تو دھکے کھانے کی کیا ضرور ہے۔ اس نظم میں سمجھنے اور سوچنے کے لیے بہت سے اہم نکات ہیں۔ اس نظم میں معاشرے کے ان دو کرداروں کی آسانی سے پہچان ہو

سکتی ہے جو اپنی نوکری کی وجہ سے ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوئے دو الگ رویوں کا سامنا کرتے ہیں۔ ایک کردار تو وہ ہے جو عام سا کلرک ہے جس کا پہننا، اوڑھنا، رہن سہن بھی سادہ سا ہے اور دوسری طرف عمدہ لباس، عمدہ خوراک، عمدہ رہن سہن اور سہولیات سے بھرپور زندگی کا مالک ایک افسر ہے۔ اب معاشرہ کلرک کو وہ عزت نہیں دیتا جو ایک افسر کو دیتا ہے۔ دونوں کا الگ الگ مقام ہے۔ایک کی عزت زیادہ ہے تو نوکری کی وجہ سے اور ایک کی عزت کم ہے تو وہ بھی اس کی معمولی نوکری کی وجہ سے۔ انسان کا بااخلاق ہونا یا اچھا ہونا یا اچھا ہونا اس میں کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف ظاہری نمود ونمائش عزت میں اضافے یا کمی کا باعث بنتی ہے۔ حالانکہ ایسی باتیں بچوں کو بتانا یا سکھانا درست نہیں ہے۔لیکن یہ بھی بہرحال معاشرے کا ایک رُخ ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔

'رس بھرا مالٹا ہے ٹوٹ بٹوٹ' میں صوفی تبسم ٹوٹ بٹوٹ کی ظاہری خوبصورتی اور خدوخال بیان کر رہے ہیں۔

گول اور سرخ سا ہے ٹوٹ بٹوٹ
رس بھرا مالٹا ہے ٹوٹ بٹوٹ
جب وہ پیدا ہوا تو ٹوٹ ہی تھا
دوسرے دن بنا ہے ٹوٹ بٹوٹ
اصل میں وہ تو اِک لڑکی تھا
یونہی لڑکا بنا ہے ٹوٹ بٹوٹ"(۳۹)

بچے سب کو ہی اچھے لگتے ہیں۔ اُن کی معصومانہ حرکتوں اور باتوں پر سبھی کو پیار آتا ہے اور گھر کے بڑے بچوں کو اُن کی شرارتوں یا ظاہری خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے اُن کا کوئی نہ کوئی پیار کا نام رکھ دیتے ہیں۔ بچہ اپنے ساتھ بہت سے نئے رشتے لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ جیسے دادا، دادی، نانا، نانی، چاچو، ماموں، پھوپھو، خالہ، تایا وغیرہ اور یہ سارے ہی رشتے بچے پر اپنا حق جتاتے ہوئے اسے اپنی پسند کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ جیسے چندا، پپو، بھولو، گولو، مولو وغیرہ جیسے نام رکھے جاتے ہیں اور یہ اُن کی طرف سے محبت کا بے پناہ اظہار کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس نظم میں ٹوٹ بٹوٹ کو رس بھرا "مالٹا" کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں مالٹے جیسا سرخ وسفید اور خوبصورت ہے اور اتنا پیارا اور نازک ہے کہ لڑکی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔گھر میں موجود جتنے بھی بچے ہیں اُن میں سب سے بڑا اور پیارا ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کا ٹیلی فون'' یہ اپنے زمانے کی ایک ایجاد یعنی ٹیلی فون سے متعارف کرائی۔ ایک نظم سے ٹیلی فون ایک دوسرے سے رابطے کا بہترین مواصلاتی ذریعہ ہے۔ میلوں دور بیٹھے اپنے پیاروں کو گفتگو کے ذریعے ملانے کا ایک بہترین نظام ہے۔

''دور رہو تو شور مچائے
پاس آؤں تو چپ ہو جائے
بڑا انوکھا بڑا نرالا
عجب طرح کا ٹیلی فون
ٹوٹ بٹوٹ کا ٹیلی فون''(۴۰)

بڑے ہی خوبصورت انداز میں ٹیلی فون کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ جب دور ہوں تو شور مچاتا ہے یعنی جب کسی کا فون آتا ہے تو اس کی گھنٹی بجتی ہے اور جب فون کو سُن لیا جائے تو یہ چپ ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب طرح کا ٹیلی فون ہے کیونکہ یہ ٹوٹ بٹوٹ کا ہے۔ دیکھنے میں بالکل خاموش ہے۔ نہ کچھ بولتا ہے اور نہ سُنتا ہے۔ گونگا بہرہ ہے۔ نئی ایجادات ہمیشہ حیران کن ہی ہوتی ہیں۔ اس نظم میں بھی اسی دور کی بات ہو رہی ہے۔ جب ٹیلی فون کی بھی ایجاد ہوئی تھی اور دیکھنے والوں کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ کیسی ایجاد ہے کہ جو میلوں دور بیٹھے لوگوں سے بات کراتی ہے اور اُن کا فون آنے پر بھی شور مچاتی ہے اور ویسے خود سے نہ کچھ بولتا ہے، نہ سُنتا ہے۔

''کوئی بھی نہ کام کرے وہ
سارا دن آرام کرے وہ
بارہ سو تنخواہ ہے اُس کی
اتنا مہنگا ٹیلی فون
ٹوٹ بٹوٹ کا ٹیلی فون''(۴۱)

چونکہ ٹیلی فون صرف ایک مواصلاتی آلہ ہے جو دوسرے سے رابطے میں آسانی پیدا کرتا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا کام نہیں اور جب فون کا استعمال ہوگا تو یقیناً اس کا بل بھی آئے گا جو کہ اکثر کی طبیعت پر گراں گزرے گا۔ اس لیے اس بات پر اعتراض کیا جا رہا ہے کہ اتنا مہنگا ٹیلی فون رکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اس سے نہ تو گھر کی خوبصورتی میں کوئی اضافہ ہو رہا ہے نہ کوئی اور فائدہ۔ لیکن اعتراض سے برعکس ٹیلی فون اپنے دور

کی بہترین ایجاد ہے جسے گراہم بیل نے ایجاد کیا تھا اور یقیناً اسی ایجاد کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا سمٹ گئی ہے۔ کسی بھی ملک سے کسی بھی علاقے سے ہم اس کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی ایجادات کبھی بے مقصد نہیں ہوتیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے یعنی اس چیز کی ضرورت تھی تو یہ ایجاد ہوگئی۔

جب بھی کوئی چیز نئی ایجاد ہوتی ہے تو شروع شروع میں وہ سادہ ہی ہوتی ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں اور ارتقا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شروع میں ٹیلی فون صرف ایک ہی رنگ کے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت بدلا ٹیلی فون کا رنگ اور ساخت بھی تبدیل ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ لیکن جہاں آسائش کی بات ہوتی ہے۔ وہاں پر پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ نظم کے آخر میں اسی بات کا شور ہے کہ ٹیلی فون نے ٹوٹ بٹوٹ کی ساری کمائی کھالی ہے اور یہ بہت لٹیرا ٹیلی فون ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے برعکس ٹیلی فون نے ہماری زندگیوں کو بہت حد تک آسان کر دیا ہے۔ ورنہ پہلے اگر کوئی پیغام کسی کو پہنچانا ہوتا، کوئی اچھی، بُری خبر دینا ہوتی تو تار بھیجی جاتی یا خط لکھے جاتے تھے اور جن کے پہنچنے میں کافی وقت اور دن درکار ہوتے تھے۔ اب ادھر کوئی بات ہوئی اُدھر فوراً فون پر پہنچا دی گئی۔ لہٰذا اس ایجاد کا شکرگزار ہونا چاہیے اور بچوں کو ایسی ایجادات کا علم ہونا ضروری ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ کی دانائی'' ہلکے پھلکے انداز میں ایک بہت اہم پیغام دیتی ہوئی نظم ہے۔

''ٹوٹ بٹوٹ بڑا دانا ہے ٹوٹ بٹوٹ کی بات سُنو
ٹوٹ بٹوٹ کی ایک مرغی ہے اس مرغی کے چوزے دو
ان دو چوزوں کا کیا کہنا اچھی اچھی چیزیں کھانا
چوں چوں کرنا اور خوش رہنا ادھر سے آئیں، اُدھر کو جائیں
اس کے اِک ہمسائے نے بھی گھر میں رکھی ہے اِک مرغی
لیکن دُبلی پتلی مریل مرغی کے ہیں چوزے آٹھ
گھر میں کوئی چیز نہیں ہے خالی چوزوں کا ہے ٹھاٹھ
جب کچھ اُن کے ہاتھ نہ آئے کرتے ہیں وہ ہاتھا پائی
ہوتی ہے دن رات لڑائی میرے اللہ تیری دہائی''(۴۲)

یہاں واضح اشارہ چھوٹے اور بڑے کنبے کی طرف ہے اور ان کے فوائد اور نقصانات کا ذکر ہے کہ جہاں

بچے کم ہوتے ہیں وہاں نہ صرف گھریلو سکون ہوتا ہے بلکہ خوشحالی کا بھی راج ہوتا ہے اور ہر طرح کی آسائش اس گھر کے رہنے والوں کو میسر ہوتی ہے لیکن دوسری طرف جہاں بے شک بچے تو زیادہ ہیں لیکن ان بچوں کے مقابلے میں آسائشیں اور ضروریات زندگی بالکل ناپید ہیں یعنی آمدن کم اور اخراجات زیادہ ہیں۔ نتیجہ گھر میں بے سکونی اور ہر وقت کی لڑائی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہمسائے کی بات چھوڑو اپنی بات کرو۔ یعنی دوسروں کے معاملوں کو دیکھنے یا دوسروں کی ٹوہ (تجسس) میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے کام سے کام رکھے۔ دوسروں کے گھروں میں جھانکنے سے بہتر ہے کہ اپنے گھر کو سنوارنے کی کوشش کرے۔ بچوں کو اس سے یہ سیکھنے کو ملے گا کہ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی تجسس رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ہمارے دین میں بھی منع کیا گیا ہے۔

''گاؤں میں آ گیا ہے ٹوٹ بٹوٹ'' اس نظم میں اُس ٹوٹ بٹوٹ کا ذکر ہو رہا ہے جو کہ محنتی ہے اور دن رات کام کرتا ہے اور لوگ اب اس کی عزت کرتے ہیں۔

''صبح کرتا ہے شام کرتا ہے
اب وہ دن رات کام کرتا ہے
اب بڑے کام کا ہے ٹوٹ بٹوٹ
گاؤں میں آگیا ہے ٹوٹ بٹوٹ
گاؤں والے جو کام کرتے ہیں
پہلے اس کو سلام کرتے ہیں
چوہدری بن چکا ہے ٹوٹ بٹوٹ
گاؤں میں آگیا ہے ٹوٹ بٹوٹ''(۴۳)

ٹوٹ بٹوٹ اب پہلے جیسا لاأبالی اور جھگڑالو نہیں رہا۔ بلکہ اب وہ دن رات کام کرتا ہے۔ گاؤں والے بھی اس کی بہت عزت کرتے ہیں اور ہر کام کرنے سے پہلے اس سے صلاح اور مشورہ لیتے ہیں۔ اسی لیے ٹوٹ بٹوٹ اب گاؤں کا چوہدری بن چکا ہے۔ محنت میں ہی عظمت اور عزت ہے اور اسی سے انسان کو معاشرے میں باعزت مقام ملتا ہے۔ لوگ اس کی قدر کرتے ہیں جو کہ کام کرتا ہو۔ نکھٹو اور ناکارہ انسان کی نہ گھر میں عزت ہوتی

ہے اور نہ ہی معاشرہ اسے کوئی مقام دیتا ہے۔

موٹر کار چلانے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ بٹوٹ پہلے شہر میں رہتا تھا اور اب وہ واپس گاؤں میں لوٹ آیا ہے اور یہیں پر مکمل سکونت اختیار کر چکا ہے اور گاؤں کی زندگی کے سارے طور طریقے بھی اپنا چکا ہے۔ اس لیے اب وہ ہل چلاتا ہے۔ ہر کوئی آپس میں مل جل کر پیار محبت سے رہتے ہیں اور سارا گاؤں ایک ایسا ہے۔ ایک گھرانہ یا خاندان محسوس ہوتا ہے۔ جہاں سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ شہر کی زندگی میں بے شک بہت سہولیات ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود شہر کی زندگی سے کہیں زیادہ بہتر گاؤں کی زندگی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب لوگ شہر کی زندگی کو اہمیت دینے لگے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے علاقے چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہونے لگے ہیں۔ لیکن اکثر جب وہ شہر کی گہما گہمی میں کھو کر اور شہر کی زندگی کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تھک جاتے ہیں تو پھر سے انھیں اپنے اُسی سرسبز شاداب کھیتوں اور گاؤں کی یاد ستانے لگتی ہے او رپھر اکثر لوگ واپس چلے جاتے ہیں اور اپنی زمینوں پر ہی کام کر کے ایک پُرسکون زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ شہر کی زندگی میں بلاشبہ بہت چمک دمک ہے، سہولیات ہیں۔ لیکن اُسی قدر مشکلات بھی ہیں اور گاؤں کی زندگی جس قدر سادہ ہے اُسی قدر آسان اور پُرسکون ہے۔ جہاں سب ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ جہاں حسد، لالچ اور آگے بڑھنے کی دُھن نہیں ہوتی اور زندگی مادیت پرستی سے خالی ہوتی ہے۔ صرف محبت، خلوص اور سچائی ہوتی ہے۔

بچپن میں کھیلنے اور شرارتوں کے علاوہ ایک اور شوق جو ہر بچے میں حددرجہ پایا جاتا ہے، وہ گھر سے باہر سیر کرنے جانا ہوتا ہے۔ کسی بھی باغ یا پارک میں یا کسی رشتہ دار کے گھر جانا بھی اس میں شامل ہے۔ کیونکہ گھر سے باہر جا کر بچے خود کو بہت آزاد محسوس کرتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہ نہ صرف گھومتے پھرتے ہیں بلکہ بہت کچھ نیا سیکھتے ہیں۔ ''آؤ آؤ سیر کو جائیں'' اسی سلسلے کی ایک نظم ہے۔

''آؤ آؤ سیر کو جائیں
باغ میں جا کر شور مچائیں
اُچھلیں، کودیں، ناچیں گائیں
آؤ آؤ سیر کو جائیں

کالے کالے بادل آئے
جھوم جھوم کر سر پر چھائے
مینہ برسے گا خوب نہائیں
آؤ آؤ سیر کو جائیں" (۴۴)

گھر میں بچے جتنا مرضی کھیلیں لیکن اُنھیں کچھ حدود کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ جس میں دوسروں کے سونے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی پڑھنے اور کھیلنے کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے۔ حد سے زیادہ شور شرابے پر بھی پابندی ہوتی ہے اور بچوں میں اس عمر میں بہت زیادہ اُچھلنے، کودنے اور شور شرابے کی عادت ہوتی ہے۔ جسے قابو میں رکھنا مشکل ہے۔ اس نظم میں اسی بات کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ باغ ایک ایسی جگہ ہے جہاں جا کر وہ خوب کھیل کود اور شور مچا سکتے ہیں اور جہاں اُنھیں اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بچے گھروں سے باہر نکلیں، اس سے نہ صرف ان کی جسمانی صحت بلکہ ذہنی نشوونما پر بھی بے حد مثبت اثرات پڑیں گے۔ باغ میں جا کر وہ قدرت کے حسین نظاروں سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔ خوبصورت پھول اور حسین رنگ اللہ کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ساتھ ہی بارش میں نہائیں گے اور اللہ کی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کرنا سیکھیں گے۔

"آؤ مل کر کام کریں" بے حد سبق آموز نظم ہے جس میں مل کر کام کرنے کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔

"آؤ مل کر کام کریں
آؤ مل کر کام کریں
دولت وہ جو سب کی دولت
عزت وہ جو سب کی عزت
مل کر پیدا نام کریں
آؤ مل کر کام کریں" (۴۵)

کسی بھی قوم کی ترقی کا دارو مدار اس کے افراد کی محنت پر ہے۔ اگر قوم محنت کرے گی تو تبھی وہ ترقی کرے گی اور دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کرے گی اور مل کر کام کرنے میں برکت بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔

محنت کرنے والوں کو اللہ کی ذات بھی بے حد پسند کرتی ہے۔قومیں خود سے اونچائی پرنہیں پہنچی۔انھیں اونچا مقام دینے کے لیے افراد کو ہی محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ دن رات کی انتھک محنت کرنے والوں کا مقدر کامیابی بنتی ہے۔ بچوں کو یہی سکھایا جا رہا ہے کہ مل جل کر کام کرنے میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ ساتھ ہی دوسروں کی عزت بھی کریں۔ اُن کی عزت کو بھی اپنی عزت ہی سمجھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ عزت سے پیار سے مل جل کر رہیں۔محنت کریں اور ساری دنیا میں عزت حاصل کریں اور قائداعظم بھی ہمارے لیے یہی پیغام دے کر گئے ہیں کہ پاکستان بنانے میں جو محنت کرنا پڑھی ، اب اُس سے دگنا محنت اس کو کامیابیوں کی اونچائی تک پہنچانے کے لیے کرنا پڑے گی اور کام، کام اور صرف کام کو اپنا نصب العین بنالیں۔

اس دنیا میں آنے کے بعد جب بچہ آنکھ کھولتا ہے تو اُس کے لیے ہر شے، ہر نظارہ، ہر منظر بالکل نیا اور حیران کردینے والا ہوتا ہے۔ وہ نئی نئی چیزیں سیکھتا اور دیکھتا ہے۔ نئے ذائقے چکھتا ہے۔نئی خوشبوئیں سونگھتا ہے۔ خزاں، بہار، گرمی ، سردی جیسے بدلتے موسم دیکھتا ہے۔ دھوپ اور چھاؤں میں موجود فرق کو محسوس کرتا ہے۔ نیز ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ کچھ انوکھا تجربہ سیکھتا اور کرتا ہے۔''بادل، موسم بہار، بادلوں سے، آیا بسنت میلا''۔ بچوں کے ایسے ہی کچھ نئے تجربات اور محسوسات کی عکاسی کرتی نظمیں ہیں جن کا یہاں باری باری ذکر اور جائزہ لیا جائے گا۔

''کالے بادل آئیں گے
آکر مینہ برسائیں گے
مینہ میں لوگ نہائیں گے
کالے بادل آئیں گے
مینہ برسے گا ٹپ ٹپ ٹپ
ساز بجے گا ٹپ ٹپ ٹپ
ہم ناچیں گے گائیں گے
کالے بادل آئیں گے''(۴۶)

گرمی کی حدت اور شدت جہاں انسانوں، جانوروں، چرند، پرند کو متاثر کرتی ہے، وہیں یہ بچوں کی خوشیوں کو بھی پھیکا کر دیتی ہے۔ گرمی میں جہاں ہر شے اداس اور ویران ہو جاتی ہے۔تبھی کالے بادل اور ٹھنڈی

خوشگوار ہوائیں سب کے ویران چہروں کو چمکا دیتی ہیں اور بچوں کے لیے تو مانو یہ عید کی سی خوشی کا سماں ہوتا ہے۔ بارش میں بچے ، بڑے میاں سب خوب نہاتے ہیں۔ وہیں بچے بارش کے ساتھ شور بھی مچاتے ہیں اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک جہاں بچوں کو تھوڑا ڈراتی ہے وہیں بارش کی تیزی اور بہتا پانی اُن کو اندر تک خوشی سے سیراب کر جاتا ہے۔

''آیا آیا ہے موسم بہار کا
آیا آیا ہے موسم بہار کا
کلیاں کھلنے لگیں، مسکرانے لگیں
چڑیاں اُڑنے لگیں، چہچہانے لگیں
کتنا اچھا ہے موسم بہار کا''(۴۷)

بہار کا موسم کسے پسند نہیں آتا۔ بچے، بڑے، بزرگ سب ہی اس موسم کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ ہر طرف کھلے ہوئے رنگ برنگے پھول، پھیلی ہوئی خوشبو اور سرسبز و شاداب ہریالی جہاں آنکھوں کو سکون دیتی ہے وہیں دماغ کو بھی ایک خوشگوار تازگی کا احساس دلاتی ہے۔ چرند پرند بھی اس موسم میں خوب شور مچارتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بہار کے موسم میں بچے باغوں کا رُخ کرتے ہیں اور کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی بنائی ہوئی خوبصورت دنیا کے نظاروں سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہار میں قدرت کی بنائی ہر شے اور تمام مخلوق خوش نظر آتی ہے۔

''بادلو، آج مینہ نہ برساؤ
میرے ننھے کو آج کھیلنے دو
کل کو جس وقت چاہو آ جاؤ''(۴۸)

بے شک برسات کا موسم اپنے ساتھ بہت سے خوبصورت نظارے لے کر آتا ہے۔ ہر طرف ہریالی اُگ آتی ہے۔ درخت اور پودے دُھل جاتے ہیں۔ آسمان اور ہوا سب صاف شفاف ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ برسات فصلوں کے لیے بھی بے حد فائدہ مند ہوتی ہے۔ جہاں اس برسات کے بے شمار فوائد ہیں، وہاں بچوں کے لیے ایک دُکھ کا سبب بھی ہے۔ کیونکہ برسات کا موسم اور بارش کئی دنوں پر محیط ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچے

گھروں میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نہ کھیل کود کے لیے باہر نکل سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے دوستوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اکثر بچے اس برسات کی وجہ سے اداس ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی اسی کیفیت کو اس مختصر سی نظم میں بیان کیا گیا ہے اور بادلوں سے درخواست کی جارہی ہے کہ آج نہ برسو اور آج بچوں کو کھیلنے دو اور کل کسی بھی وقت آجانا۔ بچوں کی اُداسی کو اُنہی کے انداز میں دور کرنے اور دل بہلانے کی یہ نہایت ہی خوبصورت کوشش ہے۔

"آیا بسنت میلا، مُنّا پھرے اکیلا
کچھ لوگ آ رہ ہیں، کچھ لوگ جا رہے ہیں
کچھ دیکھتے ہیں میلا، مُنّا پھرے اکیلا
لوگوں کے پاس موٹر
کرتی پھرے ہے ٹرٹر
مُنے کے پاس ٹھیلا، مُنّا پھرے اکیلا
اَبّا نہ دے اکنی، امی نہ دے دھنی
پیسا ملے نہ دھیلا، مُنّا پھرے اکیلا"(۴۹)

بہار کا موسم جب آتا ہے تو یہ اپنے ساتھ بے شمار خوبصورت رنگ لے کر آتا ہے۔ چونکہ یہ سردیوں کے ختم ہونے کا پیغام لاتا ہے۔ لہٰذا ہر شے کھلی کھلی اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ درختوں پر پتوں کی بہار ہوتی ہے۔ بہار کے موسم میں پہلے پہل میلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جہاں دور دراز سے لوگ میلے دیکھنے آتے تھے۔ میلوں میں بچوں اور بڑوں سب کی دلچسپی کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام ہوتا تھا اور ان میلوں کا بڑی بے صبری سے انتظار ہوتا تھا۔ تب اکنی اور دھنی کا دور تھا اور پیسے اور دھیلے سے کام چلتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان میلوں کی چمک دمک ماند پڑنے لگی۔ زمانے کی ترقی نے ان میلوں کو دور کہیں ماضی کے دھندلکوں میں کھو دیا ہے۔ اب بسنت میلوں کی جگہ پتنگ بازی جیسے خطرناک کھیل نے لے لی ہے۔ اب میلوں کے میدان ویران ہو گئے ہیں اور گھروں کی چھتیں آباد ہو گئی ہیں۔ اب بہار کے موسم میں پتنگ بازی کو باقاعدہ ایک تہوار کی حیثیت دے دی گئی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کھیل خطرناک سے خطرناک ترین ہوتا جا رہا ہے۔ جس سے سینکڑوں لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ہر سال جانی و مالی نقصان کے باوجود یہ کھیل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے اور میلوں کے میدان اور میلے اب خالی پڑے ہیں۔ جن

میں مُنّا اکیلا ہی گھوم رہا ہے۔ یعنی بچوں کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیاں اب ماند پڑ گئی ہیں۔

چاند اور بچے کی دوستی پُرانی ہے۔ اس دوستی اور محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چاند کو بچے پیار سے چندا ماما کہتے ہیں۔ خُدا کی قدرت کے یہ نظارے جہاں بڑوں کو خیرہ کرتے ہیں وہیں بچوں کے لیے یہ ان کے دوست ہوتے ہیں اور چاند سے باتیں کرنا بچوں کا مشغلہ بھی ہے۔

”آہا آہا نکلا چاند
کیسا اچھا پیارا چاند
دن کی طرح سے رات بھی چمکی
سورج بن کر آیا چاند
آہا آہا نکلا چاند
کیسا اچھا پیارا چاند“(۵۰)

چاند جہاں دیکھنے میں خوبصورت لگتا ہے۔ وہیں روشنی دینے کا کام بھی کرتا ہے۔ دن کے وقت سورج کی روشنی سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور رات کے وقت اس کی جگہ چاند لے لیتا ہے۔ بچے چاند کو دیکھ کر جہاں بے حد خوش ہوتے ہیں، وہیں وہ خُدا کی قدرت دیکھ کر حیران بھی ہوتے ہیں۔ رات کو تاروں بھرے آسمان میں چاند ایک عجیب ہی دلفریب منظر پیدا کرتا ہے۔ جو سب کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بچے اکثر چیزوں میں تقسیم پیدا کر لیتے ہیں کہ یہ میری ہے اور وہ تمہاری ہے۔ لیکن چاند کے معاملے میں کوئی تقسیم نہیں ہوتی بلکہ چاند تو سب کا پیارا دوست ہوتا ہے۔ بڑے خوبصورت انداز سے بچوں کی چاند سے محبت اور انسیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

یہی محبت کا معاملہ تاروں کے ساتھ بھی ہے۔ بچے تاروں سے بھی چاند جیسا لگاؤ رکھتے ہیں۔

”رات آئی اور جاگے تارے
گول مٹول اور موٹے موٹے
چپکے چپکے ہنستے رہنا
سارے ان کے کام ہیں نیارے
لاکھ پکارو لاکھ بلاؤ
کبھی نہ آئیں پاس تمہارے

ننھے مُنے چھوٹے چھوٹے
آ بیٹھے ہیں مل کر سارے
سب کچھ آنکھوں میں ہی کہنا
رات آئی اور جاگے تارے
لاکھ کہو تم آؤ آؤ
رات آئی اور جاگے تارے“(۵۱)

آسمان پر چمکتے یہ چھوٹے چھوٹے تارے بے حد خوبصورت لگتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تاروں کی کوئی محفل جمع ہوئی ہو۔ دن کی تیز روشنی میں تارے موجود تو ہوتے ہیں لیکن سورج کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اُس میں تاروں کی چمک مانند پڑ جاتی ہے۔ بچوں کی نظر میں یہ ہے کہ یہ تارے دن کی روشنی میں سو جاتے ہیں۔ کیونکہ ساری رات جاگ جاگ کر وہ بھی تھک جاتے ہیں۔ دور سے دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ تارے مسکرا رہے ہوں اور اشاروں اشاروں میں کوئی بات کہہ رہے ہوں۔ اکثر بچے ان تاروں کو گننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ کوئی بھی انھیں گن نہیں سکتا۔ ہاں ان تاروں کو گنتے ہوئے نیند بہت پیاری آ جاتی ہے۔ بچے ان تاروں سے نہ صرف باتیں کرتے ہیں بلکہ ان کو پکارتے بھی ہیں۔ لیکن یہ ایسے تارے ہیں کہ نہ تو ان کی کوئی آواز آتی ہے اور نہ ہی یہ کسی کے پاس آتے ہیں۔ دراصل یہ تارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک حسین شاہکار ہیں۔ پہلے وقتوں میں ان تاروں سے راستوں کی سمت کا بھی اندازہ کیا جاتا تھا اور یوں مسافر اپنی منزل پر بآسانی پہنچ جاتے تھے۔ خیر تاروں کا جو بھی کوئی مقصد ہو لیکن بچوں کے لیے یہ ایک بے حد انوکھی اور بہت ہی خوبصورت شے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بے حد خوبصورت نظام بنایا ہے۔ ہر شے اپنے اپنے وقت کے دائرہ کار میں گھوم رہی ہے اور یوں کائنات کا یہ نظام بڑے ہی اچھے انداز سے جاری و ساری ہے۔ دن رات، چاند، سورج، ستارے، بارش، بادل، موسم کی تبدیلی، دھوپ، چھاؤں، ہوائیں، آندھیاں، طوفان غرض یہ کہ ہر ایک تخلیق بے حد خوبصورت اور کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے اپنے مقررہ وقت پر آتی اور جاتی ہے۔

”کیسے اللہ نے بنائے رات دن — کیسی حکمت سے سجائے رات دن
صبح آئی تو اُجالا آ گیا — شام آئی تو اندھیر چھا گیا
دن ہوا تو لوگ سارے جاگ اُٹھے — رات آئی چاند تارے جاگ اُٹھے
دن بنا ہے کام کرنے کے لیے — رات ہے آرام کرنے کے لیے
کوئی ہو انسان یا حیوان ہو — جانور ہو یا کوئی بے جان ہو
رات ان کے ڈھنگ ہی کچھ اور ہیں — رات ان کے رنگ ہی کچھ اور ہیں

دن ہوا سب کام کرنے لگ گئے
شب ہوئی آرام کرنے لگ گئے“ (۵۲)

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر شے ہی بہت بہترین بنائی ہے۔ کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ بے شک وہ بنانے والا سب سے عظیم ہے۔ اس نے دن رات کا نظام بھی بہت بہترین بنایا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہر طرف روشنی چھا جاتی ہے اور سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکنا شروع کر دیتا ہے اور جیسے ہی شام کے سائے پھیلنے لگتے ہیں تو سورج غروب ہو جاتا ہے اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن پھر اسی اندھیرے کو کم کرنے کے لیے آسمان چاند اور ستاروں سے سج جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دن کام کرنے کے لیے بنایا اور رات آرام کرنے اور عبادت کرنے کے لیے بنائی تاکہ دن میں رزق تلاش کریں اور رات میں رزق عطا کرنے والے کو تلاش کریں۔ دن کے وقت انسان، حیوان، چرند، پرند سب اپنی اپنی زندگی کے لحاظ سے کام میں مصروف رہتے ہیں اور جیسے ہی رات ہو جاتی ہے انسان اپنے گھروں کو اور جانور اور پرندے اپنے گھونسلوں اور ڈربوں میں واپس آ جاتے ہیں۔ یوں دن بھر کام کر کے جب سب تھک جاتے ہیں تو رات کے وقت خوب آرام کر کے اگلے دن کے لیے پھر سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ بے شک اللہ پاک کی ہر نعمت ہی لاجواب ہے۔ اگر وہ ذات رات نہ بناتی تو ہم سب انسان، جانور کام کر کر کے ہی تھک جاتے اور آرام نہ کر پاتے۔ لیکن وہ بنانے والی ذات ہر چیز اور ضرورت سے واقف ہے۔ اسی لیے اُس ذات نے دن اور رات کا خوبصورت امتزاج بنایا تاکہ ہم اُس کا شکر ادا کر سکیں۔

اپنے ملک سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور جس جگہ اس کی جڑیں ہوتی ہیں۔ اس جگہ سے محبت اور انسیت فطری جذبہ ہے اور جس قدر محبت وطن سے ہوتی ہے۔ اُسی قدر محبت اور عزت اُس ہستی کی ہوتی ہے جو اس ملک کا بنانے والا ہو۔ پاکستان ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے۔ جس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ جس میں ہم سب آزادی سے زندگی گزار رہے ہیں اور اس آزاد ملک کا تحفہ دینے والوں میں دو نام ایسے ہیں جو کبھی بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان دونوں ہستیوں کے بغیر یہ ملک بننا ناممکن تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح، بانی پاکستان اور علامہ محمد اقبال، مفکر پاکستان اور شاعر مشرق۔ یہ دونوں وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کا خواب دیکھا بلکہ اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتھک محنت کی اور اب انہی دونوں عظیم ہستیوں سے متعلق صوفی تبسم کی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا۔ سب سے پہلے بانی پاکستان کا ذکر ہوگا اور پھر مفکر پاکستان کا ذکر کیا جائے گا۔

''تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا
تازہ ہے جاں ہماری دل ہے جواں ہمارا
تیری ہی ہمتوں سے آزاد ہم ہوئے ہیں
خوشیاں ملی ہیں ہم کو دل شاد ہم ہوئے ہیں
تجھ سے ہی لہلہایا یہ گلستان ہمارا
ہم سو رہے تھے تُونے آکر ہمیں جگایا
پھرتے تھے ہم بھٹکتے رستہ ہمیں دکھایا
تو رہنما ہمارا تو پاسبان ہمارا''(۵۳)

برصغیر پاک وہند پر جب برطانیہ کا تسلط قائم ہوا تو وہاں رہنے والے مسلمان جو کہ کبھی حاکم ہوا کرتے تھے محکوم بن گئے۔ مالی لحاظ سے مضبوط مسلمان، انگریزوں کے دورِ اقتدار میں بے حد کمزور اور غربت کے شکنجے میں آگئے۔ مسلمانوں پر زندگی اور زمین جب دونوں تنگ ہوگئیں اور ہر طرف مایوسی کے سائے لہرانے لگے تو اُس وقت میں محمد علی جناح جیسے ہمدرد انسان نے مسلمانوں کو حوصلہ دلایا اور انھیں ہمت دلائی کہ ہمیں اپنے لیے ایک علیحدہ ملک بنانا ہے۔ مسلمان جو کہ حالات سے تھک ہار کر سو رہے تھے۔ انھیں نہ صرف جگایا بلکہ ان میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ انھیں جینے کا ایک مقصد دیا۔ قائداعظم کی ہی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ خوبصورت ملک پاکستان ہمارا اپنا ملک ہے۔ مسلمان جو بے یارو مددگار تھے جو محکوم تھے، مظلوم تھے آج وہ ایک آزاد فضا کے باسی ہیں اور یہ قائداعظم کی رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان، انگریزوں اور ہندوؤں کے سامنے ڈٹ گئے اور ایک علیحدہ اسلامی فلاحی ریاست قائم کرکے دم لیا۔ آج دنیا میں جو عزت اور مقام ہمیں ملا ہے وہ قائداعظم محمد علی جناح ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اگر رہنما سچا ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔

''دیس کی آن قائداعظم
دیس کی شان قائداعظم
ہم کبھی بھی بھلا نہیں سکتے
دیس کی جان قائداعظم
تونے دکھ درد سارے دور کیے
تونے ہم سب کو سرخوشی بخشی
اپنے اس دیس کو کیا آباد
قوم کو تازہ زندگی بخشی
ہم کبھی بھی بھلا نہیں سکتے
تیرا احسان قائداعظم''(۵۴)

قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان بنانے کے لیے جس قدر محنت اور جدوجہد کی ہے۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں محمد علی جناح کو عزت کی نظر نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور یہ قائداعظم کا ہم سب پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس قدر مشکل حالات میں مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا۔ نہ کسی سے دبے نہ ڈرے اور جو بات کی وہ الگ ملک کی صوت میں پوری کر کے دکھائی۔ قائداعظم نے ہمیشہ خود بھی محنت کی اور محنت کرنے کا درس دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان بنانے میں جس قدر محنت اور قربانیاں دی گئی ہیں، اب اس سے دُگنی محنت کر کے ہمیں اس ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ آج بھی ہم سب قائداعظم کو بے حد محبت اور احترام سے یاد کرتے ہیں اور عظیم لوگ دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

پاکستان بنانے میں علامہ محمد اقبال کی بھی بے انتہا محنت اور کوشش شامل ہے۔

”کتنا اچھا ہے کتنا پیارا ہے — اک چمکتا ہوا ستارہ ہے
ہم ہیں اس کے تو یہ ہمارا ہے — جان میں اس کی جان ہے اپنی
اس کی ہر شان شان ہے اپنی — یہ بڑا ملک ہے کہ چھوٹا ہے
اس طرح کا کہ اُس طرح کا ہے — یہ بڑی بات ہے کہ اپنا ہے
جانتے ہو یہ کام کس کا تھا — ڈاکٹر اقبال نام اُس کا تھا
سب کہو زندہ باد پاکستان — زندہ پائندہ باد پاکستان “(۵۵)

آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور یہ آزادی بہت ساری قربانیوں سے ملتی ہے۔ عزت انہی قوموں کی ہوتی ہے جو آزاد ہوتی ہیں اور جو اپنے بل بوتے پر ترقی کرتی ہیں اور آپ کے ملک کا حوالہ آپ کی شان بڑھاتا ہے۔ ہر ملک میں اچھے بُرے لوگ ہوتے ہیں اور اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں، لیکن ملک چاہے جتنی بھی مشکلات اور مسائل کا شکار ہو، یہ تو تسلی ہوتی ہے کہ اپنا تو ہے نا۔ وقت اچھا ہو یا بُرا اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ گزر جاتا ہے۔ اس لیے اگر کبھی وطن پر کوئی مشکل آئے تو گھبرانا نہیں چاہیے۔ کیونکہ وقت گزر جائے گا۔ ملک قائم رہنا ضروری ہے۔ جس میں آزادی سے زندگی گزاری جا سکے اور یہ آزادی اور کھلی ہوائیں اور فضائیں جس میں آج ہم جی رہے ہیں۔ یہ علامہ محمد اقبال کے اُس خواب کی تعبیر ہے جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا اور

جس کا ذکر انھوں نے خطبہ الٰہ آباد میں کیا تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ یہ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنے اکثریتی علاقوں کو ملا کر ایک ملک بنالیں۔ ایک ریاست بنالیں جس میں انھیں ہر طرح کی مذہبی آزادی ہو اور جہاں مسلمانوں ہی کی حکومت ہو۔ لہٰذا مسلمانوں میں آزادی اور الگ ملک کا جذبہ جگانے والے علامہ محمد اقبال تھے۔

"سب سے پہلے جس کی زبان پر پاکستان کا نام آیا
اپنے دیس کا اِک شاعر تھا، اپنے دیس کے کام آیا
اس نے بتایا آزادی میں کتنی عزت ہوتی ہے
ایسے دیس میں جو بستے ہیں سب کی عزت ہوتی ہے
وہ آیا تو قوم کو گویا عظمت کا پیغام آیا
اپنے دیس کا اِک شاعر تھا اپنے دیس کے کام آیا" (۶)

یہ علامہ محمد اقبال ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ علیحدہ ملک بننا کس قدر ضروری ہے۔ اسی میں سب کی عزت ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال اور قائداعظم کی بہترین رہنمائی میں مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دے کر یہ پاک سرزمین حاصل کی۔ لہٰذا ہمیں اُن قربانیوں اور اُن رہنماؤں کو بالکل نہیں بھولنا چاہیے کہ جن کے بغیر یہ وطن حاصل کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ جو قومیں اپنا اصل بُھلا دیتی ہیں۔ وہ جلد ہی دنیا میں ناکام ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ بچوں کو بچپن سے ہی ان سب باتوں کا علم ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ بھی انہی ملت کے پاسبانوں اور رہنماؤں کی عزت کریں۔ اس ملک کی عزت کریں اور محنت اور لگن سے پڑھیں تاکہ بڑے ہو کر وہ بھی اس ملک کی ترقی اور عزت بڑھانے میں اپنا حصہ ڈال سکیں اور اسے اونچائی پر لے جانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

آزاد ملک اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔ اس نعمت کی قدر کریں کیونکہ آزادی صرف قسمت والوں کو ملتی ہے جو اس کے لیے محنت اور جدوجہد کرتے ہیں۔

"لاکھ مصیبت اِک سلجھاؤ
لاکھ بگاڑ اور ایک بناؤ
لاکھ دُکھوں کا ایک علاج اپنے دیس میں اپنا راج

خود ہی بگڑنا خود ہی سنورنا | اپنے بَل پر آپ اُبھرنا
اپنے ہاتھ میں اپنی لاج | اپنے دیس میں اپنا راج
اپنی عدالت اپنی گواہی | اپنی حکومت اپنی شاہی

اپنا تخت اور اپنا تاج
اپنے دیس میں اپنا راج'' (ی)

قوموں پر مشکل وقت اور مصیبتیں آتی ہیں لیکن بہادر قومیں ان حالات میں گھبرایا نہیں کرتیں اور مل کر ان مصیبتوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور حالات ٹھیک کر لیتی ہیں۔ گھر اپنا ہو تو مشکل وقت بھی گزر جاتا ہے۔ اسی طرح اپنا ملک ہو تو راج بھی اپنا ہی ہوتا ہے۔ بے شک آپس میں کتنے بھی اختلافات ہوں وہ خود ہی بیٹھ کر دور کیے جا سکتے ہیں اور اپنی قوموں کی عزت دنیا بھی کرتی ہے جو آپ بھی اپنی عزت کرتے اور کروانا جانتے ہیں۔ پاکستان کو گزشتہ کئی سالوں سے بہت سے مشکل حالات سے گزرنا پڑا جن میں قدرتی آفات جیسے زلزلہ، سیلاب کے علاوہ دشمن کی سازشیں جیسے دہشت گردی اور خودکش حملے وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن چونکہ ہم متحد رہے۔ اس لیے ان حالات سے بھی باہر نکل آئے۔ اسی طرح عدالتیں بھی آزاد ہیں۔ حکومت بھی اپنی ہے۔ لہٰذا ہم آزاد ہیں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اس ملک پاکستان کو ہمیشہ قائم و دائم اور رہتی دنیا تک آباد رکھے۔ آمین۔

ہر کسی کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے اور حب الوطنی کا یہ جذبہ انسان میں فطری اور پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے اور مرتے دم تک وطن کی یہ محبت اس کے دل میں رہتی ہے۔ ''دیس ہمارا'' اور ''پیارا دیس ہمارا'' اسی حب الوطنی کے سلسلے کی نظمیں ہیں۔

''دیس ہمارا پاکستان

دیس ہمارا ہم کو پیارا | ہم سب کی آنکھوں کا تارا
اپنے دیس پہ ہم قربان | دیس ہمارا پاکستان
اس کی خوشی آرام ہمارا | اس کے نام سے نام ہمارا
اس کی شان ہماری شان | دیس ہمارا پاکستان'' (۵۸)

(دیس ہمارا)

”پیارا دیس ہمارا، پیارا دیس ہمارا

ہر اِک شے کی شان نرالی — شان نرالی، آن نرالی
گوشہ گوشہ ایک چمن ہے — ذرہ ذرہ ایک ستارہ
اس کی عزت اپنی عزت — اس کی طاقت اپنی طاقت
اس کی خوشی میں اپنی خوشی ہے — اس کے نام سے نام ہمارا

پیارا دیس ہمارا، پیارا دیس ہمارا“(۵۹)

دونوں ہی نظمیں وطن سے محبت کی بھرپور عکاس ہیں۔ اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہم ہر سطح تک جانے کو تیار ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے ہماری جانیں بھی قربان ہیں۔ اس کی طرف کوئی ملی آنکھ اُٹھا کر دیکھے یہ ہم کبھی بھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کی عزت اور بقا میں ہی ہماری عزت اور بقا ہے۔ اس کی خوشحالی ہماری پُرسکون زندگی کی علامت ہے۔ یہ عظیم ملک ہمارے لیے خُدا کا سب سے حسین اور انمول تحفہ ہے۔ اس کے خوبصورت نظارے اور بے شمار ذخائر اس کی شان بڑھاتے ہیں۔ ہم سب کو ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کبھی کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے پاکستان کی عزت اور مقام میں کوئی آنچ آئے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے وطن کی عزت نہیں کریں، اسے اپنے غلط کاموں سے خود بدنام کریں گے تو کوئی دوسرا کبھی بھی اس ملک کو عزت نہیں دے گا۔ ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ ہم اس ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے اپنا بہترین کردار ادا کریں اور اللہ سے دُعا کریں کہ یہ پرچم ہمیشہ بلند رہے اور ہمارا ملک تا قیامت قائم و دائم رہے۔

”یہ نشان یہ ہمارے وطن کے نشان“ نہایت بہترین اور تعریف سے بھرپور نظم ہے جس میں صوفی تبسم نے پاکستان کے متعلق بے شمار مثبت اور قابلِ فخر باتوں کا ذکر کیا ہے جنھیں پڑھ کر ہر پاکستانی فخر کرتا ہے۔

”اس سے رشکِ فلک ہے زمینِ وطن
اس سے روشن ہوئی ہے جبینِ وطن
ذرہ ذرہ وطن کا ہوا ضوفشان
یہ نشان یہ ہمارے وطن کے نشان
یہ نشان اپنی زریں روایات کا
یہ نشان غازیوں کی کرامات کا

جن کا جوشِ مسلسل تھا تیغ رواں

یہ نشان یہ ہمارے وطن کے نشان''(۶۰)

پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اس کی پہچان ہے۔ اس پر موجود چاند اور ستارہ اس کی خوشحالی اور روشنی کی علامت ہیں کہ یہ ملک اپنے چاہنے والوں کی محبت سے چمک رہا ہے۔ چوہدری رحمت علیؒ وہ ہستی جنھوں نے پاکستان کا نام او ر پرچم تجویز کیا تھا۔ آج وہی پرچم پوری دنیا میں عزت اور وقار سے سر اُٹھا کر کھڑا ہے۔ اس میں چمکتا چاند اور ستارہ اس قوم کی بیداری کی علامت ہے۔ یہ وہی پرچم ہے جس کی دہشت سے دشمن لرزاں تھے۔ اس پرچم کو حاصل کرنے والوں میں لاکھوں شہیدوں اور غازیوں کی قربانیاں اور جدوجہد شامل ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اہلِ ایمان تھے۔ جن کے سینے قرآن سے منور تھے۔ یہ اللہ کے جانباز سپاہی تھے جو خطروں کے سامنے ڈٹ جاتے تھے۔ جنھوں نے کلمہ حق بلند کیا اور ان کے خوف سے صحرا و پہاڑ بھی گھبراتے تھے۔ یہ پرچم بہت سی عظیم قربانیوں کی یادگار ہے اور دُعا ہے ہ یہ ہمیشہ تاقیامت یونہی لہراتا رہے اور کبھی بھی اس کا سر نیچا نہ ہو۔ اللہ پاک اس پرچم کی یہ عزت اور رتبہ قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ یوں یہ تمام نظمیں جذبہ حب الوطن کی بھرپور عکاس ہیں اور بچوں کو شروع سے ہی آزاد وطن کی حقیقت اور اہمیت سے روشناس کراتی ہیں۔

ہر بچہ اپنے بچپن میں ہی یہ سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنے گا؟ اور جب بھی وہ اپنے اردگرد کوئی بھی پیشہ دیکھتا ہے تو وہ اُسی وقت اپنے لیے اُسی پیشے کو اپنانے کا سوچ لیتا ہے۔ لٰہذا جیسے جیسے اُس کے دیکھنے اور ملنے ملانے کی دنیا وسیع ہوتی ہے، ویسے ویسے اُس کی سوچ کا دائرہ بھی بڑھنے لگتا ہے۔ کچھ انہی خیالات کا اظہار اس نظم ''میں کیا بنوں گا؟'' میں کیا جا رہا ہے۔

''کیوں نہ میں پائلٹ بن جاؤں

جگہ جگہ کی سیر کر آؤں

یا فوجی افسر بن جاؤں

وردی پہنوں، ٹھاٹھ دکھاؤں

کیوں نہ انجینئر بن جاؤں

عالی شان مکان بناؤں''(۶۱)

اس نظم میں بچہ یہی سوچ رہا ہے کہ وہ آخر کار کون سا پیشہ اپنائے۔ پہلے وہ یہ سوچتا ہے کہ پائلٹ بن جائے۔ اس طرح سے وہ مختلف ممالک جیسے روس، امریکہ، انگلستان وغیرہ کی سیر کر سکے گا۔ پوری دنیا گھوم سکے گا۔ پھر خیال آتا ہے کہ فوجی افسر بن جاؤں۔ اس طرح وطن کی خدمت کروں گا۔ اس کی خاطر جنگ کروں گا۔ اس کا دفاع کروں گا اور اس طرح بے حد عزت بھی پاؤں گا۔ پھر انجینئر بننے کا خیال آتا ہے کہ مکان، محل، کالج وغیرہ بنا سکوں گا۔ بڑی بڑی عمارات کھڑی کر سکوں گا اور اس میدان میں عزت کماؤں گا لیکن پھر دل چاہتا ہے کہ فوجی لیڈر بن جاؤں۔ اس طرح سے لوگوں کی خدمت کروں اور ملک کے بگڑے کام سنواروں۔ یا پھر ڈاکیا بن جاؤں۔ لوگوں کے گھروں میں ڈاک بانٹتا پھروں اور آخری خیال جو ذہن میں آتا ہے وہ تجارت کا آتا ہے کہ تاجر بن کر خوب دولت کماؤں۔ اچھا سودا بیچوں اور عزت بھی پاؤں۔ بے شک یہ بچہ اس طرح بے شمار خواہشات دل میں رکھتا ہے اور سوچتا ہے۔ لیکن یہ وقت اور حالات پر منحصر ہے کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنتا ہے او رکون سا محکمہ چنتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں کبھی بھی ماں باپ کو بچے پر کسی قسم کا دباؤ نہیں رکھنا چاہیے اور بچے پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اُس کی ہر میدان میں حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اُسے صرف یہ تربیت دینی چاہیے کہ وہ جس بھی میدان میں جائے جس بھی پیشے کا انتخاب کرے، پوری ایمانداری اور نیک نیتی سے اُس میں کام کرے اور اس محکمے کی بہتری کے لیے اپنی جان لگا دے اور ایسا کام کرے جس سے ماں باپ او رملک وقوم کا نام روشن کر سکے۔

انسان جس جگہ پہ رہتا ہے یا جس ماحول، علاقے، گھر، مدرسے سے اُس کا رشتہ ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ اس سے وہ بے حد محبت کرتا ہے اور نہایت پُرخلوص الفاظ میں اسے یاد کرتا ہے۔ ''مدرسہ'' بھی ایسی ہی ایک نظم ہے۔ بچے اپنے سکول، کالج، یونیورسٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اُن سے اُن کی بے شمار یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ سکول جہاں وہ اپنا بچپن پڑھتے ہوئے اور بہت کچھ بنا سیکھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اس سے اُن کی انسیت کبھی بھی کم نہیں ہوتی۔

''خوبصورت پیارا پیارا مدرسہ
کتنا اچھا ہے ہمارا مدرسہ'' (۶۲)

اپنا مدرسہ یا سکول ہر کسی کو پیارا لگتا ہے۔ بچے اپنے مدرسے کے پھول اور تارے ہوتے ہیں۔ اس

مدرسے سے وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں ۔ مدرسے میں موجود روحانی ماں باپ یعنی اُستاد انھیں آنے والی زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرواتے ہیں۔ انھیں زمانے کی اونچ نیچ بتاتے ہیں اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے گر بتاتے ہیں۔ یہ وہ عرصہ ہوتا ہے جو کہ بچوں کے سیکھنے کا سب سے قیمتی دور ہوتا ہے اور اس میں وہ جو باتیں سیکھ جاتے ہیں وہ ساری زندگی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ مدرسہ ان کے گھر کے جیسا ہی ہوتا ہے۔ جہاں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود اور بے شمار دوست ہوتے ہیں اور یہ بچہ اپنے مدرسے کی عزت کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو چاہیے کہ وہ باقاعدگی سے اپنے سکول جائیں اور پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ اور مدرسے کا نام روشن کریں۔

بچپن کا سنہری دور جو کہ بہت کم عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ وہ انسان کو آئندہ آنے والی زندگی کے لیے بے شمار اسباق دے کر جاتا ہے اور عملی زندگی کے لیے تیار کر کے جاتا ہے۔ اس دور میں سیکھی ہوئی باتیں اور اُصول ساری زندگی یاد رہتے ہیں اور اگر ایک بہترین معاشرے کی بنیاد رکھنی ہے تو بچوں کو شروع سے ہی سکھانے کا عمل جاری کر دیں تاکہ آئندہ زندگی میں اُن کے لیے مشکلات نہ ہوں۔ ''چلا چل'' نظم میں بچوں کو آئندہ زندگی کے انہی سنہری اُصولوں سے روشناس کروایا جا رہا ہے۔

''کنارے چلا چل کر دھارے چلا چل
مگر اپنے بل کے سہارے چلا چل
کہاں تک کسی پہ بھروسہ کرے گا
کہاں تک کسی کے سہارے چلے گا
جو چلتا ہے اپنے سہارے چلا چل''(۶۳)

صوفی تبسم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کھیل ہی کھیل میں بے شمار قیمتی باتیں بچوں کو سکھا دیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی بچوں سے یہی کہا جا رہا ہے کہ زندگی کے میدان میں خواہ کیسا بھی راستہ ہو یا کسی بھی سمت کا انتخاب کریں ۔ اس پر چلنا بھی آپ کو خود ہی ہے۔ کیونکہ دوسروں کے سہارے نہ تو ساری زندگی گزاری جا سکتی ہے اور نہ ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس پر ہم بھروسہ کریں وہ انسان بھی بھروسے کے لائق ہو۔ لہٰذا خود کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے ابھی سے تیار کرنا ضروری ہے۔ حالات کتنے ہی مشکل ہوں اور سفر کتنا بھی کٹھن ہو، اس سے گھبرانا نہیں ہے اور صرف اور صرف اپنی منزل پر نظر رکھنی ہے اور منزل پر

پہنچنے کی دُھن انسان کو راستے کی پریشانیوں سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے اور یہ اب انسان کی اپنی ہمت اور طاقت ہے کہ وہ ان حالات سے کیسے خود کو نکالتا ہے۔ لیکن زندگی گزارنے کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ کبھی خود غرض نہ بنو۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ مخلصانہ رویہ رکھو۔ دوسروں کو جہاں کہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہو، ان کی ضرور مدد کریں اور انھیں بھی ساتھ لے کر چلیں اور شمع سے شمع جلاتے جائیں تا کہ سب تک اس کی روشنی پہنچ سکے۔ یوں بچوں میں شروع سے اخوت، بھائی چارہ اور ہمدردی جیسی صفات پیدا ہوسکیں گی۔

وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اسے گزرنا ہے اور یہ گزر ہی جاتا ہے۔ قدرت کے قانون کے مطابق جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے واپس بھی جانا ہے۔ جو بچہ ہے، اُسے جوان ہونا ہے اور جو جوان ہے، اسے بڑھاپے میں بھی ضرور قدم رکھنا ہے۔ لہٰذا ان سے فرار اختیار نہیں کر سکتے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ہم بچے ہوتے ہیں اور ہمارے ماں باپ جوان ہوتے ہیں۔ پھر وقت کا پہیہ گھومتا ہے اور ہم جوان اور ہمارے ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپا وہ دور جس سے سب ڈرتے ہیں۔ ڈر بڑھاپے کا نہیں ہوتا بلکہ بڑھاپے میں ملنے والی تنہائی سے لگتا ہے۔ کیونکہ اولاد جوان ہوتی ہے۔ اس کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ بوڑھے ماں باپ کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا ہی تذکرہ اس نظم ''بچو میرے بچو'' میں ہو رہا ہے۔

''آؤ بچو!
میرے بچو میرے پیارو آؤ
اپنی اپنی خوشیوں میں مجھے بھی ساتھ ملاؤ
آؤ
آؤ بچو! آؤ
کتنے خوش رنگ حسین خواب دکھائے ہیں تمہیں
چاند تاروں کے سفر میں نے کرائے ہیں تمہیں
تم مجھ کو وہی خواب دکھاؤ'' (۶۴)

ماں باپ اپنا سب کچھ اپنی اولاد پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن کی خوشی اور دُکھ دونوں کی وجہ اور مرکز ان کی اولاد ہوتی ہے۔ اگر اولاد کسی بات سے خوش ہے تو ماں باپ بھی خوش ہو جاتے ہیں اور اگر اولاد کسی وجہ سے بیمار یا دُکھی ہے تو ماں باپ کو بھی کسی پہلو قرار نہیں آتا۔ بچوں کی ضروریات پوری کرنا ان کی اوّلین ترجیح ہوتی ہے۔

باپ محنت مزدوری کر کے بچوں کی خواہشات پوری کرتا ہے تو ماں گھر میں اولاد کی خدمت پر مامور ہوتی ہے۔ بچوں کو لوریاں دی جاتی ہیں۔ بہت سے خوبصورت خواب دکھائے جاتے ہیں۔ یعنی ماں باپ کی خوشی کا واحد محور اور مرکز ان کی اولاد ہی ہوتے ہیں۔ اب جب ماں باپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے بچو ہمارے پاس آؤ۔ ہمارے ساتھ وقت گزارو۔ بالکل اُسی طرح جیسے ہم ہر وقت تم لوگوں کے آس پاس رہتے تھے۔ اپنی پریشانی، بھوک، پیاس بھول کر تم لوگوں کی پریشانی دور کرنے میں لگ جاتے تھے۔ جس طرح ہم نے تمہیں بہلایا اور پالا۔ محبت دی۔ آج اُسی محبت اور توجہ کے ہم طلبگار ہیں۔ آج ہم وہ سب باتیں جو تمہیں سناتے تھے، بھول چکے ہیں۔ آج تم لوگ ہمیں وہ خواب پھر سے یاد دلاؤ۔ ہم سے پیار کے دو بول بولو۔ بچوں کو بچپن سے ہی ان باتوں کا علم ضروری ہے کہ ہمارے ماں باپ کس قدر محنت اور مشقت سے ہمیں پالتے ہیں اور ایک بہترین زندگی فراہم کرنے کا باعث بنتے ہیں تاکہ جب اولاد جوان ہو جائے تو وہ ماں باپ کے اُن احسانات کو نہ بھول جائے جو اُن کے ساتھ کیے گئے اور ویسے بھی یہ تو ہمارے دین میں بھی ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو اُن کی ویسے ہی خدمت کرو جیسی اُنھوں نے تمہاری تمہارے بچپن میں کی تھی اور انھیں کوئی تکلیف نہ دو۔ نہ اُن کو جھڑکو اور اُن سے محبت اور شفقت کا رویہ رکھو تاکہ تمہارے بڑھاپے میں تمہاری اولاد بھی تم سے محبت کرے۔

یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے بنائی اور سجائی ہے۔ وہ ہم سب کا خالق، مالک اور رازق ہے۔ ہم سب اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے مثال ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہیں۔ ''میرا خُدا'' اور ''تو زمین آسمان کا مالک ہے'' میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی گئی ہے اور اُس ذات پاک کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

میرا خدا

''جس نے بنائی دنیا جس نے بسائی دنیا
ہاں وہ میرا خدا ہے
ہاں وہ میرا خُدا ہے''(۶۵)

''تو زمین آسمان کا مالک ساری دنیا جہاں کا مالک
میرے تن میری جان کا مالک(۶۶)

اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ اس ساری کائنات کا نظام اُسی نے بنایا ہے۔ چاند، سورج، تارے، دن رات، سردی، گرمی، پہاڑ، خزاں وغیرہ یہ سب اُسی کی قدرت کے شاہکار ہیں۔ اس دنیا میں کوئی شے اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرسکتی۔ وہ اس کائنات کی ہر شے اور ہماری جان کا مالک اور خالق ہے۔ ہم سب کو وہی ذات آسرا دیتی ہے۔ جب انسان ہر طرف سے نااُمید ہو جاتا ہے تو تب وہی ذات ہے جو انسان کو سہارا اور اُمید دیتی ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ ہم سب اپنی تمام تکلیفیں اور دُکھ اللہ پاک کو ہی سُناتے ہیں۔ اُسی کی عبادت کرتے ہیں اور بے شک وہی ذات ہے جو ہمیشہ ہماری سُنتی ہے او رہماری راہنمائی اور مدد فرماتی ہے۔ وہ سب کا مالک ہے۔ سب کا وہی ایک رب ہے اور وہی ہماری عبادتوں کا حقدار ہے۔ وہ ہم سب کا خُدا ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی دینی تعلیم دینا بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنی، اللہ کی اور اس دنیا کی حقیقت کو جان سکیں۔

اللہ پاک کی حمد وثنا ہو اور اللہ کے محبوب نبی ﷺ کا ذکر نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ میں اور میرے فرشتے آپؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والوتم بھی آپؐ پر درود وسلام بھیجا کرو۔ نعت میں رسول اکرم ﷺ کی تعریف کی جاتی ہے۔ "نبی ہمارے" اور "نعت" میں آپؐ کے بلند مقام کی تعریف کی جارہی ہے۔

"وہ حق کی باتیں بتانے والے وہ سیدھا رستہ دکھانے والے
وہ رہبر و رہنما ہمارے نبیؐ ہمارے نبیؐ ہمارے

درود اُن پر سلام اُن پر" (٦٧)

(نبیؐ ہمارے)

"دل آرا محمدؐ ہمارا محمدؐ ہے ہم سب کی آنکھوں کا تارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ ، تمہارا محمدؐ جہاں میں ہر اِک کا سہارا محمدؐ

فقط ہم کو ہی سب سے پیارا نہیں ہے
خُدا کو بھی ہے سب سے پیارا محمدؐ" (٦٨)

یہ کائنات جن کے لیے بنائی اور سجائی گئی وہ اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ تمام نبیوں میں سب سے اُونچا مقام آپؐ کا ہے۔ یہ دنیا اور اس کی ساری رونقیں آپؐ کے دم سے ہیں۔ آپؐ نے اللہ پاک کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ آپؐ نے دین اسلام کو مکمل کیا۔ آپؐ نے سیدھا اور حق کا راستہ لوگوں کو بتایا۔ ہم سب

آپؐ ہی کے در کے گدا ہیں اور قیامت کے دن آپؐ کی شفاعت کے منتظر ہیں۔ آپؐ نے اس امت کے لیے بے شمار تکالیف برداشت کیں۔ آپؐ کی زندگی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور اس پر عمل کر کے ہم دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپؐ کا مقام بے حد اُونچا ہے۔ آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ جس کا کوئی نہیں، آپؐ اُس کے ہمدرد ہیں۔ آپؐ اُن کو سہارا دینے والے ہیں۔ آپؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپؐ کی سنت اور قرآن میں ہمارے لیے فلاح ہے۔ دین کی تعلیم اور سمجھ بچوں کے لیے بے حد ضروری ہے اور ساتھ ہی حمد اور نعت کا فرق بتانا ضروری ہے کہ حمد میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جاتی ہے اور نعت میں حضور اکرم ﷺ کی شانِ اقدس کی تعریف کی جاتی ہے۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے۔ اُس سے ہر وقت اُس کی رحمت اور بخشش طلب کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ''دُعا'' بہت اہم چیز ہے۔

''اے خدا! اے خُدا! اے خُدا! اے خُدا!
تو ہمیشہ سے ہے تو رہے گا سدا
نہ تیری ابتداء نہ تیری انتہا
تیرے جیسا نہیں ہے کوئی دوسرا
اے خدا! اے خُدا! اے خُدا! اے خدا!''(۶۹)

اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور رہے گا اور وہ ذات اپنی صفات اور کاموں میں یکتا ہے۔ اس کا نہ کوئی شریک ہے، نہ مددگار ہے۔ اللہ پاک آپ ہی ہم غم زدہ لوگوں کا سہارا ہیں۔ ہم شدید مشکلات کا شکار ہیں اور ان مشکلات میں سے صرف آپ ہی ہمیں نکال سکتے ہیں۔ بے شک ہم بے حد گنہگار ہیں۔ ہمارے گناہ بہت زیادہ ہیں لیکن تیری رحمت تو ہمارے گناہوں سے بے انتہا زیادہ ہے۔ بے شک تو معاف کرنے والا ہے تو ہمیں بخش دے۔ آج ہم تیرے سامنے اپنے ہاتھ پھیلائے اور شرمندگی سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ ہمارے گناہوں کے بوجھ نے ہمیں جھکا دیا ہے۔ اب ہم صرف تجھ سے التجا کر سکتے ہیں۔ فریاد کر سکتے ہیں کہ تو ہمیں بخش دے۔ تو ہمیں ہمارے گناہوں پر معاف فرما دیے۔ ہمیں توبہ کرنے کی توفیق دے اور ہمیں ہدایت کے

راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ بے شک تو جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ تو اپنے بندوں سے بے حد محبت کرتا ہے۔ تو ہم سے راضی ہو جا۔ آمین۔ صوفی تبسم نے بچوں کے حوالے سے ایک بہت بہترین دُعا لکھی ہے۔ بچے اُس سے نہ صرف بہت کچھ سیکھ پائیں گے بلکہ دُعا کے بعد وہ خود کو اللہ کے بہت قریب محسوس کریں گے۔

بچپن میں بچوں کو ایسی بے شمار کہانیاں یا قصے سنائے جاتے ہیں۔ جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہونا اور اُن کا مقصد صرف اور صرف بچوں کو خوشی دینا ہوگتا ہے کیونکہ بچپن زندگی کا وہ حصہ ہوتا ہے۔ جس میں انسان زندگی کی حقیقتوں سے ناواقف ہوتا ہے۔ اُس کی اپنی ہی تخیلاتی دنیا ہوتی ہے اور بچپن کی اس دنیا میں جانور باتیں کرتے ہیں۔ پریاں رات کو آ کر لوریاں دیتی اور ناچتی ہیں۔ پودے مسکراتے ہیں اسی طرح بچے اپنے خیال میں بھی بہت سی ایسی باتیں بنا لیتے ہیں جن کا اصل میں کوئی وجود نہیں ہوتا اور اس سے وہ صرف ذہنی خوشی اور تسکین حاصل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بڑے بھی بچوں کی اس دنیا کو بگاڑنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اس خوبصورت تخیلاتی دنیا کی انھیں بھرپور سیر کرواتے ہیں اور ساتھ ساتھ بے شمار قیمتی باتیں بھی سکھا دیتے ہیں جو آئندہ زندگی میں کام آتی ہیں۔

صوفی تبسم کی یہ دونوں نظمیں ''راجا رانی'' اور ''راجا رانی کی کہانی'' بھی بالکل ایسی ہی تخیلاتی دنیا کی عکاس ہیں اور جن کا مقصد صرف اور صرف بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ لانا ہے۔

''آ و بچو سُنو کہانی

ایک تھا راجا
ایک تھی رانی
راجا بیٹھا بین بجائے
رانی بیٹھی گانا گائے
طوطا بیٹھا چونچ ہلائے
نوکر لے کر حلوہ آیا
طوطے کا بھی جی للچایا
راجا گاتا جائے
نوکر شور مچاتا جائے
طوطا حلوہ کھاتا جائے''(۷۰)

(راجا رانی)

''آؤ بچو سُنو کہانی	ایک تھا راجا ایک تھی رانی
دونوں اِک دن شہر میں آئے	شہر سے اِک اِک گڑیا لائے
راجے کی گڑیا تھی دُبلی	رانی کی گڑیا تھی موٹی
راجے کی گڑیا تھی لمبی	رانی کی گڑیا تھی چھوٹی'' (۱۷)

نظموں کا آغاز بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ بچوں کو اس انداز میں مخاطب کیا ہے کہ وہ سُن کر فوراً ہی کھنچے چلے آئیں گے۔ راجا رانی کی کہانی سُنانا تو ویسے بھی ایک محبوب مشغلہ ہے۔ صوفی تبسم نے بھی یہی کام کیا ہے کہ راجا رانی بیٹھے ہوئے ہیں۔ راجا بین بجا رہا ہے تو رانی گانا گا رہی ہے۔ بچوں کی دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے طوطے کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ راجا رانی کے حصے کا حلوہ کھا جاتا ہے۔ دوسری نظم میں بھی راجا رانی ہیں۔ دونوں شہر سے اپنے لیے ایک ایک گڑیا لاتے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو راجا کا گڑیا سے کیا کام؟ لیکن بچپن میں بچے اکٹھے کھیلتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی گڑیوں سے بھی کھیل لیتے ہیں۔ اُسی منظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ دونوں یعنی راجا رانی اپنی اپنی گڑیا کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے بے شمار تعریفیں کرتے ہیں۔ جب دونوں میں سے کوئی بھی ہار نہیں مانتا تو آخر کار لڑائی ہو جاتی ہے اور پھر ایک بڑی اماں آ کر دونوں کو ڈانٹ کر لڑائی ختم کرواتی ہیں۔ جیسے عموماً دیکھا جاتا ہے کہ بچے اپنے اپنے کھلونوں کی بے انتہا تعریف کرتے ہیں اور یہ کبھی بھی تسلیم نہیں کرتے کہ دوسروں کے کھلونے کہیں سے بھی اُن کے کھلونوں سے بہتر ہیں۔ لہٰذا انجام وہی ہوتا ہے جو اس نظم میں ہوا یعنی لڑائی پر اختتام ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کو سمجھانا چاہیے کہ آپ کے کھلونوں کی طرح دوسروں کے کھلونے یا دوسروں کے استعمال کی چیزیں بھی بہت اچھی ہیں۔ کسی کو خود سے کم تر انہیں سمجھنا چاہیے اور لڑائی تو ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ لڑائی میں کسی کا فائدہ نہیں ہوتا بلکہ نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

ٹوٹ بٹوٹ کی طرح صوفی تبسم کی نظموں میں مُنا بھی ایک بہت اہم کردار ہے۔ یہاں مُنّے سے مراد ایسے وہ تمام بچے ہیں جو اپنی عمر اور شرارتوں کے لحاظ سے کہیں نہ کہیں اس کردار سے میل کھاتے ہیں۔ مُنا وہ بچہ ہے جو روتا بھی ہے۔ ہنستا بھی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا یا عجیب کر رہا ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ نیا سیکھتا بھی ہے۔ اسی کردار سے متعلق نظموں کا یہاں جائزہ لیا جائے گا۔

''ہولے ہولے ہولے، رو لے مُنّے رو لے

جیسے چڑیا گانا گائے	جیسے مینا راگ سنائے
جیسے بلبل بولے	رو لے مُنّے رو لے
ابا کو آواز نہ آئے	امی بھی سننے نہ پائے
گڑیا آنکھ نہ کھولے	ہولے ہولے ہولے

جتنا چاہے رو لے''(۷۲)

اس نظم میں بے حد موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ردیف قافیے کا اہتمام اس نظم کو حد درجہ خوب صورت بنا رہا ہے۔ اس نظم کے مطابق جس طرح چڑیا، مینا، بلبل اپنی اپنی آوازیں ہر وقت بولتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مُنّا بھی ہر وقت روتا رہتا ہے اور اب تو اس کے رونے کی بات اتنی عام ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے رونے پر دھیان نہیں دیتا۔ اس لیے مُنّا خود ہی آہستہ آواز میں روتا رہتا ہے۔ ہر وقت رونے والے بچے کسی کو بھی اچھے نہیں لگتے۔ اس لیے ہر وقت کی ضد اور رونا دھونا اچھی بات نہیں ہے۔

''مُنّے نے کھیرا چاقو سے چیرا
مُنّے کی خالہ مُنّے کی تائی''(۷۳)

بچے جب بھی کوئی نیا کام کرتے ہیں یا کچھ نیا سیکھتے ہیں تو گھر والوں کے لیے بے حد خوشی کی بات ہوتی ہے اور یہ خوشی خاندان کے سارے افراد کے ساتھ بانٹی جاتی ہے۔ یہاں بھی مُنّے نے چاقو کا استعمال کر کے کھیرا کاٹا ہے تو سب ہی حیران اور خوش ہیں اور ایک عجیب سا شور وغل ہو رہا ہے اور سب اپنی اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

''آہا آہا ہو ہو ہو
مُنّا ایک اور لڈو دو''(۷۴)

صوفی تبسم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں انھوں نے آوازوں کا استعمال الفاظ کی صورت میں کیا ہے۔ آوازوں کو بھی لفظی شکل دی ہے جس سے موسیقیت کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے آہا آہا، ہو ہو کا کوئی لفظی مطلب نہیں ہے۔ لیکن ان کے بغیر نظم نامکمل ہے۔ مُنّے کے پاس دو لڈو تھے۔ ایک مُنّے نے کھا لیا۔ اسی دوران دوسرا مُنّا آ گیا۔ اب لڈو ایک اور مُنّے دو ہیں۔

اس نظم سے بچوں میں مل بانٹ کر کھانے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

بچوں کو عموماً کھانے دینے میں کچھ مخصوص اشیاء بے حد پسند ہوتی ہیں اور اُن اشیاء کا حصول اُن کے لیے بے حد ضروری ہے۔ خواہ اس کے لیے وہ ضد ہی کیوں نہ کریں۔ کیونکہ اُن اشیاء کے نہ ملنے کی صورت میں اکثر بچے بھوکے رہنا پسند کرتے ہیں یا ناراض ہو جاتے ہیں اور کھانا نہیں کھاتے جو کہ بالکل اچھی بات نہیں ہے۔

''مُنّے کی ماں'' یہ نظم بھی کچھ ایسے ہی مناظر کی عکاسی کر رہی ہے۔

''مُنّے کی ماں نے انڈہ اُبالا
ہنڈیا میں ڈالا
دو منٹ گزرے   ڈھکنا اُٹھایا
انڈہ نہ پایا
چمچہ تھا ٹیڑھا   اوندھی تھی تھالی
ہنڈیا تھی خالی
قسمت تھی کھوٹی   روکھی تھی روٹی
گھر میں کسی نے   روٹی نہ کھائی
مُنّے کے انڈے   تیری دُہائی''(۷۵)

مُنّے کی ماں نے مُنّے کی فرمائش پر انڈہ اُبالا لیکن وہ اُبلنے کے بعد نہیں ملا بلکہ چوری ہو گیا۔ اب کیا ہونا تھا؟ سارے گھر میں رونا دھونا پڑ گیا۔ روکھی روٹی کسی نے نہ کھائی اور سب روتے روتے ہی سو گئے۔ مقصد یہ ہے کہ ضروری نہیں جو چیز ہم چاہئیں وہ ہمیشہ ہمیں مل جائے۔ اگر کبھی نہ بھی ملے تو افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور جو حاصل ہو اُسی پر قناعت کر لینی چاہیے۔

''مُنّا'' اگلی نظم ہے۔ اس نظم کا مقصد صرف اور صرف بچوں کو خوش کرنا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس نظم سے نئے الفاظ سیکھیں گے۔ جیسے چمچہ، تھالی، پیڑ وغیرہ اور جانوروں کی پہچان اور اُن کی خصوصیات بھی جان پائیں گے۔ جیسے کالا ناگ، شیر وغیرہ۔ یوں ان کے علم میں بھی اضافہ ہوگا۔

بچے اس عمر میں بے حد شرارتی اور من مرضی کے مالک ہوتے ہیں اور جس بات یا کام سے انھیں روکا

چاہئے وہ وہی کریں گے۔ شریر لڑکا، بھی کچھ ایسے ہی من مرضی کے کاموں میں مشغول ہے۔

”ایک تھا لڑکا بڑا شریر — نام تھا اُس کا نور نذیر
اِک دن اُس کا جی للچایا — گاؤں سے چل کر شہر کو آیا
شہر میں آ کر اُس نے دیکھا — وہاں کا پیسا گاؤں جیسا
وہاں کا کھمبا ویسا ہی لمبا — وہاں کی روٹی ویسی ہی چھوٹی
وہاں کا ڈھول ویسا ہی گول“(۷۶)

اس نظم میں جس لڑکے کا ذکر ہے اس کا نام نور نذیر ہے۔ ایک دن اس کے دل میں تجسس آیا اور وہ گاؤں سے شہر کو آ گیا۔ تجسس جو کہ بچوں کی طبیعت کا اہم اور لازمی جزو ہے۔ اُس کے ذہن میں کہیں یہ تھا کہ گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی میں بے حد فرق ہوگا۔ وہاں کا ماحول اور گاؤں کا ماحول بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ لیکن جب اُس نے شہر میں آ کر دیکھا تو کچھ بھی نیا دیکھنے کو نہ ملا۔ ہر شے جیسی گاؤں میں تھی ویسی ہی شہر میں بھی تھی۔ اس لیے بچوں کو چاہیے کہ وہ خود کی مرضی نہ کریں۔ ورنہ نقصان اُٹھائیں گے۔ بڑوں کی عمر اور تجربہ بچوں سے زیادہ ہے۔ لہٰذا ان سے مشورہ ضرور لیں۔ پھر کوئی کام کریں۔ اس میں بچوں کی بھلائی ہے۔

بچے ہر شے میں اپنے لیے سب سے بہترین شے کا انتخاب کرتے ہیں۔ انھیں اپنے لیے ہر شے عمدہ چاہیے۔ چاہے وہ کوئی کھانے والی شے، خواہ کوئی کھلونا ہو۔ انھیں سب سے اچھی اور خوبصورت شے میں صرف اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس عمر میں ویسے بھی خوبصورت رنگ، مختلف آوازیں اور مزے مزے کے کھانے بچوں کو بہت لبھاتے ہیں۔ ”خوانچے والا“ اسی سلسلے کی نظم ہے اور یہ نظم بہت خوبصورت مکالمے کے انداز میں لکھی گئی جس میں ایک بچہ خوانچے والے سے لڈو لینے کے لیے طول مول کر رہا ہے۔

”مُنّا : خوانچے والا خوانچہ لا — خوانچہ لا
خوانچے والا : مُنّے مجھ کو دام دکھا — دام دکھا
مُنّا : پہلے میں دیکھوں تو ذرا
لڈو تیرے کیسے ہیں؟ — کیسے ہیں؟
اچھے ہیں تو لے لوں گا

جیب میں میرے پیسے ہیں پیسے ہیں

خوانچے والا : لے لے پھر جھگڑا ہے کیا؟

سامنے تیرے رکھے ہیں"(۷۷)

یوں مُنّے اور خوانچے والے میں لڈو کے لین دین پر ایک مکالمہ ہوتا ہے۔ مُنّا اپنی پسند کے لڈو لینے پر بضد ہے اور خوانچے والا اس بات پر قادر ہے کہ اُس کے سارے لڈو بہترین ہیں۔ لیکن مُنّے کو لڈو پسند نہیں آتے۔ تو خوانچے والا یہ کہہ دیتا ہے کہ مسئلہ میرے لڈوؤں میں نہیں ہے بلکہ تمہارے پیسوں میں ہے جو کہ کھوٹے ہیں اور چل نہیں ملتے۔ بچوں کو شروع سے ہی چیز خریدنے کا طریقہ سکھانا چاہیے کہ کس طرح پہلے چیز پسند کرنی چاہیے۔ پھر اُس کی رقم ادا کرنا چاہیے اور اگر شے پسند نہ ہو تو خواہ بیچنے والا جو مرضی کہے، اُسے نہ لینے میں ہی بہتری ہے۔

بچے اکثر کام چور ہی ثابت ہوتے ہیں۔ جب اپنی باری ہوتی ہے کوئی بھی کام کرنے کی تو وہ ہمیشہ آسانی تلاش کرتے ہیں تاکہ انھیں زیادہ مشقت نہ کرنی پڑ جائے۔ جبکہ دوسری طرف سامنے والے سے یہی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اپنا کام پوری طرح محنت سے کرے گا۔ "ٹیٹو" نظم بھی اسی مسئلے کی عکاس ہے جس میں ٹیٹو آسان کام کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

"ٹیٹو کی شامت آئی ٹیٹو نے دال پکائی

میٹو نے دال نہ کھائی ہوتی تھی روز لڑائی

ہوتی تھی روز لڑائی میٹو کی باری آئی

میٹو نے کھیر پکائی دونوں نے مل کر کھائی

پھر بن گئے بھائی بھائی"(۷۸)

ٹیٹو نے اپنی باری پر ہمیشہ دال بنا دینی۔ جس پر روز لڑائی ہو جاتی تھی۔ کیونکہ اُس کا بھائی دال پسند نہیں کرتا تھا۔ جب میٹو کی باری آئی تو اس نے کھیر پکائی جس پر دونوں خوش ہوگئے اور صلح صفائی سے بھائی بھاوی بن کر رہنے لگے۔ ایک تو نظم کا یہ رُخ تھا۔ دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ اگر کہیں کوئی ایک انسان اپنی حرکتوں کی وجہ سے لڑائی پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے تو دوسرے کو چاہیے کہ بجائے کہ وہ لڑائی کو بڑھنے دے وہ اسے ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے اور جو بھی مسئلہ ہو اُسے بیٹھ کر آرام سے حل کیا جائے تاکہ بات بگڑنے کی بجائے سنور

جائے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔ ویسے بھی لڑائی جھگڑا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

''کیا چیز لوگے'' موسیقیت اور ترنم سے بھرپور نظم ہے۔ بچے کھیل کھیل جو کچھ کرتے ہیں، اُسی کی ترجمانی یہ نظم کر رہی ہے۔

''کیا چیز لوگے — چمچہ یا تھالی؟
تھالی بھری ہے چمچ ہے خالی — میں لوں گا تھالی
کیا چیز لوگے — روٹی کہ کیلا؟
روٹی ہے سب کی، میں ہوں اکیلا — میں لوں گا کیلا
تب تم کو مانوں مل جائے سب کچھ
کہتے تھے تب کچھ، دیتے ہو اب کچھ
میں لوں گا سب کچھ
میں لوں گا سب کچھ''(۷۹)

کھیل ہی کھیل بچوں میں کچھ چیزیں جیسے تھالی، چمچہ، روٹی، کیلا، بستہ بانٹنے کی بات ہو رہی ہے۔ اب بچے فطری طور پر ہی شاید کچھ لالچی ہوتے ہیں۔ وہ ہر شے میں اپنی پسند اور فائدہ دیکھتے ہیں۔ بے شک لالچ بُری چیز ہے اور بچوں، بڑوں سب کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ لیکن بچے ایسا لالچ عام طور پر یونہی کر جاتے ہیں۔ ویسے بھی عمر کے اس ابتدائی حصے میں وہ لین دین کے اس جذبے سے عاری ہوتے ہیں۔ جس سے محبت بڑھتی ہے اور بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ سارے ہی اچھے جذبہ پروان چڑھنے لگتے ہیں اور تب ان سب باتوں اور جذبوں کی سمجھ آتی ہے۔ لہٰذا اس نظم میں بھی بچہ وہی شے منتخب کر رہا ہے جس میں اُس کو کوئی فائدہ یا دلچسپی نظر آ رہی ہے اور آخر میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب کچھ لے گا۔ کیونکہ ابھی اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن بچو ں کو شروع سے ہی ان جذبوں سے آگاہ کرنا اور ان کے بارے میں تعلیم دینا بہت ضروری ہے تاکہ بڑے ہو کر وہ کوئی مزید غلطی نہ کریں۔

بچوں کی دنیا بے حد خوبصورت، رنگین اور عجیب ہوتی ہے۔ جہاں بچے تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ پودوں اور پھولوں سے باتیں کرتے ہیں۔ پریاں رات کو آ کر انھیں لوری دے کر سلاتی ہیں اور جانور ان کے

دوست ہوتے ہیں۔ صوفی تبسم نے انہی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں جانوروں جیسے چوہوں، بلیوں، شیر، مرغا، ریچھ، بندر، سانپ وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان جانوروں کا اچھا خاصا ذکر ہے۔ کہیں چوہوں سے دوستی ہے تو کہیں بلی کے نخرے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ کہیں شیر کا کا خونخار پن دکھایا گیا ہے تو کہیں سانپ اور ناگ کا ذکر ہے۔ مختصر یہ کہ ہر نظم کوئی نہ کوئی مقصد اور سبق لیے ہے۔ یہاں ایسی ہی نظموں کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

''پانچ چوہے''، ''چچوں''، ''چوہا''، ''چوہوں کی میٹنگ''، ''چوہوں کا ترانہ آزادی'' اور ''بلیاں اور چوہے'' یہ وہ نظمیں ہیں جن کا اہم کردار چوہے ہیں۔ لیکن ہر نظم کا پیغام مختلف ہے۔

''پانچ چوہے گھر سے نکلے   کرنے چلے شکار
ایک چوہا رہ گیا پیچھے   باقی رہ گئے چار
چار چوہے جوش میں آکر   لگے بجانے بین
ایک چوہے کو آئی کھانسی   باقی رہ گئے تین
تین چوہے ڈر کر بولے   گھر کو بھاگ چلو
ایک چوہے نے بات نہ مانی   باقی رہ گئے دو''(۸۰)

یوں پانچ چوہوں سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ ایک چوہے پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی سب سے خوبصورت بات اس کا آہنگ اور موسیقیت ہے۔ ساتھ ہی بچوں کو گنتی سکھانے کے حوالے سے اور حسابی نقطۂ نظر سے بھی بہت فائدہ مند ہے۔

نظم ''چچوں'' جو بے حد مختصر ہے اور بحر بھی بہت سادہ ہے۔ اسے نہ صرف بچے دلچسپی سے پڑھتے ہیں بلکہ اُسی قدر آسانی سے یاد بھی کر لیتے ہیں۔ یہ بچوں کی عمر کے انتہائی ابتدائی ادوار کے حوالے سے بہت بہترین نظم ہے۔ کیونکہ اس وقت جس قدر اُن میں صلاحیت ہوتی ہے، اُس لحاظ سے یہ نظم بہترین ہے۔

''چچوں چچوں چاچا   گھڑی پہ چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا   چوہا نیچے آیا''(۸۱)

ویسے تو اس نظم کا نہ کوئی مطلب ہے اور نہ ہی کوئی خاص مقصد ہے۔ سوائے اس کے کہ بچے اس سے

بے حد لطف اندوز ہوں گے۔ ورنہ نہ تو گھڑی پہ چوہا ناچ سکتا ہے اور نہ ہی چیچوں کا کوئی مطلب ہے۔ لیکن بچوں کے حساب سے دیکھا جائے تو سب حقیقت میں نظر آتا ہے۔ یہ نظم دراصل نرسری رائمز کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس کا مقصد خالصتاً صرف بچوں کو بہلانا ہے۔

اگلی نظم ''چوہا'' ہے جس میں بچہ اپنے پالتو چوہے کی بہت ساری خوبیاں گنوا رہا ہے۔ ایسے جیسے وہ دنیا کا سب سے نرالا چوہا ہو۔

''ہے مرے پاس اِک مِرا چوہا — خوبصورت سا دلربا چوہا
بلّی کو بھی سبق پڑھاتا ہے — ہے بہت ہی پڑھا لکھا چوہا
سو گیا دیکھ کر وہ بلّی کو — لوگ سمجھے کہ مر گیا چوہا
حرکتیں اس کی سب دلیروں کی — کام کا شیر نام کا چوہا''(۸۲)

چوہوں کے اسی سلسلے کی ایک اور نظم ''چوہوں کی میٹنگ'' ہے جس میں چوہے اپنی جان بچانے کے لیے بڑے بڑے ارادے بناتے ہیں۔ لیکن پھر کچھ نہ ہونے پر ہمت ہار جاتے ہیں۔

''او سُن جاؤ ایک بات مری — رات چوہوں نے ایک میٹنگ کی
جمع تھے چھوٹے اور بڑے چوہے — جہاں دیکھا نظر پڑے چوہے
چوہوں اور چوہوں کا ریلا تھا — جلسہ کیا تھا ایک میلا تھا''(۸۳)

یہ کافی طویل نظم ہے جس میں چوہوں کے اس دُکھ کی ترجمانی کی گئی ہے کہ بلّی نے ان کا جینا محال کیا ہوا ہے اور یہ سب اُس سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں سب کوئی نہ کوئی مشورہ دیتے ہیں۔ جس میں سب سے بہتر یہ ہے کہ بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے تاکہ گھنٹی کی آواز اس کے آنے کی خبر دے سکے اور چوہے اپنی جان بچاسکیں۔ لیکن ایک بزرگ چوہا اس وقت سے بھی اتفاق نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے یہ سوچو کہ بلّی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟ جو باندھے گا بلّی اُسے کون سا چھوڑے گی۔ یہ سُن کر سب چوہے پھر سے گھبرا جاتے ہیں اور بلّی اُن پر حملہ کرکے سب کو کھا جاتی ہے۔

طاقتور ہمیشہ کمزور پر غلبہ پا جاتا ہے اور یوں کمزور ہمیشہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کبھی کبھار کمزور اپنے سے مضبوط اور طاقتور دشمن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے تو تب بھی ناکامی اس کا منہ

دیکھتی ہے۔ لیکن اگر کمزور بھی مل کر ایک جُٹ ہو کر دشمن کا مقابلہ کر لیں تو اُسے بھی ہرا سکتے ہیں، خواہ دشمن کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، کبھی اپنے کمزور یا چھوٹے ہونے پر گھبرانا نہیں چاہیے اور دل اور حوصلہ بڑا کر کے حالات اور دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے تبھی کامیابی مقدر بنتی ہے۔

"چوہوں کا ترانہ آزادی" بھی اسی سلسلے کی نظم ہے۔ اس میں بھی کمزور اور طاقتور کو موضوع بنایا گیا ہے۔

"ہم ازلی شیر بہادر ہیں — یہ شیر تو خالی نام کا ہے
ہم چُوں چُوں چُوں چُوں کرتے ہیں — وہ میاؤں میاؤں میاؤں کرتی ہے
یہ تخت اور تاج ہمارا ہے — جنگل میں راج ہمارا ہے
سب اچھے کام ہمارے ہیں — یہ شیر میاں کس کام کا ہے" (۸۴)

چوہے جو کہ جنگل میں رہتے ہیں اور جنگل کا بادشاہ شیر ہے۔ چوہے اس سے بہت خار کھاتے ہیں اور اُن کا ماننا ہے کہ اصلی جنگل کے بادشاہ اور شہزادے وہ ہیں اور یہ شیر تو بس نام کا بادشاہ ہے۔ حالانکہ جنگل کے سارے اچھے کام یہ چوہے کرتے ہیں تو اس لیے بادشاہ کے تخت کے اصل حق دار یہ چوہے خود کو سمجھتے ہیں اور اب یہ اپنے سے بڑے اور طاقتور جانور کو بھی اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ تو جنگل کا قانون ہے کہ ہمیشہ طاقتور کمزور پر حملہ آور ہوتا ہے اور طاقتور کمزور پر برتری رکھتا ہے اور کمزور اگر اکیلا ہو تو وہ واقعی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر سارے کمزور کسی طاقتور کے خلاف متحد ہو جائیں اور ظلم کے آگے ڈٹ جائیں تو بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے لیے یہ سبق ہے کہ اگر کوئی بھی انسان حق پر ہے تو اُسے ظلم کے آگے جھکنا نہیں چاہیے بلکہ ہمت، حوصلے، صبر اور اتفاق سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یوں وہ بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا سکتے ہیں۔

"بلیاں اور چوہے" اگلی نظم ہے۔ اس میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بہت سے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان حالات کے لیے بہت صبر اور حوصلے سے کام لینا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ اس نظم کے قاری بچے ہیں تو انداز وہی بچوں کو سمجھانے والا ہے۔

" ہے نرالی بہت میری بلی — ہے یہ چوہا بھی اور یہی بلی
میری بلی میں ایک خوبی ہے — کبھی چوہا ہے اور کبھی بلی
شیر آیا تو بن گئی چوہا — چوہا آیا تو بن گئی بلی
تیری بلی کو کھا گیا چوہا — میرے چوہے کو کھا گئی بلی" (۸۵)

حالات اور وقت کبھی ایک سے نہیں رہتے بلکہ یہ آپ کے حق میں ہوتے ہیں اور کبھی یہ آپ کے مخالف ہوتے ہیں۔ کہیں آپ کمزور ہوتے ہیں اور کہیں آپ طاقتور ہو جاتے ہیں۔ کبھی آپ کو حاکیت مل جاتی ہے او رکبھی محکومیت آپ کا مقدر بنتی ہے۔ لیکن ہر حال میں اور ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے اور یہی بات بلی اور چوہے کے کرداروں کو لے کر اس نظم میں بتا دی گئی ہے کہ کبھی حالات چوہوں کے حق میں ہوں تو وہ شیر بن جاتے ہیں اور کبھی جب وقت بُرا چل رہا ہو تو بلی کے ڈر او رخوف سے بھی چوہے سو نہیں پاتے۔ اچھا اور بُرا دونوں وقت سب پر آتے ہیں۔

صوفی تبسم نے بہت ساری مختصر نظمیں لکھی ہیں جن کو بچے نہ صرف باآسانی یاد کر سکتے ہیں۔ بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھ بھی لیتے ہیں ۔ ایسی ہی مختصر نظموں کا ذکر اور تحریر کیا جائے گا۔ یہ نظمیں نرسری رائمز کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔

سب سے پہلے نظم ''بلی'' ہے۔ یہ چار مصروں پر مشتمل نظم ہے۔

''دنیا کے رنگ نرالے
بلی نے چوہے پالے
چوہوں نے دھوم مچائی
بلی کی شامت آئی''(۸۶)

بلی اور چوہا ازلی دشمن ہیں۔ بلی چوہے کو کہیں بھی دیکھ لے تو وہ اُسے چھوڑتی نہیں بلکہ اُسے خوراک بنا لیتی ہے۔ اسی طرح چوہا بلی کو دیکھتے ہی بھاگ جاتا ہے لیکن اس نظم میں ایسی بلی کا ذکر ہے جس نے چوہے پال رکھے ہیں اور اُن چوہوں نے بلی کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے جو کبھی بھی عقل میں نہیں آ سکتی۔ لیکن بچوں کے ذہن میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے اُن کے لیے یہ نظم حقیقت کا روپ دھار سکتی ہے۔

''سانپ کی دُم مڑوڑ دو
چلائے تو چھوڑ دو
ایک دو ایک دو
چیونٹی کا سر پھوڑ دو

چلائے تو چھوڑ دو

ایک دو ایک دو"(۸۷)

سانپ ایک خطرناک اور زہریلا جانور ہے اور اس کے ساتھ کھیلنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بچوں کی ہر جانور کے ساتھ ہر چرند پرند کے ساتھ دوستی اور محبت ہوتی ہے۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں کسی بھی نقصان کی پرواہ کیے بغیر بچے ہر شے سے مانوس ہو جاتے ہیں اور ہر جانور کو اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی بچے سانپ اور چیونٹی کے ساتھ ایسی ہی اٹکھلیاں کر رہے ہیں۔

"ایک تھا تیتر، ایک بٹیر

لڑنے میں تھے دونوں شیر

لڑتے لڑتے ہوگئی گم

ایک کی چونچ اور ایک کی دُم"(۸۸)

لڑائی جھگڑا بہت بُری چیز ہے ج سمیں کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دونوں فریقین اس سے نقصان ہی اُٹھاتے ہیں جس طرح اس نظم میں بچوں کو بھی بتایا گیا ہے کہ تیتر اور بٹیر دونوں لڑنے میں بڑے تیز تھے۔ لیکن جب دونو ں کی لڑائی ہوئی تو دونوں کو ہی نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایک کی چونچ نہ رہی اور دوسرے کی دم غائب ہوگئی۔ لہٰذا لڑائی جھگڑے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے مسئلے مسائل کو جس قدر ہو سکے۔ بات چیت کے ذریعے حل کرنا چاہیے ۔ کیونکہ ہر مسئلے کا حل لڑائی نہیں ہوتی۔

"ریچھ نچانے والا آیا، ریچھ نچانے والا

پاؤں بھی کالے، ہاتھ بھی کالے

مُنہ بھی اُس کا کالا

جنگل سے اِک ریچھ کا بچہ

لے کر شہر کو آیا

گھر میں اُس کو ناچ سکھایا

گھر میں اُس کو پالا

ریچھ نچانے والا آیا، ریچھ نچانے والا"(۸۹)

ریچھ اور بندر کا تماشا بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد ہے۔ پہلے گلی محلوں میں ایسے ہی ریچھ نچانے والا آ یا کرتے تھے اور جنھیں دیکھ کر بچوں اور بڑوں کا ایک مجمع لگ جاتا تھا۔ یہ مداری جنگل سے ریچھ کا بچہ پکڑتے تھے۔ اسے گھر لا کر رکھتے اور پالتے تھے۔ اسے شروع سے ہی تماشے سکھا دیتے تھے۔ کرتب سکھا دیتے تھے۔ پھر جنھیں لوگوں کو دکھا کر یہ مداری اپنے نان نفقے کا بندوبست کرتے تھے۔ یوں مداری کی کمائی ہو جاتی تھی اور بچوں کو اپنے گھروں کے آس پاس بھی محظوظ ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ حالانکہ یوں جانوروں کے بچوں کو پکڑنا اور زبردستی سے انھیں سب کچھ سکھانا بہت غلط بات اور ظلم ہے۔ کیونکہ ان جانوروں میں بھی جان ہوتی ہے۔ انھیں بھی بے حد افسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنے فائدے کے لیے جانوروں پر یوں ظلم اور قید کا عذاب نہیں ڈالنا چاہیے۔

"ٹمک ٹالا، ٹمک ٹالا
بلی کا منہ ہوگیا کالا
مرغی بولی
غُوں غُوں غُوں
چوزہ بولا
چُوں چُوں چُوں
مُرغا بولا
ککڑوں کوں"(۹۰)

اُردو لغات میں ٹمک ٹالا کوئی لفظ نہیں ہے جس طرح بچوں کی عموماً یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خود سے ہی بہت سے الفاظ بنا لیتے ہیں یا اپنی بات بڑوں تک پہنچانے اور سمجھانے کے لیے ہر شے کا نام اپنے انداز سے رکھ لیتے ہیں۔ کچھ یہی لہجہ اور انداز اس نظم ہے اور مقصد صرف بچوں کو بہلانا ہے۔

"بندریا نے گھگرا پہنا
بندر نے شلوار
بن ٹھن کے جب گھر سے نکلے، ہوگئی تکرار
بندریا نے چُھری اُٹھالی

بندر نے تلوار

لڑتے لڑتے ہو گئے گھائل

کوئی نہ مانا یار''(۹۱)

بندر اور بندریا دونوں گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ دونوں نے لباس وہی مشرقی پہنا ہے۔ بندریا نے گھگرا پہنا ہے اور بندر نے شلوار پہن رکھی ہے۔ صوفی تبسم کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے اپنی تمام نظموں میں اپنی تہذیب اور ثقافت کو کہیں نہ کہیں ضرور دکھایا ہے تا کہ بچوں کو اپنی ثقافت کے بارے میں بھی پتہ چل سکے اور اس اکیسویں صدی کے تیز رفتار دور میں کہیں وہ اپنی ثقافت سے دور نہ ہو جائیں۔ لہٰذا یاددہانی کا یہ سلسلہ ہر نظم میں چلتا آ رہا ہے۔ دوسرے پھر سے وہی بحث اور تکرار دکھائی گئی ہے جو کہ بالکل بھی اچھی چیز نہیں۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ لڑائی کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ لڑائی دونوں فریقین کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لہٰذا بچوں کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ چھوٹی عمر سے ہی اس بحث و تکرار سے اور لڑائی جھگڑا سے بچیں۔

''ٹمک ٹمک ٹمک ٹم

تیری چڑیا کی اِک دم

میری مینا کے دو پر

ایک ادھر اور ایک اُدھر

تیری چڑیا شور مچائے

میری مینا گانا گائے''(۹۲)

اس نظم میں بھی بچوں کی اُسی عام سی عبادت کی عکاسی کی جا رہی ہے کہ میری مینا یا میرا کھلونا دوسرے سے بہتر ہے ۔ اس نظم میں ایک بچہ دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ میری مینا تمہاری چڑیا سے زیادہ خصوصیات رکھتی ہے۔ یہ برتری کی عادت بچوں کے علاوہ بڑوں میں بھی ہوتی ہے کہ کسی طرح دوسروں کے مقابلے میں ترقی اور برتری حاصل کر لی جائے۔ لہٰذا بچوں میں اس عادت کا ہونا فطری عمل ہے۔ لیکن بچوں کو سکھانا چاہیے کہ اپنی اشیاء کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کھلونوں سے بھی محبت کریں۔

''مرغے میں نے انڈہ دیا

مُرغی تُو نے خوب کیا

انڈے اتنے چنگے ہیں
پاؤں میرے ننگے ہیں
کیسی باتیں کرتی ہو؟
انڈے بیچو جوتا لو"(۹۳)

مُرغے اور مُرغی کا ایک مکالمہ دکھایا گیا ہے کہ مرغی نے انڈے دے رکھے ہیں۔ جس پر مُرغا اس کی خوب تعریف کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مُرغی کا یہ شکوہ ہوتا ہے کہ انڈے تو اچھے ہیں۔ پر میرے پاس جوتا نہیں ہے۔ یعنی کہ میں اپنی ضرورت کی شے سے بھی قاصر ہوں۔ اس پر مُرغا یہ مشورہ دیتا ہے کہ انڈے فروخت کر دو اور اس سے جوتا لے لو یعنی آپ کے پاس جو چیز ہو، ضرورت سے زیادہ اُسے بیچ کر دوسری ضروریات زندگی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

"ایک نرالا شہر
شہر کے اندر نہر
نہر کے بیچ میں آگ
آگ میں کالا ناگ
ناگ کے اُوپر پیڑ
پیڑ کے نیچے بھیڑ
بھیڑ کے سر پر مور
مور مچائے شور"(۹۴)

نظم کا نام ہی "نرالا شہر" ہے جس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس شہر میں ہر کام انوکھا اور نرالا ہوتا ہوگا۔ ہر مصرعے کے شروع اور آخر میں لفظوں کی تکرار ہے جس سے موسیقیت پیدا ہو رہی ہے۔ جس طرح بچے بات سے بات جوڑتے چلے ہیں، کچھ ایسا ہی انداز میں نظم ہے۔ ورنہ نہ نہر کے اندر آگ ہو سکتی ہے اور نہ آگ میں کالا ناگ ہو سکتا ہے۔ بچے کافی نئے الفاظ سیکھیں گے اور ساتھ ہی ساتھ خوب لطف اندوز ہوں گے۔

"نہر میں آگ" اور "نرالا شہر" دونوں نظمیں ایک جیسی ہیں۔ دونوں کا موضوع اور انداز ایک ہی ہے۔

''نہر میں اِک دن

لگ گئی آگ

پُھوں پُھوں کرتا

نکلا ناگ

طوطا بولا

ٹیں ٹیں ٹیں

کوا بولا

کیں کیں کیں

بکری بولی

مَیں مَیں مَیں''(۹۵)

جانوروں اور پرندوں کی آوازوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے پُھوں پُھوں، ٹیں ٹیں، کیں کیں، مَیں مَیں وغیرہ۔ بچوں کے تخیل کی دنیا کے حوالے سے یہ سچ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ان کے تخیل کی دنیا بے حد وسیع ہوتی ہے۔ یعنی نہر میں آگ اور ناگ کا نکلنا۔ باقی موسیقیت پیدا کرنے کے لیے تکرار کا استعمال کیا ہے۔

''بلی کو سمجھانے آنے چوہے کئی ہزار

بلی نے اِک بات نہ مانی روئے زارو زار

سُنو گپ شپ، سُنو گپ شپ ناؤ میں ندی ڈوب چلی

ہاتھی کو چیونٹی نے پیٹا مینڈک شور مچائے

اُونٹ نے آ کر ڈھول بجایا مچھلی گانا گائے

سُنو گپ شپ ، سُنو گپ شپ ناؤ میں ندی ڈوب چلی''(۹۶)

گپ عموماً اس بات یا کہانی کے بارے میں کہا جاتا ہے جس کا دور دور تک حقیقت سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ ہو یعنی وہ بات مکمل طور پر خود ساختہ یا جھوٹ پر مبنی ہو اور بات بھی ایسی بیان کی جائے جسے عقل ماننے سے انکاری ہو۔ جیسا کہ اس نظم میں ہے کہ ناؤ میں ندی ڈوب چلی ہے۔ عموماً تو ندی میں ناؤ ڈوبا کرتی ہے۔ اسی طرح ہاتھی کو چیونٹی پیٹ نہیں سکتی۔ اونٹ ڈھول نہیں بجاتا اور مچھلی گانا نہیں گا سکتی۔ اسی طرح چاند اور سورج ایک ساتھ

نہیں ہو سکتے اور تو اور شیر اور بکری جو کہ ازلی دشمن ہیں یا شیر جو کہ بکری کو کبھی زندہ نہیں چھوڑتا وہ بھلا بکری کے ساتھ مل کر کیسے بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی چوہے بلی کو کوئی بات سمجھا سکتے ہیں یعنی ہر وہ بات جو انسانی عقل سے باہر ہے، اُسے گپ کہا جاتا ہے او ران تمام باتوں کا ذکر بھی اس نظم میں کر دیا ہے لیکن جہاں تک بچوں کی بات ہے تو اُن کی اپنی دنیا ہے۔ وہ اپنے کھیل اور تصورات کی دنیا میں یہ سب سچ ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے حوالے سے ان کو لبھانے کے لیے بہترین نظم ہے اور بے حد دلچسپی کا باعث بھی ہے۔

بچے عموماً پرندے جیسے طوطے، مور، کبوتر وغیرہ پالتے ہیں اور ان پالتو جانوروں سے اُنھیں بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ ''گیٹو گرے'' اسی بات کی عکاسی کرتی نظم ہے۔ جیسا کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

''اِک تھا گیٹو گرے | اُس کے دو مور تھے
اِک کا کالا تھا سر | اِک کے پیلے تھے پَر
دانہ کھاتے تھے وہ | دُم ہلاتے تھے وہ
شام کو دن ڈھلے | اپنے گھر سے چلے
تھے بڑی لہر میں | آ گئے شہر میں''(۹۷)

یہ طویل نظم گیٹو اور اُس کے دو پالتو موروں پر ہے کہ کس طرح وہ ان کا خیال رکھتا ہے۔ اُن سے محبت کرتا ہے اور مور بھی اپنے مالک سے بہت مانوس ہوتے ہیں اور ایک دن مور چلتے چلتے کافی دور نکل جاتے ہیں۔ واپسی میں دیر پر گیٹو گھبرا جاتا ہے۔ لیکن اس کی ماں اُسے موروں کو ڈھونڈنے جانے کے لیے منع کر دیتی ہے کہ وہ مور خود ہی واپس آ جائیں گے۔ کیونکہ ماں کو اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے کہ کہیں اپنے موروں کو ڈھونڈتا گیٹو خود نہ کھو جائے۔ جب مور واپس آتے ہیں تو گیٹو محبت اور فکر کے ملے جلے تاثرات میں انھیں ڈانٹ دیتا ہے اور مور اپنے مالک کی اس محبت بھری ڈانٹ پر خوش ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی اجازت کے بغیر کبھی بھی اکیلے باہر نہ جائیں اور بڑے جس کام سے روکیں تو رک جائیں اگر بڑے ڈانٹ دیں تو اس میں بھی ان کی بھلائی ہے۔ اُس پر ناراض ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ بلکہ بچوں کے لیے اس ڈانٹ میں موجود بھلائی کو سمجھنا چاہیے۔

''شمیم کی بلّی'' میں شمیم نے بلی پال رکھی ہے اور وہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ حالانکہ مدرسے

تک میں وہ اسے ساتھ لے کر جاتی ہے۔ پھر جو مدرسے میں اُودھم مچتا ہے۔ اس کا حال بھی اس نظم میں بیان کیا گیا ہے۔

''ایک لڑکی تھی ننھی مُنّی سی   موٹی سی اور تھن متھنی سی
نام اس کا تھا شمیم افغاں   پر اسے لوگ کہتے تھے چھمیاں
اس نے پالی تھی اِک بڑی بلی   جتنی وہ خود تھی اتنی سی بلی
جس طرف وہ قدم اُٹھاتی تھی   بلی بھی اس کے ساتھ جاتی تھی''(۹۸)

شمیم کو اپنی بلی بے حد لگاؤ تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے مدرسے لے جاتی ہے۔ اکثر بچوں کو یہ شوق اور عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے کھلونوں اور پالتو جانوروں کو اپنے ساتھ مدرسے تک لے جانا چاہتے ہیں۔ اب بلی تو مدرسے چلی جاتی ہے لیکن جیسے ہی وہاں چوہا آتا ہے تو پھر مدرسہ کم اور بلی چوہے کے لڑائی جھگڑے کا میدان زیادہ لگتا ہے اور اسی لڑائی اور بھاگم بھاگ میں ماسٹر صاحب بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہر کام اپنے وقت اور موقع پر ہی اچھا لگتا ہے۔ پڑھائی کے وقت صرف پڑھائی ہونی چاہیے اور مدرسے صرف پڑھائی کے لیے جایا جائے اور کھیل کود کے لیے الگ سے وقت نکالیں۔ شروع سے ہی بچوں کو ان باتوں کا عادی بنا لیا جائے تو اُتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

''مُرغا جو ہے منڈیر پہ بیٹھا   کُکڑوں کُکڑوں گائے
جو بھی اس کی دُم کو پکڑے
خود مُرغا بن جائے
اِک مُرغی کا اِک انڈہ ہے
جو بھی ہاتھ لگائے
انڈے میں سے چوزہ بولے
ہائے ہائے ہائے''(۹۹)

صوفی تبسم نے اس نظم میں لفظ منڈیر استعمال کیا ہے جو بچوں کے لیے بالکل نیا ہے۔ مرغا جو کہ منڈیر پر بیٹھا ہوا بانگیں دے رہا ہے۔ اگر کوئی اُسے چھیڑے تو مرغا اُسے نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح مرغی کا جو ایک انڈہ ہے۔

اگر کوئی اُسے بھی ہاتھ لگاتا ہے تو مرغی فوراً سے اپنے انڈے کے دفاع کے لیے آ جاتی ہے۔ انسان ہو یا جانور اگر بلاوجہ کسی کو بھی تنگ کریں گے تو وہ اپنا دفاع کرنا جانتا ہے۔

بچوں کے بچپن میں ان کی کل کائنات ان کے کھلونے ہوتے ہیں۔ جنھیں وہ بہت پیار اور احتیاط سے رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوسرے بچوں کو بھی اپنے کھلونے دینے سے گریز کرتے ہیں اور خاص طور پر لڑکیوں کے لیے تو اُن کی گڑیا اُن کی بہترین دوست ہوتی ہیں۔ وہ اسے سجاتی سنوارتی ہیں۔ اس سے بے شمار باتیں کرتی ہیں۔ بچپن میں ماں کے بعد اُن کی سب سے اچھی ساتھی اُن کی گڑیا ہی ہوتی ہے اور صوفی تبسم اس بات سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اس سلسلے میں ثریا کی گڑیا، گڑیا اور عذرا کی گڑیا کے عنوان سے کچھ بہت خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جن کا یہاں جائزہ لیا جائے گا۔ اس سلسلے کی پہلی نظم 'گڑیا' ہے۔

''عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے
گھنٹی بجاؤ اس کو جگاؤ
تو یہ ہے میری میں نہ جگاؤ
وہ رو پڑے گی مجھ سے لڑے گی'' (۱۰۰)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ گڑیا لڑکیوں کی بہترین دوست اور ساتھی ہوتی ہے۔ اکثر جب بہن بھائی آپس میں کسی بات پر اُلجھ پڑتے ہیں تو بھائی اُس وقت ہمیشہ بہنوں کی گڑیا کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات وہی بھی جانتے ہیں کہ گڑیا ان کی بہن کے لیے کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ حالانکہ گڑیا تو ایک بے جان کھلونا ہے۔ لیکن بچپن کی معصومیت اور بھولا پن اُن کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھنے لگتا ہے جس میں احساسات اور جذبات ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب گڑیا کو تنگ کیا جائے کہ لڑکیاں (چھوٹی بچیاں) شور مچانے لگتی ہیں۔ اس لیے جب عذرا کی گڑیا کو جگانے کی بات کی گئی ہے تو سب نے توبہ کی ہے کہ اگر شور سے گڑیا اُٹھ گئی تو وہ تو رو دے گی اور عذرا لڑنا شروع کر دے گی۔ ویسے بھی گہری نیند سے کسی کو بھی یوں شرارت کر کے جگانا نہایت بُری حرکت ہے۔ اس لیے بچوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خواہ کوئی بڑا سو رہا ہو یا چھوٹا سو رہا ہو۔ اُن کے آرام کا مکمل خیال رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ سوتے ہوئے کہ پاس شور نہ کیا جائے اور ایسی ہی کھیل کے ذریعے بچے بہت ساری ضروری باتیں اور عادات سیکھ جاتے ہیں۔

اگلی نظم ''ثریا کی گڑیا'' ہے۔ یہ چار مصروں پر مشتمل مختصر سی نظم ہے۔

''ثریا کی گڑیا نہانے لگی نہانے لگی ڈوب جانے لگی
بڑی مشکلوں سے بچایا اُسے کنارے پہ می ں کھینچ لایا اُسے''(۱۰۱)

کھلونوں خصوصاً گڑیا سے متعلق بچوں کے جذبات اور خیالات کہ جیسے وہ بھی انسان ہی ہوں جیسے اُن میں جان ہو۔ لہٰذا جب گڑیا کو جاندار کے طور پر لیا جائے گا تو پھر اگر وہ کسی مصیبت میں ہو تو اُسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کسی اور جاندار کو بچانا ضروری ہے۔ بچوں کے جذبات اور احساسات کو انہی کے انداز میں اس نظم میں بیان کیا گیا ہے کہ ثریا کی گڑیا نہاتے وقت ڈوبنے لگی تو اُسے بڑی مشکل سے بچا لیا گیا۔ اب ثریا اپنی گڑیا کے لیے اسی طرح فکر مند ہوگی جس طرح کسی اور دوست یا بہن بھائی کے لیے پریشان ہوا جاتا ہے۔

''گڑیا'' اور ''ثریا کی گڑیا'' اس سلسلے کی مزید دو نظمیں ہیں اور دونوں کا موضوع بھی ایک جیسا ہی ہے کہ ان کی گڑیا صرف اُنہی کے ساتھ رہتی ہے اور کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی۔

''کبھی چپ کبھی غل مچاتی ہے گڑیا ہر اِک طرح سے دل لبھاتی ہے گڑیا
نہ پوچھو مزاج اُس کا نازک ہے کتنا ذرا کچھ کہو منہ بناتی ہے گڑیا
وہ روئے تو میں چپ کراتی ہوں اُس کو میں رووں تو مجھ کو ہنساتی ہے گڑیا
کسی کے بھی وہ ساتھ رہتی نہیں ہے عجب شان اپنی دکھاتی ہے گڑیا''(۱۰۲)

اب ساتھ ہی ''ثریا کی گڑیا'' کا بھی ذکر کر لیا جائے۔

''سُنو اِک مزے کی کہانی سُنو کہانی ہماری زبانی سُنو
ثریا کی گڑیا تھی چھوٹی بہت نہ دُبلی بہت اور نہ موٹی بہت
جو سوتی تو دن رات سوتی تھی وہ جو روتی تو دن رات روتی تھی وہ
نہ امی کے ساتھ او رنہ بھیا کے ساتھ وہ ہر وقت رہتی ثریا کے ساتھ''(۱۰۳)

دونوں نظموں میں ایک ہی بات مدنظر ہے کہ لڑکیاں اپنی گڑیا سے بے حد محبت کرتی ہیں اور دونوں نظموں میں موجود بچیاں اپنی اپنی گڑیا کو اسی طرح رکھتی ہیں جیسے وہ ان ہی کی طرح جاندار ہیں۔ وہ اپنی گڑیا کسی اور کو نہیں دیتیں اور نہ ہی اُن کی گڑیا اُن کے علاوہ کسی اور کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ بچیوں کو اتنا خیال ہے کہ

ان کی گڑیا کو کوئی دُکھ نہ ہو۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتی ہیں کہ اپنی گڑیا کا جس قدر خیال وہ رکھ سکتی ہیں کوئی اور نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے وہ اپنی اپنی گڑیا کو ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔ دونوں کی گڑیا روتی بھی ہے ، شور بھی مچاتی ہے اور ان سے ڈھیروں باتیں بھی کرتی ہیں۔ اس سے بچوں میں دوسروں کا خیال اور احساس ذمہ داری جیسی عادات پروان چڑھتی ہیں۔

اس سلسلے کی آخری نظمیں ''ایک دو'' اور ''گنتی'' ہے۔

''ایک	دو	میری	بات	سُنو	
تین	چار	چنے	مسالے	دار	
پانچ	چھ	تم	نے	کھائے	تھے
سات	آٹھ	قطب	صاحب	کی	لاٹھ
نو	دس	آم	کا	میٹھا	رس''(۱۰۴)

☆☆☆

''ایک	دو	تین	چار
آؤ	مل کر	بیٹھیں	یار
پانچ	چھ		سات
سُنو	ہماری		بات
آٹھ	نو		دس
بات	ہماری		بس''(۱۰۵)

دونوں نظموں کا موضوع اور مقصد ایک ہی ہے۔ بس انداز تھوڑا جُدا ہے۔ دونوں نظمیں پڑھنے سے بچے کھیل ہی کھیل میں گنتی سیکھ جائیں گے۔ گنتی کے ساتھ ساتھ جو باتیں نظم میں کہی گئی ہیں اُن کا مقصد صرف اور صرف سیکھنے کے مرحلے کو آسان بنانا ہے۔

صوفی تبسم نے بچوں کی دلچسپی کی ہر شے سے اپنی اس نظموں کی دنیا کو رنگین بنایا ہے۔ اس میں اس قدر رنگ اور مزے مزے کی باتیں کر رکھی تھی۔ بچوں کا دل ان سے اُکتا نہیں سکتا اور تو اور بچوں کی ذہنی آزمائش کے

لیے کچھ پہیلیاں بھی ان نظموں کا حصہ ہیں جو بچے پڑھ کر نہ صرف خود بوجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر وہ کیا شے ہے جس کا ذکر اس پہیلی میں ہے۔ بلکہ اپنے دوستوں سے بھی وہ ایسی پہیلیاں پوچھتے رہتے ہیں اور یوں ذہنی آزمائش کے ساتھ ساتھ پہیلی بوجھے جانے پر ذہنی تسکین اور خوشی بھی حاصل کرتے ہیں۔

ان میں سے چند پہیلیوں کا ذکر یہاں پر بھی کر دیا ہے۔

''دیکھا ہم نے ایک پرندہ
کچھ پیلا کچھ سبز اور لال
پیٹ میں اس کے ایک ہی ہڈی
کھال کے نیچے اُس کے بال
خون ہے اُس کا میٹھا میٹھا
کڑوی کڑوی اُس کی کھال (آم)

☆☆☆

دیکھا ایک نیا حیوان
دُبلا پتلا اور بے جان
پیٹھ کے اندر اُس کی دُم
دو پاؤں ہیں اور چھ سُم
یونہی اس کا نام نہ بول
پہلے میری بات کو تول'' (۱۰۶)(ترازو)

☆☆☆

''دنیا میں اِک چیز نرالی
سر سے پاؤں تک سب کالی
جو کوئی اُس کے ہاتھ لگائے
ویسا ہی کالا ہو جائے (کوئلہ)

☆☆☆

بہت بڑا سا ایک پیالہ
جیسے کوئی کمرہ گول
ختم نہ ہوگا اس کا پانی
پیتے جاؤ ڈول کے ڈول" (۱۰۷) (کنواں)

لہٰذا ذہنی آزمائش اور کچھ نیا سکھانے کے حوالے سے ان پہیلیوں کا کردار بے حد اہم ہے اور بچے عموماً ایسی ذہنی آزمائشوں کو بے حد پسند کرتے ہیں اور ان کا جواب جاننے میں بہت دلچسپی اور محنت سے سوچتے ہیں۔

حوالہ جات (باب دوم)

۱۔ صوفی تبسم، ''خودنوشت''، مطبوعہ ماہنامہ نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، دوسرا حصہ ص ۱۰۹۳

۲۔ نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، ''صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حیات و خدمات''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع اوّل ۲۰۰۸، ص ۱۷۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۵۔ غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی، ''جھولنے''، فیروز سنز، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۱ء، ص ۹-۱۰

۶۔ ایضاً، ص ۷۴-۷۸

۷۔ نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حیات و خدمات''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع اوّل ۲۰۰۸، ص ۱۸۶

۸۔ غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی، ''کلیات اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں''، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲

۹۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے''، ایضاً، ص ۴۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۱۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے تین بھائی''، ایضاً، ص ۴۵

۱۲۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کا بنگلا''، ایضاً، ص ۴۶

۱۳۔ ''ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی''، ایضاً، ص ۴۹

۱۴۔ ''ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار''، ایضاً، ص ۵۱

۱۵۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا''، ایضاً، ص ۵۲

۱۶۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی''، ایضاً، ص ۵۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۸۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے''، ایضاً، ص ۵۵

۱۹۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کی بکری''، ایضاً، ص ۵۸

۲۰۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کا نانا''، ایضاً، ص ۶۰

۲۱۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کی آیا''، ایضاً، ص ۶۴

۲۲۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کیا کرے یار''، ایضاً، ص ۶۱

۲۳۔ ''ٹوٹ بٹوٹ نے کر لی شادی'' ایضاً، ص ۶۵

۲۴۔ ''مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۶۶-۶۷

۲۵۔ ''ٹوٹ بٹوٹ نرالا ہے''، ایضاً، ص ۶۸

۲۶۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کی کہانی''، ایضاً، ص ۷۰

۲۷۔ ''اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں''، ایضاً، ص ۷۲

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۹۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کے مہمان''، ایضاً، ص ۷۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۷۷

۳۱۔ ''ٹوٹ بٹوٹ بڑا ہشیار''، ایضاً، ص ۷۸

۳۲۔ ''آ نکڑا بانکڑا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۸۰

۳۳۔ ''پیارا ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً ص ۸۲

۳۴۔ ''شعر کہنے لگا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۸۳

۳۵۔ ''ٹوٹ بٹوٹ نے کھایا پان''، ایضاً، ص ۸۴

۳۶۔ ''ہر جگہ ایک سا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۸۵

۳۷۔ ''ٹوٹ بٹوٹ اک افسر ہے''، ایضاً، ص ۸۶

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ''رس بھرا مالٹا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۸۷

۴۰۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کا ٹیلی فون''، ایضاً، ص ۱۳۰

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ''ٹوٹ بٹوٹ کی دانائی''، ایضاً، ص ۱۳۱

۴۳۔ ''گاؤں میں آ گیا ہے ٹوٹ بٹوٹ''، ایضاً، ص ۱۲۹

۴۴۔ ''آؤ آؤ سیر کو جائیں''، ایضاً، ص ۸۸

۴۵۔ ''آؤ مل کر کام کریں''، ایضاً، ص ۱۳۹

۴۶۔ ''بادل''، ایضاً، ص ۹۵

۴۷۔ ''موسم بہار''، ایضاً، ص ۱۴۱

۴۸۔ ''بادلوں سے''، ایضاً، ص ۱۴۳

۴۹۔ ''آیا بسنت میلا''، ایضاً، ص ۱۰۵

۵۰۔ ''آہا آہا نکلا چاند''، ایضاً، ص ۱۴۲

۵۱۔ ''تارے'' ایضاً، ص ۱۰۹-۱۱۰

۵۲۔ ''رات دن''، ایضاً، ص ۱۱۹

۵۳۔ ''قائداعظم''، ایضاً، ص ۱۰۳

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۵۔ ''اقبال کا خواب''، ایضاً، ص ۱۰۲

۵۶۔ ''اقبال''، ایضاً، ص ۱۲۴

۵۷۔ ''اپنا راج''، ایضا، ص ۹۶

۵۸۔ ''دیس ہمارا''، ایضاً، ص ۱۰۱

۵۹۔ ''پیارا دیس ہمارا''، ایضاً، ص ۱۲۲

۶۰۔ ''یہ نشان یہ ہمارے وطن کا نشان''، ایضاً، ص ۱۲۵-۱۲۶

۶۱۔ ''میں کیا بنوں گا''، ایضاً، ص ۱۳۶-۱۳۷

۶۲۔ ''مدرسہ''، ایضاً، ص ۱۴۰

۶۳۔ ''چلا چل''، ایضاً، ص ۱۳۸

۶۴۔ ''بچو میرے بچو''، ایضاً، ص ۱۴۴

۶۵۔ ''میرا خدا''، ایضاً، ص ۸۹

۶۶۔ ''تو زمین آسمان کا مالک''، ایضاً، ص ۹۰

۶۷۔ ''نبی ہمارے''، ایضاً، ص ۹۱

۶۸۔ ''نعت''، ایضاً، ص ۹۳

۶۹۔ ''دُعا''، ایضاً، ص۹۲

۷۰۔ ''راجا رانی''، ایضاً، ص۲۳

۷۱۔ ''راجا رانی کی کہانی''، ایضاً، ص ۱۱۵-۱۱۶

۷۲۔ ''مُنّے رو لے''، ایضاً، ص ۲۱

۷۳۔ ''کھپرا''، ایضاً، ص ۲۹

۷۴۔ ''مُنّا اور لڈو''، ایضاً، ص ۳۰

۷۵۔ ''مُنّے کی جان''، ایضاً، ص۳۲

۷۶۔ ''شریر لڑکا''، ایضاً، ص۳۴

۷۷۔ ''خوانچے والا''، ایضاً، ص ۳۵

۷۸۔ ''ٹیٹو''، ایضاً، ص ۹۷

۷۹۔ 'تکیا چیز لو گے''، ایضاً، ص ۹۶

۸۰۔ ''پانچ چوہے''، ایضاً، ص۲۲

۸۱۔ ''چچوں''، ایضاً، ص ۲۵

۸۲۔ ''چوہا''، ایضاً، ص ۱۰۶

۸۳۔ ''چوہوں کی میٹنگ''، ایضاً، ص ۱۱۷

۸۴۔ ''چوہوں کا ترانہ آزادی''، ایضاً، ص۱۳۳

۸۵۔ ''بلیاں اور چوہے''، ایضاً، ص۱۳۴

۸۶۔ ''بلی''، ایضاً، ص ۱۹

۸۷۔ ''ایک دو''، ایضاً، ص ۳۱

۸۸۔ ''دونوں شیر''، ایضاً، ص ۲۷

۸۹۔ ''کالا ریچھ''، ایضاً، ص ۲۸

۹۰۔ ''ٹک ٹالا''، ایضاً، ص ۲۹

۹۱۔ ''بندر اور بندریا''، ایضاً، ص۳۳

۹۲۔ ’’ٹمک ٹم‘‘ ایضاً، ص ۲۴

۹۳۔ ’’زندہ‘‘، ایضاً، ص ۲۵

۹۴۔ ’’نرالا شیر‘‘، ایضاً، ص ۲۷

۹۵۔ ’’نہر میں آگ‘‘، ایضاً، ص ۳۰

۹۶۔ ’’گپ شپ‘‘، ایضاً، ص ۳۸

۹۷۔ ’’گیٹو گرے‘‘، ایضاً، ص ۹۸

۹۸۔ ’’شمیم کی بلی‘‘، ایضاً، ص ۱۱۱

۹۹۔ ’’مرغا اور چوزا‘‘، ایضاً، ص ۱۳۵

۱۰۰۔ ’’گڑیا‘‘، ایضاً، ص ۲۴

۱۰۱۔ ’’ثریا کی گڑیا‘‘، ایضاً، ص ۲۶

۱۰۲۔ ’’گڑیا‘‘، ایضاً، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۱۰۳۔ ’’ثریا کی گڑیا‘‘، ایضاً، ص ۱۱۳-۱۱۴

۱۰۴۔ ’’ایک دو‘‘، ایضاً، ص ۳۱

۱۰۵۔ ’’گنتی‘‘، ایضاً، ص ۱۹

۱۰۶۔ ’’پہیلی‘‘، ایضاً، ص ۳۹-۴۰

۱۰۷۔ ’’پہیلیاں‘‘، ایضاً، ص ۱۲۰

باب سوم

قیوم نظر کی بچوں کے لیے نظمیں اور ان کے موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ا۔ قیوم نظر —— مختصر تعارف

قیوم نظر کا اصل نام عبدالقیوم بٹ اور تخلص نظر ہے۔ یوں قیوم نظر پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ ن م راشد، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خود قیوم نظر اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ یوں کہتے ہیں:

> ''میری پیدائش پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں ہوئی .... میری پرورش پنجاب کے مختلف شہروں اور قصبوں میں ہوئی۔ میرا بچپن مختلف طبقوں اور محلوں میں بسر ہوا۔ اس کی وجہ میرے والد کی ملازمت تھی۔ وہ جہاں تبدیل کر جاتے، اپنے خاندان کو بھی ساتھ لے کر جاتے۔ اس لیے میں نے ابتدائی تعلیم ملتان اور مالاکنڈ سے لے کر دھرم شالہ تک کے سکولوں میں حاصل کی۔ جب والد صاحب تبادلہ امرتسر سے دھرم شالہ ہوا تو وہ خود پہلے چلے گئے اور ہم سے کہہ گئے کہ تم لوگ بعد میں آنا۔ اس زمانے میں سیالکوٹ سے دھرم شالہ تک ٹانگے چلتے تھے۔ میں اپنی والدہ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر دھرم شالہ روانہ ہوا۔ یہ سفر تکلیف دہ اور طویل تھا۔ لیکن دھرم شالہ کے لوگ، وہاں کے پہاڑ او رندیاں دیکھ کر میری سب کوفت دور ہوگئی۔ پھر میرے والد کا تبادلہ لاہور ہوگیا۔ اس طرح میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔''(۱)

> ''........... میٹرک انھوں نے اسلامیہ کالج، شیرانوالہ سے کیا۔ پھر دیال سنگھ کالج میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے انھوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔''(۲)

قیوم نظر ایک ذہین او رباصلاحیت طالب علم تھے۔ چنانچہ وہ اپنے تعلیمی دور میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ بی ۔اے کے بعد انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے لیے انھوں نے ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا۔لیکن جلد ہی انھیں یہ احساس ہوا کہ اگر انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی تو ان کے چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا انھوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر ایک پرائمری سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ پہلی جنگ عظیم کے باعث وہ اقتصادی بدحالی کا دور تھا۔

''قیام پاکستان کے بعد جب ۱۹۴۸ء میں اورینٹل کالج میں ایم اے اُردو کی کلاسیں شروع ہوئیں تو قیوم نظر ان چند طالب علموں میں سے تھے جنھوں نے ایم اے اُردو کے پہلے سیشن میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۰ء میں ایم اے کر لیا۔ انھوں نے ایم اے میں جو تحقیقی مقالہ لکھا وہ امانت لکھنؤی کی اندرسبھا کے بارے میں تھا۔ یہ مقالہ اب شائع ہو چکا ہے۔

> ''قیوم نظر۵۳-۱۹۵۲ء میں محکمہ تعلیم سے دوبارہ وابستہ ہوگئے اور گورنمنٹ کالج لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں اُستادمقرر ہوگئے۔ دو اڑھائی سال وہیں رہے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ اس دران وہ اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو کی ایک کلاس بھی پڑھایا کرتے تھے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ماہر مضمون (سبجیکٹ سپیشلسٹ) کے طور پر کام کرتے رہے۔ جب نیشنل سنٹر قائم ہوا تو اس کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کے طور پر مامور ہوگئے۔ کچھ عرصہ سول سروس اکیڈمی میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اورینٹل کالج میں شعبہ پنجابی کے پہلے صدر شعبہ کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہوا۔''(۳)

قیوم نظر کی شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہ اسلامیہ سکول شیرانوالہ گیٹ میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں انھیں ماسٹر محمد دین جیسے اُستاد ملے اور وہیں اُن کی ملاقات ملک مراتب علی سے ہوئی۔ قیوم نظر نے ان سے شعر کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے بتایا کہ شعر بہت مشکل کام ہے تو قیوم نظر نے ارادہ کر لیا کہ وہ شعر ضرور کہیں گے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیوم نظر نے باتیں بھی پابند انداز میں کہنا شروع کر دیں۔ اسی طرح شاعری کی ابتدائی منزل پر انھوں نے ایک غزل فارسی کے اُستاد نصرالدین کو دکھانے کے لیے دی تو انھوں نے

غزل اپنے تھیلے میں رکھ دی۔ یوں یہ غزل اُن کے تھیلے کی نذر ہوگئی۔ مراتب صاحب نے ہی قیوم نظر کا تخلص نظر منتخب کیا۔

ملک مراتب علی نے قیوم نظر کو مشورہ دیا کہ وہ عابد علی عابد کے پاس جائیں۔ قیوم نظر عابد علی عابد کے پاس گئے تو انھوں نے کہا کہ وہ شاگرد نہیں رکھتے۔ قیوم نظر دوبارہ ان کے پاس غزل لے کر گئے تو عابد صاحب نے انھیں گھر آنے کی دعوت دی۔ وہاں ان سے غزل سُنی اور مشورہ دیا کہ وہ شاعری چھوڑ کر کوئی اور کام کریں۔ لیکن قیوم نظر اس بات پر مصر رہے کہ وہ شاعری ضرور کریں گے کیونکہ ان کے اندر کا شاعر انھیں شعر کہنے پر اُکساتا رہتا تھا۔ چنانچہ عابد علی عابد بھی ان کے جذبہ سے متاثر ہوگئے اور انھیں ایک طرح مصرع دیا اور کہا اس پر غزل لکھ کر لاؤ جب قیوم صاحب اس پہ غزل لکھ کر لے گئے تو عابد صاحب نے اس میں موجود نقائص کی نشاندہی کی اور کہا اب اپنی غزل کی اصلاح بھی خود کریں۔ یوں بار بار کی کاوشوں سے قیوم نظر اپنے اندر کے شاعر کو سامنے لانے میں کامیاب ہوگئے۔

قیوم نظر کی ذات جس قدر شاعری سے عبارت ہے ۔ اسی طرح وہ حلقۂ اربابِ ذوق کے بھی ایک سرگرم رکن تھے۔ جب حلقۂ ارباب ذوق قائم ہوا تو کچھ ہی عرصہ میں اس کی سرگرمیاں قیوم نظر کے زیراثر آ گئیں۔ اگرچہ انھیں میراجی کی رہنمائی حاصل تھی۔ لیکن عملی طور پر جس قدر محنت اور لگن کے ساتھ انھوں نے حلقہ کو چلایا اور اسے ایک باقاعدہ شکل دی۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے حلقہ کو ایک نظریہ ادب دیا۔ جسے مخالفین نے ''ادب برائے ادب'' کا نام دیا۔ لیکن قیوم نظر نے مخالفین کے حملوں کی کبھی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ وہ کئی بار حلقہ کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ایک طویل عرصے تک مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ فعال ترین رکن ہونے کی وجہ سے ان کی ہر بات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ پھر جب حلقۂ اربابِ ذوق مرکز قائم ہوا تو وہ تین چار سال تک اس کے سیکریٹری جنرل رہے۔ ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے ساتھ ان کا تعلق ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۲ء تک رہا۔

قیوم نظر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ تخلیق کار کے سامنے اس کی تخلیق پر تنقید کو انھوں نے باقاعدہ شکل دی۔ وہ اور یوسف ظفر اپنی تخلیقات تنقید کے لیے پیش کرتے تھے۔ وہ ''حلقہ'' کے لیے اس قدر پُرجوش تھے کہ دوپہر میں بھی سائیکل پر سفر کرتے اور ادیبوں کو ''حلقہ'' کے اجلاس میں شرکت کے لیے مدعو کرتے۔ یہ اعزاز بھی قیوم نظر کو حاصل ہے کہ انھوں نے ''حلقہ'' کی جانب سے ۱۹۴۵ء میں شاعر کا پہلا انتخاب شائع کیا۔

قیوم نظر بعض رسائل کے مدیر بھی رہے۔ قیام پاکستان سے قبل وہ ایک رسالہ 'کتاب' کے مدیر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ "نئی تحریریں" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے کوئی پانچ شمارے نکلے۔ یہ پرچہ انھوں نے حلقہ اربابِ ذوق کے لیے نکالا۔ "نئی تحریریں" ایک معیاری ادبی جریدہ تھا۔ لیکن جیسا کہ ہمارے ہاں روایت ہے کہ اچھا ادبی پرچہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا وہ پرچہ بھی بند ہوگیا۔

قیوم نظر کی حقیقی پہچان حلقہ اربابِ ذوق سے وابستگی تھی۔ حالات ایک جیسے نہیں رہتی۔ ان میں خارجی عوامل اور محرکات تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق بھی ان تبدیلیوں کی زد میں آ گیا اور ایک حلقہ کئی حلقوں میں تقسیم ہوگیا۔ قیوم نظر اس سے الگ ہوگئے یا حالات نے انھیں اس سے الگ کر دیا۔ مگر آج بھی حلقے کے شاندار ماضی کا تصور قیوم نظر کے بغیر ممکن نہیں۔

قیوم نظر ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے۔ ان کی زندگی کا سفر بلندیوں کا سفر ہے۔ ایک اُفق سے دوسرے اُفق تک رسائی حاصل کرنے کا سفر ہے۔ یہ مادی سفر ان کے لیے تخلیقی سفر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ تخلیقی عمل سے وہ کبھی کنارہ کش نہیں ہوئے تھے۔

قیوم نظر کے قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ڈاکٹریٹ کے لیے انھوں نے امانت لکھنؤی کی اندر سبھا کا تنقیدی تجزیہ کے حوالے سے کام شروع کیا تھا۔ پروفیسر سید عابد علی کی زیرِ نگرانی بہت سا کام بھی مکمل کر لیا تھا۔ مگر یہ مقالہ مکمل نہ ہو سکا اور وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری سے محروم رہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ خود تو ڈاکٹر نہ بن سکے لیکن اس دور میں پی ایچ ڈی کے سلسلے میں تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی ضرور کی۔

قیوم نظر کا کردار بنیادی طور پر خلوص، لگن، احساس ذمہ داری اور حد درجے کی اُصول پرستی سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیمی معاملات میں وہ اپنے عزیز سے عزیز دوست کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اپنی جماعت (حلقہ ارباب ذوق) کے اغراض و مقاصد اور منشور سے کسی بھی رکن کی بے اعتنائی یا خلاف ورزی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف انھوں نے ادب کی خاصی قد آور شخصیات کو حلقہ کی رکنیت سے خارج کرنے میں اہم کردار ادا کیا وہاں کسی بھی سرکاری گرانٹ کو قبول نہ کرکے بھی بڑی بااختیار شخصیتوں کی ناراضگی قبول کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں سرکاری گرانٹ لینے سے حلقہ کی آزاد خیالی اور آزادیٔ فکر متاثر ہو سکتی تھی۔

قیوم نظر ضدی طبیعت کے مالک تھے۔ اگر وہ اپنے مؤقف پر ڈٹ جاتے تھے تو کوئی انھیں ہلا نہیں سکتا

تھا۔ ان کی ضد کے خلاف ہمیشہ ایک مخالف گروپ قائم ہو جاتا اور ہر مخالف گروپ ان کے عزیز اور قریبی دوستوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ قیوم نظر اپنے شاگردوں کی تربیت کرنے میں بھی خاصے سخت گیر تھے جو طالب علم ان کا جلال سہہ گیا، کندن بن گیا، جو بھاگ گیا، معتبر نہ بن سکا۔

قیوم نظر کا تعلق حلقہ اربابِ ذوق سے رہا مگر دوسرے مسلک کے ادیبوں سے بھی ان کا تعلق رہا۔ جب پنڈی سازش کیس سے رہا ہو کر فیض لاہور آئے تو جس ادبی جلسہ میں انھوں نے سب سے پہلے شرکت کی۔ وہ حلقہ اربابِ ذوق کا اجلاس تھا جو کہ ''یوم میرا جی'' کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت فیض صاحب نے کی۔ قیوم نظر نے ترقی پسند مصنفین کا تعاون ہمیشہ حاصل کیا۔ اکثر ترقی پسند ادیب نہ صرف ان کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالوں میں اپنی تخلیقات چھپواتے رہے بلکہ وہ ''حلقہ'' کے اجلاسوں میں اپنی تخلیقات کو بے تکلف تنقید کے حوالے کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

وہ ریڈیو پر میوزیکل پروگرام، فیچر اور ڈرامے دوسرے ناموں سے لکھتے رہے اور یہ سب کچھ انھوں نے اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھانے کے لیے کیا۔ قیوم نظر کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو ان کی تنظیمی صلاحیتیں ہیں۔ ''حلقہ اربابِ ذوق'' کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے ان صلاحیتوں کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ ان کی ان تنظیمی صلاحیتوں کا ایک بڑا سبب ان کی محفل آرائی تھی۔

قیوم نظر لوگوں سے روابطہ قائم کرنے اور پھر انھیں قائم رکھنے کا ہنر جانتے تھے بلکہ ان میں کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ قیوم نظر نے حلقہ اربابِ ذوق کی وساطت سے بہت سے نوار دانِ ادب کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ ان کی ذہنی تربیت میں بھی بڑا حصہ لیا اور ان کی رہنمائی میں انھوں نے ایک مستقل ازلی مقام اپنے لیے پیدا کر لیا۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں میں صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اس صلاحیت کو صحیح طور پر اُبھارنے میں قیوم نظر نے ان کی بہت مدد کی۔ یہ ایک طویل فہرست ہے۔ اس میں ضیا جالندھری، الطاف گوہر، شہرت بخاری، منیر نیازی، سجاد باقر رضوی، سجاد رضوی اور کشور ناہید وغیرہ کے نا لیے جا سکتے ہیں۔

قیوم نظر کی شخصیت وقت کے ساتھ نہیں رہی جو ایک زمانے میں بذلہ سنجی اور بے تکلفی سے عبارت تھی۔ اس زمانے میں ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے دوست ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ کچھ اس دنیا

سے رخصت ہوگئے اور کچھ لاہور سے باہر منتقل ہوگئے۔ قیوم نظر تنہا ہوتے چلے گئے ۔ جوں جوں پیری کی طرف بڑھتے گئے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جوانی میں تو انھوں نے اپنے مسائل خود حل کر لیے اور کسی کو خبر تک نہ ہونے دی۔ لیکن اس عمر میں ایسے مسائل پیدا ہوگئے۔ جنھیں حل کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ پہلے بینائی کم ہوگئی ۔ پھر صدمات نے انھیں نڈھال کر دیا۔ جوانی میں بے شمار ہنستے تھے، بلند قہقہے لگاتے تھے۔ ان کے قریبی دوست انھیں کہتے قیوم صاحب زیادہ نہ ہنسا کریں۔ چنانچہ ہنسی کی جو مقدار فطرت کی طرف سے انھیں ملی تھی۔ وہ انھوں نے جوانی میں ہی ختم کر دی اور بڑھاپے میں یہ مقدار بہت کم رہ گئی۔ ان کی تین بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جو لندن میں ڈاکٹر تھا ، کینسر سے انتقال کر گیا۔ تیسرے نمبر پر ان کا بیٹا سلیمان ایک حادثے میں جان بحق ہوگیا۔ سلیمان سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اولاد کے صدمے نے زندگی کے راستے پر ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے کہ ان کے بعد وہ سنبھل نہ سکے۔ ایک غلط علاج کے باعث آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں۔ دمے کی تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ وینٹولین کا بے تحاشا استعمال کرنا پڑتا جس کی وجہ سے بائیں ہاتھ میں رعشہ آ گیا۔ اعصابی کمزوری اور جوان بیٹوں کی موت نے قیوم نظر کو لاچار کر دیا۔۲۴۔ جون ۱۹۸۹ء کو رات گیارہ بجے کراچی میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا قیوم نظر یک لخت چکرا کر گر پڑا اور پھر کبھی نہ اُٹھ سکا۔

قیوم نظر بنیادی طور پر ایک مذہبی انسان تھے جس زمانے میں مذہب اور خُدا سے بغاوت ایک ادبی فیشن بن چکا تھا۔ قیوم نظر کے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جس سے دین کے بارے میں سوء ادب کا اظہار ہوتا ہو۔ عملی زندگی میں وہ نماز روزے کے پابند تھے اور سگریٹ تک نہ پیتے تھے۔

قیوم نظر نے جس کا کام بیڑا اُٹھایا اسے بہتر صورت میں انجام دیا۔ ’حلقہ اربابِ ذوق‘ چلایا۔ ’نئی تحریریں‘ جیسا خوبصورت پرچہ مرتب کیا۔ نصابی کتابوں کا معیار بلند کیا۔ کرکٹ پر اُردو میں کمنٹری کرنے کی دلچسپ انداز میں ابتدا کی۔ نظم کے علاوہ گیت، غزل اور نعتیں بھی لکھیں۔ بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ پنجابی اور اُردو میں شعر کے اچھے نمونے چھوڑے۔

قیوم نظر نے صرف شاعری ہی نہیں کی۔ بلکہ ترجمے سے بھی انھیں خاصا لگاؤ تھا۔ والٹ وٹمن کی نظموں کے اُردو تراجم پر مشتمل کتاب، گھاس کی پتیاں کے علاوہ انھوں نے اطالوی اور پیرا کا ترجمہ بھی کیا جو ’آئیدا‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نذرالاسلام کی نظموں کا براہ راست بنگلہ سے پنجابی میں ترجمہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اسی

طرح Aesop's Fables کا اُردو ترجمہ ''کہانیوں کا جنگل'' بھی ابھی شائع نہیں ہوا۔ یہ تمام تراجم شاعر کی قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

قیوم نظر بحیثیت محقق اور نقاد بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ 'امانت لکھنوی' کی 'اندر سبھا' اور 'واسوخت' کے تنقیدی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن قیوم نظر کے وہ بیسیوں مضامین جو اخبارات و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے ڈرامہ نگاری بھی کی ہے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'ہم صفیر' شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ قیوم نظر کے تین اوپیرا بھی 'ادبی دنیا' اور 'ہمایوں' میں طبع ہوئے تھے۔ قیوم نظر نے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ سکھ میں بے قابو نہیں ہوئے اور دکھ کو خندہ پیشانی سے جھیلا ہے۔ یہی Restraint جو جدید شعرا میں اکثر کے ہاں نظر آتا ہے قیوم نظر کی نمایاں خوبی ہے۔ قیوم نظر اس مقام کے حق دار ہیں کہ ان کی شاعری کے صدری اور معنوی اسالیب کو سمجھا اور سمجھایا جائے۔

تصانیف:

قندیل: نظمیں ۱۹۴۵ء

پون جھکولے: گیت ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۶ء

سویدا: نظمیں، غزلیں، گیت ۱۹۵۴ء

ہم صفیر: ریڈیائی ڈرامے ۱۹۶۲ء

گھاس کی پتیاں: امریکی شاعر والٹ وٹمین (Walt Whitman) کی نظموں کے مجموعہ Leanes of Grass کے تراجم پر مشتمل ہے۔

آئیدا: اطالوی اوپیرا کا ترجمہ

واسوخت: آغا حسن امانت کی واسوخت کو مرتب کیا۔ جولائی ۱۹۶۴ء

اندر سبھا: امانت لکھنوی کی تصنیف ''اندر سبھا'' کا تنقیدی ایڈیشن جسے قیوم نظر نے مرتب کیا۔

توں تے میں: پنجابی نظمیں ۱۹۷۷ء

قلب ونظر کے سلسلے: مطبوعہ/غیر مطبوعہ شعری کلیات

نعت مصطفیٰ: یہ مجموعہ قیوم نظر کی نعتوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں وہ نعتیں شامل ہیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھیں اور دوسرے حصے میں وہ نعتیں شامل ہیں جو انھوں نے بڑوں کے نقطۂ نظر سے لکھیں۔

زندہ ہے لاہور: قومی نظمیں/ترانے ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء

اُردو نثر بیسویں صدی میں: ٹیکسٹ بک بورڈ کے لیے مرتب کی ہے۔

بچوں کے لیے شعری مجموعے:

بچوں کے لیے انھوں نے جو نظمیں لکھیں، وہ بلبلے، گلگلے، فالسے، آلوچے، بچوں کا لاہور کے عنوان سے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی شکل میں کہیں آٹھ صفحوں پر ہیں اور کہیں دس صفحوں پر مشتمل ہیں۔ ان نظموں کو لکھنے اور چھپوانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ صوفی تبسم کی طرح وہ بھی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا چاہتے تھے۔

گلگلے: میں کل ۲۵ نظمیں ہیں جس میں بلبل کا بچہ اور ٹین کا بندر بہت مشہور ہیں۔ یہ فیروز سنز لاہور نے شائع کی۔

آلوچے: میں کل ۲۱ نظمیں ہیں جن میں بھولی چڑیا، لڑائی اور مرغا بچوں میں بہت مشہور ہیں۔ یہ بھی فیروز سنز لاہور نے شائع کی۔

فالسے: میں کل ۱۱ نظمیں ہیں۔ اسے نگارش پبلشرز نے ۱۹۸۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔ 'دو دن دو راہنما' میں قیوم نظر نے شاعر مشرق علامہ اقبال کی تعلیمات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ قائد اعظم نے قوم کو بیدار کرنے اور ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے جو شب و روز محنت کی اس کا والہانہ عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۲۳ نظمیں شامل ہیں۔

نعتیں: بچوں کے لیے بھی نعتیں لکھیں جو کہ کل ۲۸ نعتیں ہیں۔ جسے بھی نگارش پبلشرز نے ۱۹۸۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔

بچوں کے لیے شاعری:

قیوم نظر کی بچوں کے لیے ایک کتاب ''پھول ہی پھول'' ادب میں یقیناً ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے اُردو زبان میں ترقی پسند سائنسی اور بصری احساس کے اظہار کے لیے نئے دریچے کھلے ہیں۔ جدید شعراء میں قیوم نظر کو ایک منفرد مقام حاصل ہے اور اس مقام کا اعتراف ادبی حلقوں میں فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔

بالعموم اس مقام پر پہنچ کر جہاں قیوم نظر تھے فنکار بچوں کے ادب کو بچگانہ قرار دیتے ہوئے اپنے مرتبے سے سروتر سمجھتے ہیں اور ادھر توجہ دینے پر اپنے آپ مائل نہیں کر سکتے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچوں کے لیے از خود لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بلند و بالا مقام سے نیچے اُتر کر بچوں کے ساتھ بچہ بنا پڑتا ہے اور پھر ان ہی کے تجربات کو فنی معیار پر برقرار رکھتے ہوئے زبان و بیان کی ایسی سطح پر پیش کرنا ہوتا ہے جو بچوں کی ذہنی صلاحیت سے ہم آہنگ ہو جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آ جائے۔ ان میں تخلیقی تحقیق کی صلاحیت کے لیے جدید شعراء میں یہ چیلنج صرف قیوم نظر نے قبول کیا۔ بچوں کے لیے قیوم نظر نے ابلاغ اور اظہار کے لیے امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے اُردو زبان کی فطری نغمگی سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس سے ایک طرف تو ن کی اپنی آواز کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کی فنی پختگی، کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ یہ نظمیں نثری جملوں کو وزن اور قافیہ ردیف کا بے ہنگم لباس پہنانے کی کوشش ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی شاعری میں اکثر جھول رہ جاتے ہیں کہ جن سے اظہار تو ایک طرف خود موضوع کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران تعلیمی فروغ کے ساتھ نو عمر طلبہ کا ایک ایسا اُردو خواں طبقہ وجود میں آیا ہے جو اُردو نظم و نثر میں ایسے ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں جو انھیں ولولہ انگریز تفریح مہیا کرے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس سلسلے میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ قیوم نظر کو بچوں کے تجربات و تصورات کا شعوری تخیلی سطح پر انداز تھا۔ وہ بچوں کی معصوم دنیا کا ایک ایسا راہِ نورد ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں دیکھتا ہے اس کی حقیقت کو بچوں کے زاویہ نگاہ سے بیان کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ بچوں کو مختلف اشیاء کے دوران اس حیرت انگیز جذباتی روابط کا احساس دلاتا ہے جو قارئین اشیاء اور انسانی زمین کے مابین پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی رواں میں جب 'پھول' کے ایڈیٹر تھے تو ان کی فرمائش پر قیوم نظر نے پھول کے لیے ایک خوبصورت نظم کہی اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے

معروف شعراء بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھنے لگے۔ یوں قیوم نظر نے بچوں کی شاعری کا رجحان بھی مثبت طور پر بدل دیا تھا۔

'پھول ہی پھول' کی منظومات کو بچوں کی عمروں کے حوالے سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جو انگریزی میں درج نرسری رائمز کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ آلوچے، گلگلے اور فالسے پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں سامنے کی چیزوں اور منظر موضوعِ سخن بنائے گئے ہیں جو بچوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ان میں تجسس کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان نظموں میں بچوں کے تصورات ایسی زبان میں ڈھالے گئے ہیں جس میں موسیقیت کی فراوانی ہے۔ ان میں کچھ اس طرح سے رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ یہ اسانی سے ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

تارے پیارے پیارے
تارے دوست ہمارے
تارے بھولے بھالے
جگمگ کرنے والے

کتاب کا دوسرا حصہ پرائمری جماعتوں کے طلبہ کے لیے ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات بلبلے اور کہانیوں کا جنگل ہے۔ بلبلے میں روزمرہ کی عام اشیاء کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بچوں میں ان چیزوں کو واضح طور پر دیکھنے اور سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف جانوروں، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور انھیں ایک ایسے ماحول میں سرگرم دکھایا ہے گیا ہے جو بچوں کے بالکل قریب سے دیکھا بھالا ہے۔ یہ ماحول صرف تخیل میں موجود نہیں ہے بلکہ بچے اس ماحول میں ڈوب جاتے ہیں اور اسے اپنے اردگرد محسوس کرتے ہیں۔ مڈل اور ہائی سکول کے طلبہ کے لیے نظموں کے موضوعات اور اندازِ بیان تھوڑا مختلف ہے۔

'دو دن دو راہنما' اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں ۲۳- مارچ، ۱۹۴۰ء سے ۱۴- اگست ۱۹۴۷ء کی سیاسی کشمکش کا ایک بھرپور عکس اُبھرتا ہے۔ اندازِ بیان سادہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔

ٹین کا بندر............ گھر کے اندر

اس طرح کی نظموں سے بچوں کے اندر ترنم کا احساس پیدا کیا جاتا ہے مگر ذرا بڑے بچوں کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ قیوم نظر کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں کے لیے شاعری کرتے وقت ان

ہی کی ذہنی سطح پر آجاتے ہیں اور اس کے مطابق سادہ خیالات، سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔لیکن نظم سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ شاعری اپنے عہد کے بعض دوسرے شاعروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ بچوں کے لیے اپنی شاعری کے آغاز اور مقصدیت کے بارے میں قیوم نظر کا کہنا ہے کہ بچوں کی شاعری میں نے بعد میں شروع نہیں کی بلکہ پہلی بار ۱۹۴٦ء میں بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔اُس وقت احمد ندیم قاسمی 'پھول' سے وابستہ تھے۔ چنانچہ بہت سی نظمیں ''پھول'' کے لیے لکھیں۔

قیوم نظر کا یہ بھی کہنا ہے کہ صوفی تبسم جو کہ اُن کے اُستاد اور ایک اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے اچھی شاعری نہیں کی۔ سوائے اس کے کہ انگریزی سے ترجمہ کر دیا اور بے معنی سی باتیں کر دیں۔ اوّل میں تو شاعری کا مقصد بچوں کے اندر شعور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اصل میں بچوں کی شاعری کے لیے بڑا شاعر ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ بچوں کی نظمیں چھوٹا شاعر لکھے۔ اس لیے کہ یہ بچوں کی نظمیں ہیں۔ حالانکہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کے لیے بڑے شاعروں کو سامنے آنا چاہیے۔

قیوم نظر کی نظمیں پڑھ کر مقصد کے لحاظ سے جس بڑے شاعر سے ان کی مطابقت نظر آتی ہے۔ وہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے بے حد عمدہ نظمیں لکھیں۔ جو کہانیاں بھی ہیں، سبق آموز بھی ہیں اور دُعائیں بھی ہیں۔ قیوم نظر بھی اپنی نظموں کے ذریعے سے بچوں کو اخلاقیات کا درس دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

یہ دن مبارک تھا بہت
ہر سُننے والے نے کہا
وہ لے کر رہیں گے دیکھنا
پھر جو کہا مل گیا

اس نظم میں ہمارے دو عظیم رہنماؤں علامہ محمد اقبال اور قائداعظم کو شایانِ شان طریقے سے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے دلوں میں ابتداء ہی سے ان عظیم شخصیتوں کے لیے تشکر و احترام اور ستائش کے جذبات تشکیل پا سکیں۔

قائداعظم کی کوشش سے ہوئے آزاد ہم
قائداعظم کو کرتے ہیں ہمیشہ یاد ہم
گیت آزادی کا گانا اس نے سکھلایا ہمیں

اسی طرح علامہ محمد اقبال سے بھی تشکر اور محبت کا اظہار کیا ہے۔

اقبال اِک ایسا شاعر ہے
جس نے اپنے ہم وطنوں کو — محکوموں کو ، مظلوموں کو
غفلت کی نیند سے چونکا یا — اُن کا ماضی اُنھیں دکھلایا
اُن کی عظمت کی بات کہی — اُن کی طاقت کی بات کہی
اُن کی اُمید کو زندہ کیا — اور کُھل کے خدّا کا نام لیا

دوسرا عنوان 'بچوں کا لاہور' ہے جس میں لاہور کی تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کا تذکرہ ہے۔ ان میں حقیقت اور تخیل کی آمیزش کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ بچوں میں ان مقامات کی سیر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اور دیکھنے کی دلچسپی بیدار ہوتی ہے۔

بچوں کی سائنس یہ موضوع جتنا نرالا اور جدید ہے، اتنا ہی مشکل اور اہم بھی ہے۔ ''قیوم نظر پہلا شاعر تھا جس نے بچوں کی نظموں کے لیے سائنس کے موضوع کا انتخاب کیا۔ ان نظموں میں طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور فلکیات وغیرہ کے نازک اور مشکل موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ قیوم نظر ان کو جس سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

دو گیسوں سے مل کر بنے
مائع کی صورت میں بہے
برف بنے جب جم جائے
بھاپ بنے جس دم کھولے'' (۴)

اس ضمن میں نوعمر طلبہ کو مسلمانوں کے تاریخی سائنسی ورثے کا احساس دلانے کے لیے قیوم نظر نے

مسلمان سائنس دانوں کا مختصر تذکرہ بھی ان نظموں میں شامل کیا ہے۔ مثلاً جابر بن حیان، ابو موسیٰ خوارزمی، ابوالقاسم الظاہروی اور البیرونی ۔ یہ منظومات یقیناً نامکمل رہ جائیں۔ اگر ان میں جناب سرورِ کائنات ﷺ کی نعت شامل نہ کی جاتی۔ نعت ایک مشکل صنف ہے اور بچوں کے لیے نعت لکھنا اور بھی مشکل کام ہے۔ کیونکہ ان کی ذہنی سطح ابھی اس مقام کو نہیں پہنچی ہوتی جو مذہب اور رسالت کے صحیح تصور کے لیے ضروری ہے۔ بچوں کے لیے اس مجموعہ میں نعتیں شامل ہیں۔ ان کے لہجے کی نفاست اور الفاظ کا چناؤ بہت عمدہ ہے۔

دیا علم و حکمت جہالت مٹائی

اخوت بڑھائی، شراف سکھائی

صداقت کی دنیا کی وہ انتہا ہیں

ہمارے نبیؐ خاتم الانبیاء ہیں

پروفیسر قیوم نظر نے ایک اُستاد کی حیثیت سے طلبہ کے شوق اور ولولے کو اُبھارا۔ ان شاگردوں میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ ان منظومات میں انھوں نے اس گمشدہ روایت کی تجدید کی ہے جس کا سلسلہ ماضی میں اسمٰعیل میرٹھی تک پہنچا ہے بلکہ انھیں ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

اب قیوم نظر کی بچوں کے حوالے سے شاعری کا جائزہ لیا جائے گا جس میں موجود نظموں کو تخلیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا جائے گا کہ ان کے ذریعے سے بچوں کو کیا کچھ سکھانے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز بچے ان سے کیا سبق حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ شاعری کس حد تک ان کے تخیل کی ترجمانی کرتی ہے۔

ب: قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا تحقیقی، تنقیدی و فکری مطالعہ

بچوں کی دنیا رنگوں، روشنیوں اور آوازوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس رنگ برنگی دنیا میں پریاں آتی ہیں۔ تتلیاں باتیں کرتی ہیں اور پھول ناچتے اور گاتے ہیں۔ تخیل سے بھرپور اس دنیا میں ہر طرف خوشی اور امن وسکون کا راج ہوتا ہے۔ نہ کوئی دُکھ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی فکر ستاتی ہے۔ دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے جس میں ہر طرح کے جانور اور چرند پرند شامل ہوتے ہیں اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے کی گئی شاعری بھی انہی حالات و واقعات کی عکاس ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ''گلگلے'' میں موجود نظموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

کلکلے:

''ککڑوں کوں'' اور ''کبوتر'' اس کتاب کی سب سے پہلی دو نظمیں ہیں جن سے سب سے پہلے تو بچوں کو مرغے، چڑیا اور کبوتر کی پہچان ہوتی ہے۔ نیز وہ ان کی آوازوں سے بھی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔

''ککڑوں کوں
مرغا ہوں
چُوں چڑ چوں
چڑیا ہوں
اُوں اُوں اُوں
ننھا ہوں''(۵)

اس نظم میں مرغے، چڑیا اور ننھے سے بچے کی آوازوں سے اقتباس کروایا گیا ہے۔ کیونکہ بچوں کے لیے مختلف آوازیں بہت دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ہر نئی آواز کو سُننا اور پھر اس کی نقل اُتارنے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے قیوم نظر نے زیادہ تر آوازوں کو ہی لفظی طور پر استعمال کیا ہے۔ جس سے نہ صرف موسیقیت پیدا ہوتی ہے بلکہ بچوں کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث بھی ہے۔ اسی طرح نظم ''کبوتر'' بھی ہے۔

''غُوں غُوں غُر غُوں
کرتے ہیں میرے سارے کبوتر
گردن اُٹھا کے
دُم کو پُھلا کے
پنکھا بنا کے
جب ہوں یہ چلتے
لگتے ہیں کتنے
پیارے کبوتر''(۶)

کبوتر بے حد خوبصورت پرندہ ہے۔ اس نظم سے بچے نہ صرف اس کی آواز سے روشناس ہوں گے بلکہ اس کے ظاہری خدوخال سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

''جادو کا پنجرا'' آسان اور مختصر سی نظم ہے۔ جس میں ایک قید چڑیا کے متعلق بتایا جا رہا ہے۔ پنجرہ خواہ

سونے کا ہی کیوں نہ ہو۔ ہوتا تو وہ قید خانہ ہی ہے۔ جس سے نہ تو پرندہ باہر جا سکتا ہے اور نہ ہی آزادی سے رہ سکتا ہے۔

”جادو کے پنجرے کو کھولے — اِک ننھی شرمیلی چڑیا
جادود کے پنجرے میں بولے — پھر شرمیلی نیلی چڑیا
جادو کا پنجرا جب ڈولے — ہو جائے وہ پیلی چڑیا“(۷)

آزادی ہر کسی کو پیاری لگتی ہے۔ اس جادو کے پنجرے میں موجود چڑیا بھی آزاد ہونا چاہتی ہے اور خوب شور مچاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی پنجرا ڈولنے لگتا ہے تو بیچاری چڑیا بھی گھبرا جاتی ہے۔ بچوں کو چاہیے کہ کبھی بھی پرندوں کو پنجروں میں صرف اس لیے قید کر کے نہ رکھیں، وہ انھیں خوبصورت لگتے ہیں۔ آزاد اور کھلی فضاؤں میں رہنا ان پرندوں کا بھی حق ہے۔ لہٰذا انھیں قید کرنے کی بجائے آزاد فضاؤں میں رہنے دیں اور ان کی خوبصورتی اور خُدا کی قدرت سے اسی طرح لطف اندوز ہوں تو یہ سب کے حق میں بہتر ہے۔

”چڑیا اور کوا“ اگلی نظم ہے جس میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں کارآمد اور بے کار جانداروں کا فرق واضح کیا گیا ہے۔

”اِک ننھی سی چڑیا گھڑی کی
کھول کے کھڑکی، باہر آئے
وقت بتائے اور چھپ جائے

پیڑ پہ کالا — کالا کوا
دن بھر بیٹھا — شور مچائے
وقت گنوائے — اور اُڑ جائے“(۸)

ایک ننھی سی چیڑیا ہے جو گھڑی کے اندر ہی رہتی ہے۔ ہر گھنٹے کے بعد باہر آتی ہے اور وقت بتا کر واپس اندر چلی جاتی ہے۔ یوں چوبیس گھنٹے وہ مصروف رہتی ہے۔ دوسری طرف ایک کوا ہے جو سارا دن درخت پر بیٹھا رہتا ہے۔ صرف شور مچاتا رہتا ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ صرف وقت ضائع کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا جو انسان وقت کی قدر نہیں کرتا اور اس کو فضول کاموں میں ضائع کر دیتا ہے تو وقت بھی اُس کی قدر نہیں کرتا۔ وقت کا کام ہے گزرنا اور یہ گزر

جاتا ہے اور یوں بے کار انسان وقت گنوا کر بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ جہاں صرف ناکامی اُس کا مقدر بنتی ہے۔ لہٰذا بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ اوّل دن سے ہی وقت کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اس کی قدر کرنا سیکھیں اور اپنے سارے کام مقررہ وقت پر کریں اور فارغ بیٹھنے اور فضول کاموں میں وقت کا یوں ضیاع نہ کریں۔ کیونکہ اسی میں اُن کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا راز پوشیدہ ہے۔

''بھینس پہ کوا'' بچوں کو بہلانے کے لیے بہت عمدہ نظم ہے۔ بچے عموماً کھیتوں اور میدانوں میں موجود جانوروں کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور ان جانوروں کی حرکتیں دیکھ کر اکثر محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح بھینس پر کوے کا بیٹھنا ایک عام سی بات ہے جس سے بھینس بہت تنگ ہوتی ہے اور اسی لیے وہ کوے کو اُڑانے کے لیے ہر طریقہ اور جتن کرتی ہے لیکن کوا اس سب کے باوجود بھینس کو تنگ کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اسی بات کو قیوم نظر نے بڑے نرالے انداز میں نظم میں پیش کیا ہے۔

''بھینس نے پیٹھ پہ دُم کو پھیرا
سینگ پہ پھر جا پہنچا کوا
بھینس کو چھیڑ رہا ہے، دیکھا
کائیں کائیں کرتا کوا''(۹)

یوں بھینس اور کوے کا یہ کھیل بچوں کے لیے کافی دلچسپی کا باعث ہے۔ قیوم نظر نے دوسری نظموں کی طرح اس میں بھی آواز کا استعمال کیا ہے۔ کائیں، کائیں کرنا کوّے کی عادت ہوتی ہے اور اس سے نظم میں بھی موسیقیت کی فضا بن رہی ہے۔ نیز سینگ، دُم وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال سے بچے بھینس کے خدوخال سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

''بلبل کا بچہ'' بہت ہی مشہور و معروف نظم ہے۔ شاید ہی کسی نے یہ نظم اپنے بچپن میں نہ سُنی ہو۔ بچوں کی پرندوں اور جانوروں سے دوستی عام بات ہے۔ بچے چونکہ معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایسے ہی معصوم اور پیارے پرندوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ وہ ان سے اٹکھلیاں کرتے ہیں۔ اُن کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں اور ایک دوست کی طرح ان سے بے شمار باتیں کرتے ہیں۔

بلبل کا بچہ

"کھاتا تھا کھچڑی پیتا تھا پانی
گاتا تھا گانے میرے سرہانے
اِک دن اکیلا بیٹھا ہوا تھا
میں نے اُڑایا واپس نہ آیا
کیسے بُلاؤں کیسے بھلاؤں
بلبل کا بچہ"(۱۰)

اس نظم میں بچے کی دوستی بلبل کے بچے کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا ہے اور پرندہ بھی اس سے بہت مانوس ہو جاتا ہے لیکن ایک دن بچہ اُس کو اُڑا دیتا ہے۔ پھر وہ پرندہ واپس نہیں آتا اور اب بچہ اُس کے نہ آنے پر پریشان ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو پرندے یا جانور انسانوں کو پیارے لگتے ہیں وہ انھیں قید کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ اس قید میں ان کا کتنا ہی خیال رکھیں۔ لیکن ہوتا تو وہ قید خانہ ہی ہے۔ اس لیے جیسے ہی اُن پرندوں یا جانوروں کو موقع ملتا ہے وہ بھاگ یا اُڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم قدرت کے ان خوبصورت شاہکاروں کو پیار کریں اور اپنی خوشی کے لیے ان کی آزادی سلب کرنے سے گریز کریں۔ اسی میں ان جانوروں کی خوشی اور بھلائی ہے۔

"سفید بطخیں" اگلی نظم ہے جس میں جانوروں، بادل، پودوں، پھلوں اور پھولوں کا ذکر ہے اور ان سب کی مشترک خوبی جو اس نظم میں بیان کی گوی ہے۔ وہ سب اشیاء کا سفید رنگ کا ہونا ہے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا پیش ہے۔

"سفید بطخیں، سفید بچے
سفید مرغی، سفید چوزے
سفید بھیڑیں، سفید لیلے
میں ان سے کھیلوں"(۱۱)

یوں اس نظم میں ہر اُس شے کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ اندر یا باہر سے سفید ضرور ہے۔ ان سے ایک تو بچوں کو سفید رنگ کی پہچان ہوگی۔ ساتھ ہی وہ ان باتوں سے واقف ہوں گے کہ کون سی چیزیں اُن کے کھانے کے

لیے ہیں۔ کن پرندوں اور جانوروں کے ساتھ وہ کھیل سکتے ہیں۔ جیسے مرغی، بطخ اور بھیڑ وغیرہ اور کون سے نظاروں سے وہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جیسے بادل، بگلے اور پھول وغیرہ۔ یوں اس خوبصورت سی نظم کے ذریعے کھیل ہی کھیل میں بچے بہت سی نئی باتیں سیکھ جائیں گے۔

کھلونے بچوں کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ اس چھوٹی عمر میں بچے جس چیز پر سب سے پہلے اپنا حق جتاتے ہیں، وہ ان کے کھلونے ہی ہوتے ہیں۔ ان کھلونوں سے وہ بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اسی بات کا اظہار اگڑم بگڑم، کاٹھ کا گھوڑا، ریل گاڑی، میری سائیکل، میری گڑیا، میرا لٹو میں کیا گیا ہے۔ جن کا یہاں باری باری جائزہ لیا جائے گا۔

تگڑم

"اگڑم بگڑم تگڑم بم
یہ ہے جادو کی ٹم ٹم" (۱۲)

اس نظم میں بچوں کی سواری کا ذکر ہے جس کو گھوڑا کھینچتا ہے۔ بچوں کے لیے اس طرح کی سواری کرنا بالکل نیا اور دلچسپ تجربہ ہوتا ہے اور اس تجربے میں وہ اپنے اردگرد کی بہت سی انوکھی اشیاء اور نظاروں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ قیوم نظر نے اس نظم میں ایسے الفاظ کا دل کھول کے استعمال کیا ہے کہ جن میں سے اکثر کا لغت میں کوئی وجود یا مطلب نہیں ہے۔ لیکن بچوں کے ذہن کو حوالے سے یہ الفاظ نہ صرف ایک مضبوط وجود رکھتے ہیں ۔ بلکہ ان کے بے شمار معنی بھی ہیں۔ جیسے اکڑم، بکڑم، ٹم ٹم، چھم چھم، پم پم وغیرہ ۔ ساتھ ہی لفظوں کی تکرار سے بے حد موسیقیت پیدا ہو رہی ہے جو بچوں کے محظوظ کرنے کے لیے کافی ہے۔ چونکہ بچوں کو یہ سواری بے حد پسند ہے ۔ لہٰذا وہ اس میں بار ہا بیٹھنے کے لیے کئی باتیں سوچ رہے ہیں کہ نہ صرف اس پر گھومیں گے بلکہ اس میں بیٹھ کر کھائیں گے بھی اور مزے بھی کریں گے۔

"کاٹھ کا گھوڑا" اگلی نظم ہے ۔ جس کے ساتھ کھیلنا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

"گھوڑا ہے یہ کاٹھ کا جیسے ہندسہ آٹھ کا
رکھیں اس پہ ہاتھ ہم دوڑیں اس کے ساتھ ہم" (۱۳)

اس نظم میں لکڑی کے گھوڑے کا ذکر ہے جو بچوں کا دوست بھی ہے۔ ان کے ساتھ بھاگتا دوڑتا ہے۔ یوں بچے اپنے کھلونوں سے بے حد محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

''ریل گاڑی'' بچوں کے حوالے سے بہت خوبصورت نظم ہے۔ جس میں ریل گاڑی کے چلنے، رکنے اور ٹھہرنے کی بڑے ہی دلچسپ انداز میں منظرکشی کی گوی ہے۔ ریل گاڑی بھی بچوں کا بہت پسندیدہ کھلونا ہوتا ہے۔

''گھمائی جو چابی دکھائی جو جھنڈی
بجائی جو سیٹی چلی ریل گاڑی''(۱۴)

عموماً چابی سے چلنے والے کھلونے بچوں کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس نظم میں بھی ایسی ہی ریل گاڑی کا ذکر ہے جو چلتی ہے، ٹھہرتی ہے، گزرتی ہے۔ بچے ایسی نظموں سے بہت سارے نئے الفاظ سیکھتے ہیں۔ جیسے چابی، جھنڈی، سیٹی، سٹیشن وغیرہ۔ اب اس نظم کو پڑھنے سے بچوں کو اندازہ ہوگا کہ ریلوے سٹیشن کیا ہوتا ہے؟ اور کیسے ریل گاڑی انجن سے چلتی ہے۔ یوں بچوں کے علم میں بہت چھوٹی عمر سے ہی اضافہ ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بچوں کو اپنے کھلونوں سے بے حد اُنسیت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے کھلونوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں زندگی بڑی بے فکر ہوتی ہے۔ آنے والے وقت کی نہ تو کوئی پہچان ہوتی ہے اور نہ ہی ہوش ہوتا ہے۔ یہ عمر تو بس کھلونوں سے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ بچوں کی کل کائنات اُن کے کھلونے ہی ہوتے ہیں جن کو اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ بانٹنا ان کے لیے گوارہ نہیں ہوتا۔ ہاں بچے یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ اپنے کھلونوں کی خوبیاں بڑھا چڑھا کر بیان کی جائیں۔ اسی بات کی عکاسی ''مری سائیکل''، ''میری گڑیا'' اور ''میرا لٹو'' نظموں میں کی جا رہی ہے۔

قیوم نظر بچوں کے تصورات اور جذبات سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے بچوں کے جذبات کی عکاسی اُنہی کے انداز میں کی ہے۔

''ہلیں جھنڈیاں بجیں گھنٹیاں
مری سائی کل چلے تیز تیز
رُکے موڑ پر سڑک چھوڑ کر''(۱۵)

سب سے پہلے سائیکل کے ظاہری خدوخال بتائے گئے ہیں کہ خوبصورتی سے سجی ہوئی ہے۔گھنٹی بجاتی ہے۔ بچے اکثر ایسے ہی اپنے سے وابستہ اشیاء سے تعارف کرواتے ہیں اور ساتھ ہی دوسروں کو یہ بتانے کے لیے کہ اُن کا کھلونا یا سائیکل سب سے بہترین ہے۔ دوڑ لگانے کو کہا جاتا ہے یا مقابلہ کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں بھی بچہ اپنے اوّل آنے پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنی سائیکل کی تیز رفتاری کی بھی تعریف کر رہا ہے۔لہٰذا کسی بچے کے جذبات کی نہایت عمدہ اور بھرپور عکاسی اس نظم میں کی گئی ہے۔

”میری گڑیا دیکھیں آپ
نام اُس کا مت پوچھیں آپ
نیلی آنکھیں بھورے بال
ہونٹ گلابی گورے گال“(۱۶)

اس نظم میں بھی ایک چھوٹی بچی اپنی گڑیا کی خوبصورتی بتا رہی ہے اور ساتھ ہی اس کے ظاہر خدوخال بڑی تفصیل سے بتا رہی ہے۔ آنکھیں، بال، ہونٹ، گال، ناک، گردن نیز ہر ہر شے کے بارے میں بڑی ہی دلچسپی سے بتایا جا رہا ہے۔نظم کے مصرعے بہت مختصر اور سادہ ہیں جو کہ بچوں کو آسانی سے یاد ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی بچے بہت سے نئے الفاظ اپنے حافظے میں محفوظ کر سکتے ہیں۔

”میرا لٹو، گھومے گا سب میں ، اوّل آئے گا
میرا لٹو ، مٹی کا اختر کا ہے، لکڑی کا“(۱۷)

اس نظم میں بھی بچہ اپنے لٹو کی تعریفیں کر رہا ہے۔ ایک طرح سے بچہ دوسروں کے کھلونوں پر اپنے کھلونے کی برتری ظاہر کر رہا ہے کہ جو کھلونا اُس کے پاس ہے اس جیسا کسی کے پاس نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ دوسروں کے کھلونوں میں موجود خامیاں بتا رہا ہے۔ بے شک ہر بچے کو اپنا گھر اپنے کھلونے ہمیشہ دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ اچھے اور پُرکشش لگتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اپنے سے منسلک چیزوں اور رشتوں کو دوسروں پر برتری دیتے ہیں۔ حالانکہ بچوں کو یہ سکھانا چاہیے کہ جو اُس کے پاس ہے وہ بہت اچھا ہے۔لیکن ساتھ ہی جو دوسرے کے پاس ہے وہ بھی اچھا ہے۔ ساتھ ہی قیوم نظر نے اس مختصر سی نظم میں بہت سارے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو بچوں کے لیے بالکل نیا تجربہ ہے۔ جیسے لٹو، ڈوری، گُپّا، چپٹا وغیرہ۔ یوں کھیل ہی کھیل میں بچے

رویوں سے متعلق بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔

بچوں کو سکول بھیجنا ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ بچوں کے لیے یہ نیا تجربہ ہوتا ہے اور اپنی روزمرہ زندگی کو بدلنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بچے صرف سوتے اور کھیلتے ہیں۔ لیکن اب چونکہ اُنھیں صبح سویرے اُٹھنا پڑتا ہے تو سب بچوں کے لیے یہ نیا تجربہ اچھا نہیں ہوتا۔ قیوم نظر نے بچوں کو سکول بھیجنے اور بہلانے کے لیے بڑی پیاری سی نظم لکھی ہے اور بچوں کے لیے چونکہ پھول، پودے، پرندے اور جانور بہت دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں اس نظم میں بھی ایک بلی کے کردار کو دکھایا گیا ہے جو کہ سکول جانے کی تیاری کر رہی ہے۔

''مُنھ پہلے دھولیا	کچھ دُودھ پھر پیا
تب ناشتا کیا	جائے گی آج تو

بلی سکول کو''(۱۸)

نظم کا انداز ہی بچوں کو بہلانے والا ہے کہ پہلے صبح اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیں۔ پھر دودھ پیا، پھر ناشتہ کریں اور اس کے بعد سکول جانے کی تیاری کرنی چاہیے۔ جس طرح بلی آج سکول کو جا رہی ہے۔ دوسرے مصرے میں بتایا جا رہا ہے کہ بستہ سنبھال کر خود ہی دیکھ لو بلی سکول جا رہی ہے۔ اس لیے بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی صبح اچھے سے تیار ہو کر خوشی خوشی سکول جائیں۔ کیونکہ اگر آج اچھے سے پڑھ لیں گے تو آنے والے وقت میں ترقی اور کامیابی پائیں گے۔ بچوں کی عمر چونکہ ایسی ہوتی ہے کہ وہ باتیں سیدھے انداز میں سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے اُنھیں سکھانے اور سمجھانے کے لیے بچوں کے انداز میں ہی بات کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس بات سے وہ بہل جائیں گے یا جو بات انہیں پسند آ جائے گی۔ وہی کام وہ بھی کرنے کو خوشی سے تیار ہو جائیں گے۔

''مٹھائی کھالی'' اگلی نظم ہے۔ بہت ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہیلی کا سا انداز اپنایا ہے۔

''کُرسی سے جب میز اُٹھالی
سامنے آئی تھالی
تھالی پر جب رکھ دی پیالی
دونوں ہاتھ تھے خالی
خالی ہاتھ بجائیں تالی
ہم نے مٹھائی کھالی''(۱۹)

اب بڑوں کے لیے تو یہ بات ناقابل قبول اور ناقابل یقین ہے کہ کرسی کے اوپر میز رکھا جا سکے۔ لیکن چونکہ بچوں کے لیے کچھ بھی ناقابلِ یقین نہیں ہے اور وہ اپنے تخیل کی دُنیا میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ ویسے بھی بچپن زندگی کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں بچے آنے والے وقت اور زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر اپنی ہی دُنیا میں مگن ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ نظم بھی بچپن کے انہی لمحوں کی عکاسی کر رہی ہے۔ جہاں بچے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں اور حرکتوں میں مصروف رہتے ہیں۔

بچوں کو بہلانے کے لیے بڑے اکثر مختلف باتیں اور حربے اپناتے ہیں۔ کیونکہ بچہ نہ تو کبھی ایک ہی کھلونے سے بہلتا ہے اور نہ ہی ایک ہی بات یا کہانی سے بار بار محظوظ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے بچوں کو ہر بار نئی کہانیاں سننے اور نئے نئے تجربے کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ قیوم نظر اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی نظموں میں کچھ کو کہانی کے انداز میں لکھا ہے اور کچھ کو پہیلی کے انداز میں بیان کیا ہے تاکہ ایک ہی جیسی نظموں سے بچے اُکتا نہ جائیں۔ کچھ یہی انداز ''کالے بادل'' والی نظم میں اپنایا گیا ہے۔

''کالے بادل آئے ہیں　　　رات کو مینہ برساتے ہیں
پیڑوں کو نہلاتے ہیں　　　صبح کو گھر کو جاتے ہیں''(۲۰)

یوں لگتا ہے کہ یہ نظم لکھتے وقت قیوم نظر کے ذہن میں بہت ساری چیزیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے ہر ایک کو باری باری ایک ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔ اس نظم کا ہر بند دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس ایک نظم سے بچوں کو بہت ساری چیزوں کے کام اور کرداروں کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ بادلوں کا کام برسنا ہے۔ چڑیاں کووں سے ڈرتی ہیں۔ گائیں دن کے وقت چارا کھاتی ہیں اور انسان، جانور، چرند پرند سارا دن تو اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور جیسے ہی رات ہوتی ہے تو سب آرام کی غرض سے سو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی بچے کھیت کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ جہاں فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔ یوں بڑے ہی خوبصورت انداز میں نظم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ لیکن بچوں کے تخیل کی دُنیا میں بہت ساری باتوں اور چیزوں کا اضافہ کر جاتی ہے۔

کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ بچوں کا دوسرا پسندیدہ مشغلہ کھانا پینا ہوتا ہے اور اکثر بچوں کو چٹ پٹی چیزیں کھانے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ اسی بات کی ترجمانی یہ نظم ''گلگلے'' کر رہی ہے۔

"لومیاں، بن گئے آپ کے واسطے
گلگلے
دیکھنا گرم ہیں ہاں سبھی نرم ہیں
گلگلے"(۲۱)

گلگلے بچوں کو بے حد پسند ہوتے ہیں اور ماؤں کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی پسند کی اشیاء گھر پہ ہی تیار کریں۔ اس نظم میں اسی بات کی عکاسی ہے کہ گھر پر ہی اشیاء نہ صرف صحت کے لحاظ سے بہترین ہیں بلکہ ذائقے میں بھی لاجواب ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ باہر گھومنے کے لیے جاتے وقت کوشش کریں کہ گھر پر بنی اشیاء ہی لے کر جائیں۔ باہر کی اشیاء مضرِ صحت ہوتی ہیں اور بچوں کو خصوصاً نقصان پہنچاتی ہیں۔

پریاں، چڑیلیں، جن بھوت یہ چند وہ کردار ہیں جو بچپن میں سب بچوں کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ جن بھوت اور چڑیلیں ہمیشہ سے بچوں کے لیے خوف کی علامت ہیں اور بڑے اکثر بچوں کو ڈرانے یا اپنی کوئی بات منوانے کے لیے ان جن بھوتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ دوسری جانب پریوں سے بچوں کی خاصی دوستی ہوتی ہے اور یہی پریاں بچوں کو آ کر سلاتی بھی ہیں۔ دراصل بچپن میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔ بچوں کے تخیل کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں اُسے اپنے تخیل کی دنیا میں پا لیتے ہیں۔ حقیقت میں تو کبھی کوئی پری بچوں کے پاس نہیں آئی۔ لیکن بچوں کی سوچ میں پری آتی ہے اور انھیں لوری سُنا کے سلا جاتی ہے اور شاید اس پری کے کردار کو مضبوط کرنے میں بڑوں کا بھی کافی ہاتھ ہوتا ہے۔

"وہ چپکے سے آتی ہے
وہ ہنستی ہنستاتی
کبھی گا کے گانا
وہ مجھ کو سلاتی
وہ پیاری تھی میری
وہ ساری تھی میری
مگر اُڑ گئی پری اُڑ گئی"(۲۲)

بچوں کو اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جو پری ہے وہ چپکے سے آتی ہے۔ وہ سب کے سامنے نہیں آتی۔ وہ آ کر بچوں کو سلا کر چلی جاتی ہے۔ یہی پری بچوں کو کہانی بھی سناتی ہے۔ نہ بچے اس پری سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی وہ پری بچوں سے کسی قسم کا خوف رکھتی ہے۔ یعنی دونوں کی اچھی خاصی دوستی ہوتی ہے اور یہ بات بڑے ہی بچوں کے ذہن میں ڈالتے ہیں کہ پری صرف اچھے بچوں کے پاس آتی ہے اور مزے مزے کی باتیں سناتی ہے۔ لیکن جو بچے بڑوں کا کہنا نہ مانیں یا بڑوں کو تنگ کریں اُن کے پاس یہ پری نہیں آتی۔ اس نظم میں بھی بچہ شروع میں اپنی پری کے بارے میں بتاتا ہے۔ پھر اس بات پر افسردہ ہوتا ہے کہ وہ اُڑ گئی ہے۔ اس کا رنگ سرخ اور سبز تھا اور وہ میرے سوتے ہی کہیں اُڑ کر چلی گئی ہے۔ بچہ یہ ضرور سوچے گا کہ شاید اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے پری ناراض ہوگئی ہے اور چلی گئی ہے تو آئندہ وہ بُرے کاموں سے اجتناب کرے گا۔

کسی بھی نئی یا انوکھی شے کو دیکھنا اور اس کے متعلق سوالات پوچھنا بچوں کا عمومی مشغلہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بڑوں کے لیے وہ چیز اہمیت نہ رکھتی ہو۔ لیکن بچے اُس کو جس نظر سے دیکھتے ہیں وہ اُن کے لیے خاصی اہمیت اور دلچسپی رکھتی ہے۔ کچھ یہی معاملہ اس نظم ''گھڑی'' میں بھی بیان کیا جا رہا ہے۔

''ٹِک ٹِک ٹِک چلتی ہے گھڑی
چابی بن رہتی ہے گھڑی''(۲۳)

بڑوں اور بچوں کے کسی بھی چیز کو دیکھنے کے نظریے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بڑوں کے لیے گھڑی صرف ایک مشینری ہے جس سے وہ وقت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور وقت کے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دوسری جانب بچوں کے لیے گھڑی ایک انوکھی چیز ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ نہ اُس کے کوئی ظاہری خدوخال ہیں، نہ ہی اُسے کوئی چابی لگتی ہے۔ بس اُس کی دو سوئیاں ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے وہ بھی بازو کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ ایک چھوٹا بازو ہے اور ایک بڑا ہے جو کبھی نہیں رکتے اور ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ نہ تو یہ گھڑی کچھ کھاتی پیتی ہے۔ نہ ہی آرام کرتی ہے۔ بس ہر وقت چلتی رہت یہے اور ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ بھاگتی رہتی ہے۔ ایک سادہ سی نظر آنے والی گھڑی میں بچوں نے بہت ساری باتیں دریافت کر لیں۔ جن کا بڑوں کے لیے بے شک کوئی وجود نہ ہو۔ لیکن بچوں کے لیے ایک پورا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ کیونکہ بچے اور ان کے ذہن معصوم ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنی سوچ کے مطابق اور سمجھ کے لحاظ سے ہی ہر شے کو اپنے نظریے

سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔

قیوم نظر یہ خوبی ہے کہ انھوں نے بچوں کے معصومانہ ذہن اور سوالات کی بڑی ہی بھرپوری عکاسی کی ہے کہ ایک لمحے کو پڑھنے والا خود کو بالکل بچہ ہی محسوس کرنے لگتا ہے اور بچپن کی اُس خوبصورت وادی میں کھو جاتا ہے جہاں ہر طرف رنگ، خوشبوئیں اور قہقہے ہیں جہاں کوئی فکر یا پریشانی نہیں ہے۔

بچپن میں جہاں بچے مختلف کھیل کھیلتے ہیں وہیں بندر کا تماشا دیکھنا بھی بچوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ یہ بندر گلی گلی میں لائے جاتے ہیں اور ان کے کرتب دیکھ کر بچے بے حد خوش ہوتے ہیں۔ ویسے تو کسی بھی جانور کو قید کرنا اور اسے اپنی مرضی سے چلانا اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن چونکہ انسان کو اپنے گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے لہٰذا ہمارے ہاں بہت سارے لوگ بندر اور ریچھ سے مختلف کرتب کروا کر اپنی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں۔

''سر پر ٹوپی ہاتھ میں ڈفلی
پاؤں میں جوتا پہنے آیا
ٹین کا بندر
گھر کے اندر''(۲۴)

بندر کا تماشا بچے بڑے زور وشور سے دیکھتے ہیں اور بندر والا بھی بندر کو اچھے سے سنوار سجا کر لاتا ہے۔ پھر وہ جیسے جیسے بندر کو حکم دیتا ہے بندر ویسے ہی کرتب کر کے دکھاتا ہے۔ کبھی میز پر چڑھ کر ناچنا شروع کر دیتا ہے تو کبھی یونہی اُچھلتا کودتا ہے۔ یہ سارے کرتب بچے خوشی خوشی دیکھتے ہیں اور ویسے بھی بچوں کے لیے یہ بے حد انوکھی بات ہے کہ ایک جانور انسانوں کے جیسا بیٹھتا اُٹھتا ہے۔ چلتا بھی انسانوں کی طرح ہے۔ لہٰذا بچوں کے لیے سب حیرت اور خوشی کا باعث ہوتا ہے اور جو چیز یا کھیل بچوں کو خوشی دے وہ انھیں ہمیشہ یاد رہتا ہے۔

آلوچے

قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کی دوسری مختصر سی کتاب کا نام 'آلوچے' ہے۔ اس میں بھی قیوم نظر نے بچوں کے حوالے سے مختلف موضوعات کو نظموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جن میں دوستی، قدرتی مناظر، جانور، چرند پرند وغیرہ شامل ہیں۔ اب ان نظموں کا باری باری جائزہ لیا جائے گا۔

سب سے پہلی نظم ''دن اور رات'' ہے جس میں دن اور رات کی بڑے خوبصورت انداز میں منظرکشی کی گئی ہے۔

''سورج نکلے دن بھر چمکے
دن بھر بچے پڑھتے پڑھتے
جب تھک جائیں شور مچائیں
کھیلیں کودیں
پھر آنگن میں''(۲۵)

دن اور رات اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہیں۔ دن کو جب سورج نکلتا ہے تو سب اپنے اپنے کامو ں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انسان، جانور، چرند پرند سب اپنے اپنے لیے رزق کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ اسی طرح دن میں بچے بھی پڑھتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں یعنی ہر ایک جاندار دن میں سورج کی روشنی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور ویسے بھی اللہ پاک نے دن کام کرنے کے لیے بنایا ہے اور رات آرام کرنے لیے بنائی ہے۔ رات کے وقت جب اندھیرا پھیلتا ہے تو چاند اور ستارے، آسمان پر روشن ہو جاتے ہیں اور انہی کی ٹھنڈک میں سب سو جاتے ہیں۔

بچوں کو شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس ہونا چاہیے اور ان نعمتوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ بچپن میں سکھائی ہوئی باتیں انسان کو ساری زندگی یاد رہتی ہیں۔

بچوں کے جزیرے میں تخیل نے سب کچھ سجا کے رکھا ہوا ہے۔ یہاں گیت ہیں، میٹھی آوازیں ہیں، سُریلے بول ہیں، سرگوشیاں ہیں، یہاں پتنگیں اُڑتی ہیں، خوشبوئیں گھومتی ہیں، پریاں ناچتی ہیں، یہاں رنگینیاں ہیں۔ یہاں چرند پرند، چڑیاں، طوطے، کبوتر، گھوڑا، ہاتھی، بکری وہ سب کچھ ہے جو بچوں کو پیارا ہے۔ یہ بچوں کا وہ عجائب گھر ہے جہاں وہ ہمیشہ حیرت زدہ اور مسرور رہتے ہیں۔ اب باری باری بچوں کی اس دنیا میں موجود پرندوں اور جانوروں سے بچوں کی محنت اور دوستی پر لکھی گئی نظموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

''سن ری چڑیا بھولی بھالی
تو پھرتی ہے ڈالی ڈالی

تیرے پیچھے تیرے بچے
ننھی ننھی چونچیں کھولے
تجھ کو بلائیں چوں چوں کر کے
کالا کوا ہر دم بھوکا
اُن کو دیکھے چھپ کر بیٹھا
تو جلدی سے گھر واپس جا''(۲۶)

بچوں کے لیے لکھنا کوئی آسانی کام نہیں ہے۔اس کے لیے بچوں کی نفسیات اور لب و لہجے سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے اور رقیوم نظر ان دونوں باتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی لیے اپنی مختصر سی نظموں میں بھی انھوں نے اس قدر محنت سے کام کیا ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بیان کیا ہے۔

اس نظم ''بھولی چڑیا'' میں ہی دیکھ لیں کہ کس طرح ایک چھوٹی بچی بھولے سے انداز میں چڑیا سے بات کر رہی ہے اور اسے بُرے وقت سے بچنے کی تلقین کر رہی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی حفاظت کرے۔ ورنہ بھوکا کالا کوا اُنھیں کھا جائے گا۔ اسی سے بچوں کی جانوروں سے محبت اور دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اگلی نظم ''کُو کُو کُو'' ہے۔ جس کے ہر مصرعے میں نئی اور نرالی بات کہی گئی ہے۔ کیونکہ یکسانیت سے انسان کا اُکتا جانا ایک فطری بات ہے۔ اسی لیے بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے یہ مصرع دوسرے سے مختلف اور نرالا ہے۔

''کویل کُوکے کُو کُو کُو
باغوں میں گھومے خوشبو
ندی میں مچھی روہُو

تم ہو انگریزی میں یُو
چین میں چاؤ تاؤ چُو
افریقہ میں ٹم بک ٹُو''(۲۷)

بچوں کو بہلانے کے حوالے سے بہت اچھی نظم ہے ۔ ساتھ ہی بچوں کو یہ بھی پتہ چلے گا کہ کوئل ایک پرندہ ہے جو باغوں میں رہتا ہے اور روہو مچھلی کی ایک قسم ہے اور مچھلی پانی کا جانور ہے اور اسے کھانے میں بے

حد پسند کیا جاتا ہے اور انگریزی میں تم کو یُو کہا جاتا ہے۔ یوں کھیل ہی کھیل میں بچے بہت ساری نئی باتیں سیکھ جاتے ہیں۔

بچوں کو شروع سے ہی اچھے اور بُرے میں فرق کا پتہ ہونا چاہیے تاکہ وہ بچپن سے ہی صحیح اور غلط میں پہچان کر سکیں۔ نظم ''کبوتر'' اسی سلسلے کی عکاسی کر رہی ہے۔

''کبوتر اچھے ہیں　　سجا کے رکھے ہیں
کبوتر نقلی ہیں
کبوتر اُڑتے ہیں　　ہوا میں مڑتے ہیں
لپک کر آتے ہیں　　جھپک کر جاتے ہیں
کبوتر اصلی ہیں''(۴۸)

بڑے ہی خوبصورت انداز میں اصلی اور نقلی کبوتر کی پہچان بتا دی ہے کہ اگر تو کبوتر صرف سجا کے رکھے ہیں تو یہ یقیناً نقلی ہیں اور اگر کبوتر ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ ادھر سے اُدھر جا رہے ہیں، مڑ کر آ رہے ہیں تو یہ کبوتر اصلی ہیں۔ بات بتانے کا انداز اتنا آسان ہے کہ بچے فوراً سیکھ جائیں کہ اصلی اور نقلی میں کیا فرق ہے؟

بچوں کو کوئی بھی بات سمجھانے کے لیے بہت باریکی میں جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ یوں تو بچوں کی سمجھ میں بات نہیں آئے گی۔ جیسے فوراً بڑے بات سمجھ لیتے ہیں۔ بچے ہر نئی چیز کے متعلق ڈھیروں سوالات کرتے ہیں اور جب تک اُنھیں ان سوالات کے تسلی بخش جوابات نہ مل جائیں، اُن کی بے چینی برقرار رہتی ہے۔

اب اس نظم 'مرغا' کو ہی دیکھ لیں کس قدر تفصیل سے مرغے کے ظاہری خدوخال بتائے جا رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بچہ بتا رہا ہو۔

''مرغے کی دو ٹانگیں　　اِک کلغی دو آنکھیں
ٹانگیں موٹی موٹی　　آنکھیں چھوٹی چھوٹی''(۴۹)

اس نظم کو پڑھنے کے بعد ننھے منے بچوں کے لیے مرغے کو پہچاننا نہایت آسان ہو جائے گا۔ قیوم نظر کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ اپنی نظموں کے ذریعے ایک عام سی چیز کو بھی بہت خاص بنا دیتے ہیں اور ساتھ ہی ان بچو ں کے ذہن میں بہت سارے نئے الفاظ کا اضافہ ہوگا۔

بچوں کا اپنے سے وابستہ چیزوں سے محبت کا اظہار ایک فطری جذبہ ہے۔ انھیں ہمیشہ اپنی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء اور کھلونوں میں بے شمار خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ نظم ''پتنگ'' اور ''میرا جوتا'' میں بیان کیا جا رہا ہے۔

پتنگ

''میری پتنگ نیلی پتنگ
اُونچی اُڑے میری پتنگ
اچھی پتنگ

میرا جوتا

سیدھا سادا ہلکا ہلکا
اُجلا اُجلا پیارا پیار
کتنا اچھا
میرا جوتا''(۳۰)

دونوں نظموں کا لہجہ ایک ہی ہے۔ ایک میں بچہ اپنی پتنگ کو سب سے اچھا بتا رہا ہے اور دوسری میں اپنے جوتے کو سب سے بہترین بتا رہا ہے جو کہ سب بچوں میں پائی جانے والی ایک عمومی عادت ہے اور بچوں کی اسی معصومانہ عادت کو قیوم نظر نے بڑی خوبصورتی سے ان نظموں میں بیان کیا ہے۔

بچوں کی دنیا اُنہی کی طرح سادہ، معصوم اور رنگین ہوتی ہے۔ جہاں کوئی پریشانی یا مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہوتی اور اس عمر میں بچوں کی صرف دو، تین مصروفیات ہوتی ہیں۔ سونا، کھانا اور خوب کھیلنا اور بچوں کے کھانے کی اسی عادت کو قیوم نظر نے اپنی نظموں '' بسکٹ''، ''جامن'' اور ''میں کھاؤں گا'' میں بڑے بھرپور انداز سے بیان کیا ہے۔

''چوڑے چوڑے موٹے موٹے
پیلے پیلے بسکٹ گڑ کے
سب کو بلا کے پاس بٹھا کے
آپا بانٹیں بسکٹ گڑ کے''(۳۱)

قیوم نظر نے الفاظ کی تکرار سے بڑے ہی موسیقانہ انداز میں اس نظم میں گڑ کے بسکٹ کی تعریف اور ظاہری خدوخال بیان کیے ہیں۔ بچوں کو ویسے بھی میٹھی چیزیں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ جیسے بسکٹ، مٹھائی، کیک وغیرہ اور اسی لیے اب ان چیزوں کی ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ بہت سے بڑے بڑے نام اس کام سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ پہلے پہل ایسی چیزیں گھروں میں موجود اشیاء اور اجزا سے تیار کر لی جاتی تھیں لیکن بدلتے وقت اور ترقی کے ساتھ ساتھ ان اشیاء نے بھی خود کو بدل دیا۔ اب یہ بہت ساری قسموں میں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ جنھیں بچے بڑے سب بے حد شوق سے کھاتے ہیں۔

''باغ میں جائیں
اُودے اُودے کالے کالے
پکے پکے میٹھے میٹھے
جامن کھائیں''(۳۲)

اس نظم میں بھی الفاظ کی تکرار موجود ہے۔ لیکن یہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتی۔ بچوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے سیکھنے میں الفاظ کی تکرار بہت مددگار ہوتی ہے۔ ایک ہی لفظ کو دو سے تین بار پڑھنے سے وہ اچھی طرح سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دوسرے گھر سے باہر جانا بچوں کو بے حد پسند ہوتا ہے۔ باہر جا کر کھیلنا کودنا، کھانا پینا بچوں کے محبوب ترین مشاغل میں سے ہے۔ اکثر بچے امرود، آم، جامن، مالٹے توڑ کے بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ اس نظم میں بھی بچے باغ میں جا کر تازے جامن توڑ کر کھا رہے ہیں اور اس سے انھیں جو خوشی حاصل ہو رہی ہے اس کا اظہار قیوم نظر نے بڑے ہی شاندار انداز میں کیا ہے۔

''یہ خربوزے پیلے پیلے
جن کے چھلکے ڈھیلے ڈھیلے
میں کاٹوں گا
میں کھاؤں گا
یہ آلوچے نرم رسیلے
ننھے ننھے گیلے گیلے
میں چکھوں گا
میں کھاؤں گا''(۳۳)

قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں ایک خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کی ہر نظم کوئی

نہ کوئی سبق لیے ہوئے ہے۔ ان کی ہر نظم سے بچے کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ پھر چاہے وہ پھلوں سے متعلق ہو، جانوروں پہ ہو یا پرندوں سے متعلق نظم ہو۔ بچوں کے لیے ان میں سیکھنے کو بہت کچھ نیا اور انوکھا ہے۔ اب اس نظم ''میں کھاؤں گا'' میں بچے تین پھلوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ خربوزے، آلوچے اور آلو بخارے اور ان سب پھلوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا گیا ہے تاکہ بچے انھیں خود سے پہچاننے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی بچوں میں یہ نظم پڑھ کر انہی پھلوں کو کھانے کا شوق بھی پیدا ہوگا جو کہ بچوں کے لیے اور بھی اچھی بات ہے۔

جادو منتر ایسی چیز ہے جس کو نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی بڑی توجہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے تو یہ جادو اور جادوگر خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بچپن میں جادوگر کا جادو اور کھیل دیکھنے بچے خصوصاً میلوں میں جاتے ہیں اور یہ جادوگر کوئی بہت بڑے جادوگر نہیں ہوتے بلکہ یہ تو فنکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ بچوں کو جادو دکھا کر بہلانا سب سے آسان کام ہے۔ وہ اپنی چھوٹی موٹی کاریگری سے کوئی شے غائب کر دیتے ہیں یا کسی شے کا اضافہ کر دیتے ہیں تو یہ بچوں کے لیے بے انتہا حیرت کی بات ہوتی ہے۔ بہرحال جو بھی ہے لیکن جادو منتر دیکھنا بچوں کے لیے نہایت دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ہی جادو قیوم نظر اپنی ان نظموں ''چھومنتر'' اور ''جادو کی پڑیا'' میں دکھا رہے ہیں۔

چھومنتر

''اس مٹھی میں
ہاتھی کی دُم
اس مٹھی میں
گھوڑے کا سُم
چھومنتر سے
مٹھی میں گم

گڑیا

یہ گڑیا ہے
یہ پُڑیا ہے
پُڑیا کھولی
گڑیا بولی
یوں مت کھولیں
میری آنکھیں
اُڑ جائے گا
جادو ان کا
پُڑیا باندھیں
جادو دیکھیں
باندھی پُڑیا
ہنس دی گڑیا'' (۳۴)

پہلی نظم کے مطابق جادوگر کے ایک ہاتھ میں گھوڑے کا سُم ہے اور دوسرے میں ہاتھی کی دُم ہے۔ اب یہ بڑوں کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ انسانی ہاتھ میں یہ دونوں چیزیں نہیں آ سکتیں اور ساتھ ہی جادوگر انھیں منتر سے گم کر دیتا ہے۔ اسی طرح دوسری نظم کا لب لباب ایک جادو کی پُڑیا ہے جس کے کھولنے یا بند کرنے سے گڑیا حرکت کرتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ پُڑیا مت کھولیں جادو اُڑنے کا خدشہ ہے۔ پُڑیا بند کریں اور جادو دیکھیں۔ بچوں کے حوالے سے دیکھنے پر دونوں نظمیں کافی دلچسپی کا عنصر رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ آج بھی بہت بڑے بڑے جادوگر موجود ہیں جو اپنے کرتب دکھا کر بڑوں کو بھی دنگ کر دیتے ہیں اور یہ پیشہ آج بھی نہایت کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

چڑیا گھر کی سیر یا جانوروں کو قریب سے دیکھنا بچوں کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی خوشی کا موقع یا تہوار ہو بچوں کو ہمیشہ چڑیا گھر ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر طرح طرح کے جانور دیکھنا اور ان کے متعلق ڈھیروں معلومات حاصل کرنا بچوں کو بے حد اچھا لگتا ہے۔ ''ہاتھی'' اور ''لالو'' بھی اسی سلسلے کی دو نظمیں ہیں جن میں ان کے ظاہری خدوخال اور شکل وصورت کے علاوہ ان کی مصروفیات اور نقل وحرکت کے بارے میں بھی بڑی تفصیل سے بتایا جا رہا ہے۔

ہاتھی

''دو دانت لمبے لمبے ـــ دو کان چوڑے چوڑے
اِک پیٹ جیسے پیپا ـــ اِک سونڈ جیسے کھمبا
آنکھیں ذرا ذرا سی ـــ ٹانگیں بہت ہی موٹی
پاؤں بڑے بڑے سے ـــ جن میں لگے ہیں گدے

لالو

کالا پہاڑ جیسا ـــ یہ جانور انوکھا''
''بھالو ناچے، لالو ناچے ـــ لالو کا پھر خالو ناچے
دونوں تینوں ناچیں مل کے ـــ اِک دو چکر کاٹیں مل کے
امی دیکھیں ، خالہ دیکھیں ـــ کون ہے گرنے والا دیکھیں
امی بھالو کو چابی دیں ـــ خالہ لالو کو ٹافی دیں''(۳۵)

پہلی نظم یعنی ''ہاتھی'' میں اس جانور کے متعلق ہر طرح کی معلومات دی گئی ہیں کہ یہ دکھتا کیسا ہے۔ اس کا قد اور شکل وصورت کیسی ہے اور ان کو بیان کرنے میں تشبیہات کا بھی استعمال کیا گیا ہے جیسے پیپا، کھمبا اور گدے وغیرہ۔ ان سے نہ صرف بچوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اُن کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف ''لالُو'' میں ایک بھالُو کے ناچنے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اب بھالو کے ساتھ اور بھی ناچنے والے شامل ہو جاتے ہیں اور اس منظر کو سب بڑے انہماک سے دیکھ رہے ہیں۔ بچوں کو بہلانے کے حوالے سے یہ ایک اچھی نظم ہے جس طرح بچوں کی اکثر باتیں بے سروپا ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے لیے صرف نظم اور موسقیت ہونا ضروری ہے۔ مطلب سمجھنا ان کے لیے اتنا اہمیت نہیں رکھتا۔

لڑائی جھگڑا ہمیشہ سے ہی بُرا سمجھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں سے سب ہی دور بھاگتے ہیں جو ہر بات پر لڑائی سے کام میں انسان کو آپس میں بھائی چارے اور پیار محبت سے رہنا چاہیے۔ اسی میں سب کی بھلائی اور امن وسکون ہے۔ لڑائی سے کبھی بھی کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ دونوں فریقین ہی اس سے برابر نقصان اُٹھاتے ہیں۔ اسی بات کی ترجمانی اس نظم ''لڑائی'' میں کی جا رہی ہے۔ چونکہ اس نظم سے بچوں کو سمجھانا مقصود ہے تو لہٰذا اندار بھی بچوں والا ہی ہے اور کردار بھی بچوں کی سمجھ کے لحاظ سے لیے گئے ہیں۔

''دو بلونگڑے اس طرح لڑے
کان ایک کے ہوگئے بڑے
دوسرے نے ہاتھ کر لیے کھڑے''(۳۶)

بلی کے دو بچوں میں لڑائی کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک بچے کے کان بڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ لڑائی کے نتیجے میں ایک کو کافی نقصان ہوتا ہے تو دوسرا بچہ ڈر جاتا ہے اور لڑائی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ دونوں کے نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے لڑائی سے بچنا چاہیے۔ بات چیت سے اپنے مسئلے حل کر لینے چاہئیں۔

''آندھی''، ''گانا''، ''انجن''، ''نظم سنائیں'' ان چاروں نظموں کا انداز ایک ایسا ہی ہے۔ ان چاروں نظموں میں ہر شعر دوسرے سے مختلف ہے اور ہر شعر اپنے آپ میں ایک پورا موضوع لیے ہوئے ہے جس طرح بچوں کی بات شروع کہیں سے ہوتی ہے اور ختم کہیں پہ ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی لہجہ اور انداز ان نظموں کا بھی ہے۔

”جادو کی رسی سے باندھی
آتے آتے رُک گئی آندھی
چاول کھا کر چڑیا بولی
میں نے اپنی چونچ ہے دھولی
چھت پر کوّا کیوں بیٹھا ہے
مجھ کو اُس سے ڈرلگتا ہے
آندھی میں جن بھی ہوتے ہیں
جو کہتے ہیں وہ طوطے ہیں“(۳۷)

اب نظم کے شروع میں ہی دیکھ لیں کہ آندھی رسی باندھنے سے رُک گئی اور چڑیا کھانا کھا کر بتا رہی ہے کہ اس نے اپنی چونچ دُھولی ہے۔ چھت پر بیٹھے کوے سے بچے اکثر ڈر جاتے ہیں۔ یہ کچھ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں جو اس نظم کا خلاصہ ہیں جو بڑوں کے لحاظ سے تو بے تکی ہیں لیکن بچوں کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث بنتی ہیں اور بچے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتے ہیں۔

”آئیں آئیں آئیں
ایسا گانا گائیں
بادل مینہ برسائیں

کائیں کائیں کائیں
کوے شور مچائیں
اور بادل اُڑ جائیں“(۳۸)

لفظوں کی تکرار اس نظم میں موجود ہے جس سے نظم میں خاصی موسیقیت پیدا ہو رہی ہے۔ نظم پڑھنے پر یوں لگتا ہے کہ جیسے بچوں کا ایک ہجوم ہے جس میں ایک بچہ کھڑا ہو کر دوسرے بچوں کو خوش کرنے کے لیے گانا گا رہا ہے اور جو اس کو اچھا لگتا جا رہا ہے اسی کو وہ ردیف قافیہ ملانے کے لیے استعمال کرتا جا رہا ہے۔ خواہ اس کا کوئی مطلب ہو یا نہ ہو اور دوسرے بچوں کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ صرف دلچسپی کا عنصر مدنظر رکھا ہوا ہے۔

”ہم انجن تم ریل
او وہ موٹی ویل
ویل لگائے زور
ریل مچائے شور
انجن مارے چیخ
آج ہے کیا تاریخ

ہم اِک نظم سنائیں

نہر کے پل پہ جائیں سورج کو ٹھہرائیں

وہ چپ بات نہ مانے سیدھے گھر کو آئیں‘‘(۳۹)

دونوں نظمیں خالصتاً بچوں کو بہلانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں بچے بہت کچھ سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوتا ہے۔ اب ان نظموں سے وہ ریل گاڑی، انجن، نہر اور پل جیسے نئے الفاظ سیکھیں گے اور ساتھ ہی ان چیزوں کو مزید سمجھنے اور دیکھنے کے لیے بے شمار سوالات پوچھیں گے۔ یوں نظم صرف نظم نہیں رہے گی بلکہ بچوں کے لیے ایک سبق کا کام کرے گی۔

آسمان اور آسمان پر موجود چاند اور ستارے کسے خوبصورت نہیں لگتے۔ لیکن بچوں کا انھیں دیکھنا اور پھر ان کے بارے میں سوچنا اُن کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ ہوتا ہے۔ ان کے دیکھنے اور سوچنے کا انداز بڑوں سے بہت مختلف اور دلچسپ ہوتا ہے۔

’’تارے پیارے پیارے تارے دوست ہمارے

تارے بھولے بھالے جگ مگ کرنے والے

چھوٹے اور بڑے بھی نکلے شام آتے ہی

دو دو دس دس نکلیں آنکھ مچولی کھیلیں

چاند اُبھرے چھپ جائیں چاند کے ہاتھ نہ آئیں‘‘(۴۰)

بچوں کے لیے چاند اور ستاروں میں بہت کچھ دلچسپی کے لائق ہوتا ہے۔ رات کو جب پورے آسمان پر تارے چمک رہے ہوتے ہیں تو قدرت کے شاہکاروں میں سے ایک ایسا نظارہ ہوتا ہے جو بیان سے باہر ہوتا ہے۔ بچے اس نظارے کو اپنی نظر اور اپنے انداز سے بیان کر رہے ہیں کہ تارے بہت پیارے دوست ہوتے ہیں۔ بہت چمکدار ہوتے ہیں اور جیسے ہی دن کا اُجالا اور سورج کی روشنی ختم ہوتی ہے تو یہ تارے فوراً نکل آتے ہیں اور بے شمار ہوتے ہیں۔ کہیں دس دس کی ٹولیاں ہوتی ہیں اور جیسے ہی چاند چمکتا ہے تو تارے چھپ جاتے ہیں۔ دراصل چاند جب نکلتا ہے تو اُس کی روشنی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تارے اس کی تیز روشنی میں نظر نہیں آتے اور یوں قدرت کا یہ حسین نظام چلتا رہتا ہے اور بچے ان نظاروں سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔

''ٹیں مَیں قَیں'' طوطے، بکرے اور بطخ تینوں سے متعلق ایک ہلکی پھلکی سی نظم ہے۔

''جنگل سے اُٹھ کے پیڑوں پہ ٹھہرے
طوطے کی ٹین ٹین
گاؤں سے ہو کے کھیتوں میں پھیلے
بکری کی مَیں مَیں''(۴۱)

اس نظم میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں طوطے، بکری اور بطخ کی زندگیوں کی منظر کشی کی گئی ہے کہ طوطا جنگل میں اور پیڑوں پر رہتا ہے۔ بکری گھروں، گاؤں اور کھیتوں کا مکین ہے۔ جبکہ بطخ پانی پر رہتی ہے۔ یوں بچے ان جانوروں اور پرندوں سے متعلق مزید بہتر طور پر جان سکیں گے اور ان کی پہچان میں آسانی رہے گی۔

بلبلے:

'گلگلے' اور 'آلوچے' میں ننھے منوں کے لیے نظمیں لکھی گئی تھیں۔ 'گلگلے' میں بچوں کے لیے ہی نظمیں ہیں۔ لیکن ان نظموں کا انداز، الفاظ اور موضوعات تھوڑے بڑی عمر کے بچوں کے حوالے سے ہیں۔ یہی بچے کل کو بڑے ہو کر معاشرے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ اس لیے ان بچوں کے اخلاق اور کردار کی نشوونما اور تشکیل بے حد ضروری ہے اور ان سب کے لیے چھوٹے عمر سے ہی بچوں پہ محنت کرنا بہت ضروری ہے۔

قیوم نظر نے اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے 'بلبلے' میں ایسی ہی نظموں کو موضوع بنایا ہے جو بچوں کے لیے بے حد سبق آموز ہیں اور بچے ان سے ہر دفعہ کچھ نیا اور اچھا ہی سیکھتے ہیں۔ اب ان سب نظموں کا باری باری جائزہ لیا جائے گا۔

'بلبلے' میں موجود نظموں کا آغاز حمد اور نعت سے ہوتا ہے۔ حمد سے مراد ہے وہ نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور عظمت بیان کی جائے۔

''صبح سویرے میں جب اُٹھوں
چھوڑ کے بستر باغ میں پہنچوں
شاخ پہ کھلتے پھول کو دیکھوں

پھول اور چڑیاں اور ہوا بھی
سب کرتے ہیں حمد خدا کی
ان میں شامل اب ہوں میں بھی"(۴۲)

صبح سویرے اُٹھنا بہت اچھی عادت ہے۔ صبح سویرے اُٹھنے سے نہ صرف انسان کی صحت پر اچھے اثرات پڑتے ہیں بلکہ اُس کی ذہنی مضبوطی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس وقت سب چرند پرند، جانور ہر شے صبح سویرے اُٹھ کر اللہ کی حمد وثنا میں مصروف ہوتی ہے۔ صبح کے وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ بچوں کو شروع سے ہی صبح سویرے اُٹھنے کا عادی بنانا چاہیے۔ کیونکہ بچپن میں ڈالی گئی عادات ساری زندگی ساتھ رہتی ہیں۔ بچوں کو بھی صبح سویرے اُٹھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیے۔ بچوں کے کردار کی تشکیل میں دین کا سب سے اہم اور مضبوط کردار ہوتا ہے۔ اس لیے شروع سے ہی دین کو ساتھ لے کر چلنا بہت ضروری ہے۔

اس دنیا کو بنانے والی اور چلانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی سب کا خالق و مالک اور رازق ہے۔

"سب کو بنایا میرے خُدا نے
ہر ایک جانے ہر ایک مانے
آم اور آڑو سیب اور سردے
انگور، کیلے پھل میٹھے میٹھے
پیڑ اور پودے شاخوں پہ پتے
پھول اور خوشبو ہر سُو جو پھیلے
جن اور پریاں انسان فرشتے
پیر اور پیمبر جتنے بھی گزرے
جھیل اور دریا چاند اور تارے
صحرا، سمندر کہسار ٹیلے"(۴۳)

اللہ تعالیٰ نے پہلے اس دنیا کو بنایا اور اس میں اپنی قدرت کے تمام نظارے رکھے۔ پھر رب تعالیٰ نے

انسان کو تخلیق فرمایا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا نائب یا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کے تمام اُصول بتا دیے۔ بے شمار نعمتوں سے نواز دیا۔ دنیا کی ہر شے، ہر نظارہ اللہ پاک کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انسان، جانور، چرند پرند، پھل، پھول، پودے، رنگ، خوشبو، موسم، جھیل، دریا، سمندر سب اللہ کے تابع ہیں۔ وہی ذات ہے جو یکتا ہے اور بے مثال ہے۔ پھر اللہ نے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے پیغمبر بھیجے جو اللہ کا دین بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ یوں رب نے اس دنیا کا ایک نظام بنایا۔ جسے وہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں چلا رہا ہے۔ بچوں کا زندگی کی ان حقیقتوں سے شروع سے ہی واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

نعت نبی اکرم ﷺ کی شان میں پڑھی جاتی ہے۔ جس میں آپؐ کی سیرت اور زندگی پر بڑے ہی والہانہ انداز میں بات کی جاتی ہے۔

''چودہ صدیاں گزریں، آیا
اللہ کا اِک پیارا بندہ
پاک اور سادہ نیک اور سچا
وہ تھا محمد ﷺ حق کا پیمبر''(۴۴)

آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو بھیج کر اور آپؐ پر آخری کتاب قرآن پاک نازل فرما کر اپنے دین کو مکمل کر دیا اور آپؐ پر نبوت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا۔ آپؐ آخری پیغمبر ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپؐ نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا کر اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری فرما دی۔ آپؐ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ تمام نبیوں کے سردار ٹھہرے اور آپؐ کی زندگی ہمارے لیے اسوہء حسنہ ہے۔ جس پر عمل کر کے ہم دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یوں یہ سب باتیں زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں جو بچوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی ہیں۔ لیکن ان کا علم ہونا اور سمجھ ہونا ہر بچے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لہٰذا قیوم نظر نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں آپؐ کی سیرت کے متعلق کافی کچھ بتا دیا ہے او رنتیجہ وہی رکھا ہے جو بچوں کو آسانی سے سمجھ آ سکے تا کہ بچے شروع سے ہی اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں اور ان باتوں کے بارے میں بچوں کو جس قدر جلدی اور جس قدر وسیع معلومات

ہوں گی یہ بچوں کے لیے اُن کے والدین کے لیے اور اس معاشرے کے لیے سب کے حوالے سے بے حد بہترین بات ہے۔

انسان جہاں پیدا ہوتا ہے جس جگہ پر رہتا ہے، اُس سے محبت فطری جذبہ ہے اور اپنے وطن سے محبت کا اظہار انسان اکثر موقعوں پر کرتا ہے۔ کبھی اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر، کبھی اس کے پُرسکون ماحول سے متاثر ہو کر اور کبھی اپنے روشن مستقبل کو دیکھ کر۔ انہی خیالات کا اظہار قیوم نظر نے اپنی ان دو نظموں ''سب سے اونچا'' اور ''وطن میرا'' میں کیا ہے۔

سب سے اونچا

''میرا جھنڈا میرے وطن کا
سب سے اچھا سب سے اونچا
اس کا دو رنگا ریشمی کپڑا
تھوڑا سفید اور سبز زیادہ
اس میں چمکے چاند اور تارا

وطن میرا

جسے چاہوں اس میں رہوں کھیلوں کودوں ، لکھوں پڑھوں
پیار اس کی ہر شے سے کروں جان ہے میری بدن میرا
پاکستان وطن میرا''(۴۵)

آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی اصل قدر وہی جانتے ہیں جنھوں نے اس آزادی کو پانے کے لیے بے شمار قربانیاں دی ہوں۔ ایک آزاد ملک میں رہنے کا احساس ہی اور ہوتا ہے۔ اپنے ملک کی آزاد فضاؤں میں سانس لینا، وہ خوبصورت ترین احساس ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اپنے وطن کا جھنڈا آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس دلاتا ہے۔ اس میں موجود سفید اور سبز رنگ دنیا کے خوبصورت ترین رنگ لگتے ہیں۔ اس میں چمکتا چاند اور تارا ہماری زندگیوں میں روشنی بکھیرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بے شمار نعمتوں

اور قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ ہم جس طرح چاہیں اس آزاد ملک میں رہ سکتے ہیں۔ یہاں دنیا کی ہر شے اور سکون ہے۔ پہاڑ، دریا، سمندر، زرخیز زمین، کھلے میدان، ملیں، فیکٹریاں کیا ہے جو اس ملک میں نہیں ہے۔ اس وطن سے ہماری شناخت اور پہچان ہے اور اس نعمت پر ہم اللہ کا جس قدر شکر ادا کریں وہ کم ہے۔ وطن کیا ہے؟ آزادی کا مطلب کیا ہے؟ اپنی شناخت کیا ہے؟ ان سب باتوں کا بچوں کو خصوصاً نئی نسل کو علم ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ اُن کے دل میں شروع سے ہی وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہو سکے۔

بچوں کو اپنے کھلونوں سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اب وہ کھلونے دنیا کی نظر میں عام ہوں یا خاص لیکن بچے کی کل کائنات اس کے وہی کھلونے ہوتے ہیں۔ ''میرے کھلونے'' نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں جدید کھلونوں کی بات ہو رہی ہے اور دوسرے حصے میں وہی عام سے ہاتھ سے بنے ہوئے کھلونوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

''ٹین کی موٹر دوڑے فر فر
ناچیں مل کے ریچھ اور بندر

نظم کا دوسرا حصہ دیکھیں۔

مٹی کے ہیں میرے کھلونے
طوطا، مینا چڑیاں کوے
بھیڑیں، گائیں گھوڑے، ہاتھی
یہ ہیں میرے پیارے ساتھی
اپنی جگہ سے گو نہیں ہلتے
ان سے خوشی کے پھول ہیں کھلتے
ان کی مٹی میرے وطن کی
جو ہے مجھ کو جان سے پیاری''(۴۶)

نظم کے پہلے حصے میں جن کھلونوں کی بات ہو رہی ہے۔ وہ موٹر، ریچھ، بندر، ریل ہیں۔ یہ تمام کے تمام کھلونے چابی کی مدد سے چلنے والے ہیں اور بچوں کو ایسے کھلونے بے حد پسند آتے ہیں۔ لیکن چونکہ نظم میں

یہ بچے کے ذاتی کھلونے نہیں ہیں۔ اس لیے ان سب خوبیوں کے باوجود یہ کھلونے بچے کو پسند نہیں آتے۔ دوسری طرف مٹی سے بنے ہوئے طوطا، مینا، چڑیا، کوّے، بھیڑیں، گائیں وغیرہ جیسے کھلونے ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ لیکن چونکہ یہ بچے کے ذاتی کھلونے ہیں۔ اس لیے اُنھیں وہ بے حد محبت سے رکھتا ہے اور ان کو بے حد پسند کرتا ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی اگر یہ بات سمجھا دی جائے کہ جو چیز اُن کے پاس ہے جو اُن کی ذاتی شے ہے، وہ چاہے کتنی ہی عام کیوں نہ ہو، وہ اُن کے لیے بہت خاص ہے اور جو شے اُن کی نہیں ہے اور دوسرے کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، وہ چاہے کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہ اُن کی نہیں ہے۔ یعنی کہ شروع سے ہی اگر بچے کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا اور قناعت کرنا سکھا دیں، اُسے اگر شروع سے ہی جو ہے اُسی میں گزارا کرنے اور شکر کرنے کا عادی بنا دیں تو یہ چیز آگے چل کر اُسے بہت فائدہ دے گی۔ زندگی میں حالات اور وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اچھے کے ساتھ ساتھ بُرے وقت کے لیے بھی انسان کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور ہر حال میں اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ رزق کی فراوانی اور تنگی اُس کی طرف سے ہوتی ہے۔

پودے لگانا بہت اچھی بات ہے۔ اس سے نہ صرف ہمارا ماحول خوبصورت لگتا ہے بلکہ ہماری صحت پر بھی یہ سرسبز پودے بہت اچھے اثرات ڈالتے ہیں۔ بچوں کو بھی پودوں کی ان خوبیوں کا علم ہونا چاہیے تا کہ اُن کا رجحان بھی قدرت کے ان حسین مناظر کو دیکھنے اور ان میں اضافہ کرنے کی طرف ہو۔ دوسرا یہ کہ کافی پودے پھل دار بھی ہوتے ہیں۔ جن سے ہم نہ صرف عمدہ اور لذیذ پھل حاصل کرتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ بڑے بڑے باغات سے پھل اُتار کر اسے ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں۔ ''پیڑ لگائیں''، ''چنبلی''، ''پودے'' اور ''سرو'' اسی سلسلے کی نظمیں ہیں۔

''پیڑ لگائیں ہم آموں کے
امردوں کے آلوچوں کے
خوبانی کے یا سیبوں کے
شہر میں چرچے جن کے پھلوں کے'' (۴۷)

قیوم نظر نے اس ایک نظم میں بہت سارے پودوں کے نام لے لیے ہیں۔ جیسے سیب، آم، امرود،

آلوچے، خوبانی، سیب، جامن اور شیشم وغیرہ۔ پھر ساتھ ہی ہر پیڑ اور پودے کے فوائد بتا دیے کہ کون سا پودا پھلدار ہے اور کون سا پودا ویسے فائدہ مند ہے۔ کس پودے کی لکڑی کارآمد ہے اور کس پودے کا سایہ فائدہ مند ہے۔ یوں ایک نظم سے بچے بہت سارے پودوں اور ان کے فوائد سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو اس نظم سے یہ سبق دینا مقصد ہے کہ پودے لگانے چاہئیں خواہ کیسا بھی پودا لگائیں۔ اُس کا بہت خیال رکھیں تاکہ وہ بھی کل کو آپ کو پھل اور سایہ دے سکیں۔

پودوں کے حوالے سے اگلی نظم ''چنبلی'' ہے۔

''مانو میری بات سہیلی
پھولوں میں ہے پھول چنبلی
اس کا پودا پھیلا پھیلا
گھاس پہ رکھی چھتری جیسا''(۴۸)

یوں تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہر شے خوبصورت ہے۔ جس میں انسان، حیوان، چرند، پرندہ، پہاڑ، دریا، سمندر، سورج، چاند، ستارے، پھول، پھل، پودے وغیرہ سب ہی اللہ کی قدرت کے شاہکار ہیں۔ اسی طرح چنبلی پھول بھی بے حد حسین ہے۔ یہ چھوٹا سا نازک اور لمبی پتوں والا سفید پھول ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو بھی بے حد اچھی ہے۔ اس سے اکثر ہار بنائے جاتے ہیں جو مختلف خوشی کے موقع پر پہنے جاتے ہیں اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ہمارا قومی پھول ہے۔ ہر ملک کے قومی وملکی پھول ہوتے ہیں۔ قومی نشان ہوتے ہیں۔ قومی کھیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ پاکستان کا قومی پھول ہے اور بچوں کا اس بارے میں معلومات ہونا بے حد ضروری ہے۔

اگلی نظم ''پودے'' ہے۔

''اِک پودا ہے گملے میں رکھیں جس کو دریچے میں
اس کی حفاظت آپ کریں کاٹیں، چھانٹیں، پانی دیں
یہ ہے زیبائش کے لیے گھر کی آرائش کے لیے''(۴۹)

پودے لگانا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ پودے حفاظت مانگتے ہیں۔ وقت پر ان کو پانی دینا پڑتا ہے۔

کھاد ڈالنا پڑتی ہے۔ ان کی کانٹ چھانٹ بھی ساتھ ساتھ بے حد ضروری ہے۔ تبھی یہ گھر کی آرائش میں کام آتے ہیں اور بے حد خوبصورت لگتے ہیں۔ اسی طرح باغوں میں بھی جو ڈھیروں پودے لگائے جاتے ہیں۔ وہ سبھی بھرپور توجہ مانگتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کی صحیح طرح سے حفاظت نہ کی جائے، وقت پر پانی نہ دیا جائے۔ دھوپ چھاؤں کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ یا پھر مرجھا جاتے ہیں۔ لہٰذا باغوں میں موجود پودوں کو طریقے سے لگائیں اور حفاظت سے رکھیں تاکہ جب وہ پھل اور پھول دیں تو سب کو ہی اچھے لگیں۔ ورنہ پودے تو جنگلوں میں بھی ہوتے ہیں۔ جن کی نہ کوئی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ نہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ آپ ہی بڑے ہوتے ہیں۔ پھل پھول دیتے ہیں اور پھر وقت کے ساتھ مرجھا جاتے ہیں۔ لیکن اُن کو دیکھنے والا اور اُن کی تعریف کرنے والا کئی نہیں ہوتا۔ لہٰذا پودوں کا وجود ہماری زندگی کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ ہمیں مختلف پھل دیتے ہیں۔ دوسرا یہ ہ یہ ہمارے لیے آکسیجن کا انتظام کرتے ہیں۔ اسی لیے زیادہ سے زیادہ پودے لگانے پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ پودے نہیں ہوں گے تو آب و ہوا صاف ستھری نہیں رہ پائے گی۔ جس کی صورت میں انسانی زندگیوں کو مختلف بیماریوں کا خدشہ پیدا ہو جائے گا۔

پودوں کے اس سرسبز و شاداب سلسلے کی آخری نظم ''سرو'' ہے۔

''نہر پر وہ دیکھنا پیڑ سرو کا لگا
کس قدر بلند ہے اور سیدھا بانس سا
ایک ہی تنا ہے جو سر بسر چلا گیا''(۵۰)

پودوں میں ایک پودا سرو بھی ہے۔ یہ سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ نہ تو یہ پودا پھل دیتا ہے، نہ پھول دیتا ہے۔ لیکن سال کے بارہ مہینے ہرا بھرا رہتا ہے۔ کوئی موسم اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس پودے میں بے حد سادگی نظر آتی ہے اور یہی سادگی اس کی خوبصورتی ہے اور اس سادگی میں بھی اللہ نے اس قدر کشش رکھی ہے۔ اس سے یہ سیکھنے کو ملتا ہے کہ انسان کو بھی ہر معاملے میں سادگی اختیار کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس سادگی میں بھی ایک حُسن ہے۔

انسان کی زندگی میں رشتوں کی بے پناہ اہمیت ہوتی ہے اور ان کے بغیر زندگی گزارنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، خالہ، پھوپھو، مامی، تائی، دوست وغیرہ۔ ان سب رشتوں سے ہی زندگی رنگین اور خوبصورت ہوتی ہے۔ ان رشتوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی قیوم نظر نے ''میری امی''، ''میری بہن''، ''دوست

ہے میرا''، ''شکایت'' اور ''سالگرہ'' کے عنوان سے نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جن میں کسی نہ کسی رشتے یا تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلی نظم ''میری امی'' ہے۔

''صاف اور ستھرے اُجلے اُجلے
پیارے پیارے اچھے اچھے
پہناتی ہے مجھ کو کپڑے
کتنی پیاری
میری امی''(۵۱)

ماں ہماری زندگی کا سب سے اہم، قریبی اور ضروری رشتہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر ایک لمحہ گزارنا بھی محال ہوتا ہے۔ جس قدر بچہ اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ محبت ماں اپنے بچے سے کرتی ہے۔ ماں بچے کے لیے دن سے لے کر رات تک کام کرتی ہے۔ اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ خود چاہے کھانا نہ کھائے۔ لیکن بچے کی بھوک اسے بے چین کر دیتی ہے۔ خود پُرانے اور عام سے کپڑے پہن لیتی ہے۔ لیکن بچے کے لیے نئے اور صاف ستھرے کپڑوں کا انتخاب کرتی ہے۔ بچے کو خود پڑھاتی بھی ہے۔ بچے اپنی ہر مشکل اور تکلیف اپنی ماں سے بیان کرتے ہیں اور وہ ان کی ہر مشکل آسان بنا دیتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر ہی جیتی ہے اور بچے کی ذرا سی تکلیف اسے پریشان کر دیتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے ماں کا رتبہ اونچا رکھا ہے اور اس کے پیروں تلے جنت رکھی ہے۔ بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ بڑے ہو کر اپنے ماں باپ دونوں کا اسی طرح خیال رکھیں جس طرح انھوں نے بچپن میں اُن کا خیال رکھا تھا اور ان کی بہترین پرورش کی تھی۔

رشتوں سے متعلق دوسری نظم ''میری بہن'' ہے۔

''میری بہن پتلی مجھ سے ذرا لمبی
سوکھی لکڑی سی ہوتی نہیں ہے موٹی
سو کر جب اُٹھے رو کر جب بیٹھے
مجھ سے جب روٹھے بات نہیں کرتی
لڑنے سے بھاگ پڑھنے میں آگے''(۵۲)

بہن بھائی کا رشتہ بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے ہے جس میں روٹھنا، منانا، لڑنا، جھگڑنا، پیار کرنا، کھیلنا، کودنا ، یہ سب ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس نظم میں بھی بہن بھائی کے اس رشتے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ بچکی دیکھنے میں کمزور ہے۔ لیکن پڑھائی میں بہت آگے ہے۔ لڑنے سے بھاگتی ہے اور ہر وقت ہنستی مسکراتی ہے اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کا بھی بہت خیال رکھتی ہے۔ بہنوں کی محبت اپنے بھائی کے لیے ویسی ہی بے لوث ہوتی ہے جس طرح ماں کی محبت اولاد کے لیے ہوتی ہے۔

''امی روکو بانو کو — مجھ کو چھیڑتی ہے دیکھو
شیدو کہہ کے بلاتی ہے — بلّا بن کے ڈراتی ہے
نیکر کتنی کستی ہے — چھٹتی ہے تو ہنستی ہے
کہتی ہے میں ننگا ہوں — روتا ہوں اور گندا ہوں

امی میں کوئی بچہ ہوں''(۵۳)

بہن بھائی میں نوک جھوک تو عام سی بات ہے اور پھر آخر میں شکایتوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو دونوں طرف شروع ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں بھی بھائی جو چھوٹا ہے۔ اپنی بڑی بہن کے بارے میں ماں سے شکایت کر رہا ہے کہ یہ مجھے ہر وقت چھیڑتی ہے۔ میرا نام بگاڑتی ہے۔ مجھے گندا بچہ کہتی ہے۔ اُلٹے کام خود کرتی ہے اور الزام مجھ پر لگاتی ہے۔ بہن بھائی کی یہ نوک جھونک کی کہانی ہر گھر میں ہوتی ہے۔ اس نوک جھونک میں بہن بھائی کی ایک دوسرے کے لیے محبت اور فکر بھی شامل ہوتی ہے۔

خون کے رشتوں کے بعد جو رشتہ سب سے زیادہ مضبوط اور بے لوث ہوتا ہے۔ وہ دوستی کا رشتہ ہوتا ہے۔

''دوست ہے میرا نیک اختر — اس کا ہمارے قریب ہے گھر
جب وہ پتنگ اُڑاتا ہے — مجھ کو ضرور بلاتا ہے
اس کی اِک دادی بھی ہے — ہم کو ہی جو تکتی ہے''(۵۴)

بچوں سے اگر کبھی کسی دوست کے بارے یا کسی رشتہ دار کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ بڑی تفصیل سے آپ کو ساری معلومات دیتے ہیں کہ وہ رشتہ دار یا دوست کیسا ہے؟ کس طرح کا اُس کا گھر ہے؟ وہ کیا عادات رکھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ کچھ ایسی ہی تفصیلات سے اس نظم میں دوستوں کے بارے میں آگاہ کیا جا رہا ہے

سکہ نیک اختر گھر کے قریب رہتا ہے۔ دونوں ساتھ پتنگ بازی کرتے ہیں اور اس کی ایک دادی ہے۔ پھر دوسرے دوست کا ذکر آتا ہے کہ وہ پڑھائی میں تیز ہے۔ تیسرا دوست ہر چیز مل بانٹ کر کھاتا ہے اور چوتھا دوست وہ ہے جس کی سائی کل گم گئی تھی۔ بچہ اپنی معصومیت بھرے انداز میں ہر بات بتاتا چلا جاتا ہے۔ چاہے وہ بات اتنی اہم نہ بھی ہو کہ بتائی جائے لیکن بچہ کسی چشم دید گواہ کی طرح سب کچھ سناتا جاتا ہے۔ دوستوں کے بغیر زندگی میں کوئی رنگ نہیں ہوتا اور بہترین دوست وہ ہوتا ہے جو ہر اچھے بُرے وقت میں آپ کا ساتھ دے۔

جہاں دوستی ہوتی ہے وہاں تھوڑے بہت گلے شکوے اور ناراضگی بھی ساتھ چلتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال اس نظم ''سال گرہ'' میں ہے۔

''سال گرہ تھی   کل اچھی کی
اچھی بہن ہے   صدانی کی
صدانی ہے   گل کا بھائی
جس نے کل تھی   کھیر پکائی''(۵۵)

قیوم نظر نے بڑے ہی نرالے انداز میں ایک ایک کر کے نظم کے تمام کرداروں کا تعارف کروایا ہے۔ سال گرہ وہ موقع ہے جب یا جس دن انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ پھر ہر سال اُس دن کو اپنی پیدائش کی خوشی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ رواج صرف مغرب تک محدود تھا۔ لیکن وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ اور مختلف ثقافتوں کے میل جول نے اس رواج کو مشرق میں بھی متعارف کروادیا اور یوں یہ دن اب ہر جگہ بڑے زور وشور سے منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر گھر کو سجایا جاتا ہے اور جس بچے کی سال گرہ ہو اُس کے دوستوں اور رشتے داروں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا جاتا ہے۔ جو تحفے تحائف لے کر اس موقع پر آتے ہیں لیکن یہ بات ہو رہی ہے ایک متوسط گھرانے کی سال گرہ کی۔ اگر اس سلسلے میں بھی امراء کی طرف رُخ کیا جائے تو وہاں پر یہ دن باقاعدہ ایک تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ ہوٹل بک کروایا جاتا ہے اور کھانے کا بھرپور انتظام ہوتا ہے۔ یوں دوسروں کی ثقافت کا یہ دن ہماری ثقافت کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ اب ہمارے ہاں اگر کوئی سال گرہ پر نہ بلائے تو بھی ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ جس طرح اس نظم میں باجی شکایت کر رہی ہے کہ اچھی جب ملی تھی تب تو اُس نے سال گرہ کا ذکر نہیں کیا تھا اور جو کھیر وہ دے کر گئی تھی اس کا بھی نہیں بتایا کہ

وہ سال گرہ کی تھی۔ جبکہ چھوٹے بہن بھائیوں کا کہنا ہے کہ اچھی نے تو سال گرہ پر بلا کر کیک کھلایا تھا اور یہ کہ شاید باجی بھول گئی ہیں۔ یوں سال گرہ کی یہ نظم اختتام پذیر ہوتی ہے۔

بچے کھانے پینے کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ اکثر بچے طرح طرح کے چٹ پٹے مصالحے دار کھانے پسند کرتے ہیں تو کچھ بچے سادہ خوراک پسند کرتے ہیں۔ کچھ بچوں کو صرف گھر کا کھانا پسند ہوتا ہے اور اکثر بچے گھر کے کھانے سے بہت دور بھاگتے ہیں اور گھر کے کھانے کے علاوہ انھیں باہر کی ہر شے کھانے میں پسند ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پھل کھانا، بچوں کو بے حد پسند ہوتا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر قیوم نظر نے ''دال چنے کی''، ''مولی''، ''موسم آموں کا''، ''''کچالو''، ''کریلے'' اور ''خربوزے'' جیسی نظمیں لکھی ہیں۔

''دال چنے کی'' اس سلسلے کی پہلی نظم ہے۔

''دال چنے کی بڑے مزے کی
بھڑ بھوجن نے ہم کو کھلائی
پہلے اُس نے ایک کڑاہی
ریت تھی جس میں خوب تپائی
مُٹھی چنوں کی اس میں ڈالی
پھر تنکوں سے ریت ہلالی
گرم چنوں پر جب وہ تڑکے
اِک ہنڈیا سی اُس نے چلائی''(۵۶)

پہلے زمانے میں جب ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی اور ٹیکنالوجی کا دور دورہ نہیں تھا اور زندگی بہت سادہ تھی۔ لوگ اپنے روزمرہ کے کام کاج مشینوں کی بجائے ہاتھوں سے کرنے پر مجبور تھے اور فارغ وقت میں ٹی وی یا کمپیوٹر کی بجائے اپنے گھر کے بڑے بزرگوں کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اپنے سارے دن کے معاملات کے ساتھ ساتھ اپنی پریشانیاں اُنھیں بتاتے تھے۔ تب بچوں کے کھیل اور شغل بھی سادہ تھے۔ ان کا رہن سہن، ان کی خوراک تک سادہ تھی۔ تب اپنے اپنے محلوں میں عورتیں یا مرد چنے بھونے کا کام کرتے تھے۔ بچے ان کے پاس بڑے شوق سے جاتے تھے اور بھنے چنے یا دال لے کر کھایا کرتے تھے۔ اب وہ بھڑ بھوجن ان چنوں کو کس

طرح بھونتی ہے۔ کس طرح سے اُن کی صفائی کر کے چھلکے الگ کرتی ہے۔ وہی سارا احوال اس نظم میں بیان کیا گیا ہے اور قیوم نظر نے اس سارے سلسلے کو اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ وہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ لہٰذا جو چیزیں وقت کی تیز رفتاری اور ترقی کے باعث کہیں کھو گئی ہیں۔ اس نظم کو پڑھ کر وہ ساری یادیں تازہ کی جاسکتی ہیں اور یوں بچے بھی ماضی کے ایک بہت دلچسپ پیشے سے واقف ہو جائیں گے۔

سبزی اور پھل کھانا صحت کے لیے بے حد مفید ہے اور خاص طور پر بچوں کے لیے تو یہ دونوں چیزیں بہت ضروری ہیں۔ لیکن بچے اکثر سبزی پھل کھانے سے بھاگتے ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ سبزی اور پھل سے متعلق نظمیں پڑھ کر اُن کا بھی اس طرف رجحان ہو جائے۔

''سفید مُولی بڑی نہ چھوٹی
اِدھر سے پتلی اُدھر سے موٹی
وہ ڈنٹھل اُس کے وہ سبز ہے
وہ جن پہ کانٹے ذرا ذرا سے
وہ اس کو سیدھا چھری سے کاٹا
نمک لگایا مزے سے کھایا''(۵۷)

اسی طرح ''کریلے'' کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے فائدے گنوائے جا رہے ہیں۔

''کریلے ہوں کڑوے مگر ہوں مزے کے
کسی دن جو چاہو کھلائیں کریلے
پکانے سے پہلے انھیں چھیل بھی لیں
الگ بیج کرکے بنائیں کریلے''۵۸)

پہلی نظم میں ''مولی'' کا ذکر ہے جس میں اس کے ظاہر خدوخال کے ساتھ اس کے ذائقے کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ کچی سبزی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ لہٰذا بچوں کو شروع سے ہی ایسی کچی سبزیوں کو کھانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی بنائی ہوئی ہر سبزی میں کوئی نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری نظم میں ایک بہت مفید سبزی ''کریلے'' کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ کس کس طرح پکایا جاسکتا ہے اور اس کی ظاہر

شکل وصورت کیسی ہے؟ ساتھ ہی یہ کس موسم کی سبزی ہے؟ کس موسم میں اُ گائی جا سکتی ہے۔ یہ ساری معلومات اس مختصر نظم میں بتا دی گئی ہیں تا کہ بچوں کو نہ صرف مختلف سبزیوں کی پہچان ہو جائے۔ بلکہ وہ ان کے فوائد سے بھی آ گاہ ہو سکیں۔

سبزیوں کے بعد جن تین پھلوں کا ذکر ان نظموں میں کیا گیا ہے۔ وہ خربوزہ، کچالو اور آم ہیں۔ تینوں نظموں کا انداز اور موضوع ایک ہی ہے یعنی مذکورہ پھل کے فوائد اور ذائقے کے بارے میں بتانا ہے۔

''ریہڑے والے ادھر تو آؤ
یہ خربوزے ہیں کیا بھاؤ؟''(۵۹)

''لے کے اِک امرود بڑا سا چاقو سے جب اُس کو چھیلا
نرم تھا وہ اور یوں لگتا تھا جیسے ہوگا بہت ہی میٹھا''(۶۰)

پہلی نظم جو کہ ''خربوزے'' سے متعلق ہے۔ اُس میں خربوزے کے بارے میں ہر طرح کی معلومات دی گئی ہیں کہ دیکھنے میں اوپر سے پیلا اور سبز لکیریں ہوتی ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ بے حد میٹھا پھل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ساری نعمتوں سے نوازا ہے جس کا ہم جتنا شکر بھی ادا کریں کم ہے۔ صرف پھلوں کو ہی دیکھ لیں تو اتنی ساری اقسام اور ذائقوں والے پھل اللہ نے ہمیں دیے ہیں اور ہر خطے کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ پھل اور ذائقے دیے ہیں۔

دوسری نظم میں امرودوں اور کچالو کا ذکر ہے۔ ان کے بھی ظاہری خدوخال بیان کیے ہیں۔ پھر ساتھ ہی اس کے ذائقے کے بارے میں بتایا ہے۔ قیوم نظر نے ہر بات کو اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا اس شے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیتا ہے۔

''گنجے ہوں یا بالوں والے بوڑھے ہوں یا لڑکے بالے
پکے پکے میٹھے میٹھے کھائیں آم سبھی چُن چُن کے
ذکر کریں ہر دم آموں کا
آیا ہے موسم آموں کا''(۶۱)

آم پھلوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ بے حد مزیدار پھل ہے۔ بچے بڑے سب ہی اس پھل کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ آموں کے موسم کا سب کو ہی انتظار ہوتا ہے اور پھر آموں کے موسم میں اس پھل سے جس قدر لطف اندوز ہوا جاتا ہے اسکی بھرپور عکاسی قیوم نظر نے اس نظم میں کی ہے کہ کس طرح ماؤں کی لاکھ احتیاط کے باوجود بچے آم کے دھبے اپنے کپڑوں پر لگا لیتے ہیں اور یوں شغل شغل میں آم کھائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی بچو کو اس میں یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ آم کو پاکستان برآمد بھی کرتا ہے اور یہ پھل ساری دنیا میں بہت پسند کیا جاتا ہے اور پاکستان کی اس کی برآمد سے اچھا خاصا زرمبادلہ کماتا ہے۔

بچوں کو شروع سے ہی مختلف کھیل کھیلنے کا اور میلوں پر جا کر مختلف کرتب دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ میلوں میں جانے کے لیے بچے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ بچہ نٹ کا، بلبلے، میلہ شالا مار کا، کبڈی، لٹیرے، چھٹی اور بچے اسی سلسلے کی نظمیں ہیں۔

”سر پہ رکھے رس کا مٹکا
ناچنے آیا باندھ کے پٹکا
بچہ نٹ کا
پل میں پہنچا اُس رسی پر
جو تھی اُونچی چھت کے برابر
بچہ نٹ کا“(۶۲)

اکثر میلوں میں کرتب دکھانے والے آتے ہیں جس کو آج کل سرکس کہا جاتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے گروہ ہوتے ہیں جن میں ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں اور ہر ایک آدمی کا ایک کام ہوتا ہے، جو وہ اس سرکس میں کرتا ہے۔ مثلاً کوئی رسی پر چلتا ہے تو کوئی انسانی کھمبا بناتا ہے اور کوئی ایک پہیے والی سائیکل چلاتا ہے یعنی عوام کی دلچسپی کے بہت سارے کرتب اس ایک وقت میں ایک گروہ کی جانب سے دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال اس نظم میں بھی ہے کہ بچہ اسی پر ناچ رہا ہے۔ نیچے ایک آدمی ڈھول بجا رہا ہے اور دیکھنے والے اس منظر کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہیں۔

میلوں سے متعلق ہی دوسری نظم ”میلا شالا مار کا“ ہے۔ جس میں میلوں کی بڑے بھرپور انداز میں عکاسی

کی گئی ہے۔

"کھیتوں سے مُنھ موڑ کے سب کاموں کو چھوڑ کے
دہقانوں کی ٹولیاں گاتی آئیں بولیاں
اور منائیں شوق سے
میلا شالا مار کا" (۶۳)

دہقان سارا سال کھیتوں میں کام کرتے ہیں تا کہ اناج اُگا سکیں اور یہ اُنہی کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمیں گھر بیٹھے بہترین اناج میسر ہو جاتا ہے۔ یوں سارا سال محنت کرنے والا یہ طبقہ سال میں ایک یا دو دفعہ صرف تبھی چھٹی مناتا ہے جب میلہ لگتا ہے۔ اکثر یہ میلے فصل کی کٹائی کے بعد خوشی کے طور پر لگتے ہیں جس میں سارے بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ اب ان میلوں میں ان لوگوں کے لیے دلچسپی کے کیا کیا عناصر ہوتے ہیں۔ اس نظم میں اُنہی کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ شالا مار لاہور میں موجود ایک باغ کا نام ہے جہاں یہ میلا لگتا ہے۔ اس میلے میں مختلف کھیلوں، کرتب کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی بھی بے شمار چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جن میں قلفیاں، لڈو، پیڑے، برفی، بوتلیں وغیرہ شامل ہیں۔ ساتھی ہی وہاں خوب شور شرابا ہوتا ہے۔ ڈھول بجتا ہے۔ یہ دیہات کی سیدھی سادی زندگی کی بھرپور عکاسی ہے۔ جہاں نہ تو زندگی تیز رفتار ہے اور نہ ہی سب اپنی اپنی دُھن میں مگن ہوتے ہیں بلکہ سب آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوشی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب آپس میں دوستوں کی طرح ہوتے ہیں اور زندگی اپنے سکون اور خوبصورتی کے ساتھ پورے عروج پر ہوتی ہے۔ یوں بچے دیہاتی زندگی کے اس نئے اور دلچسپ پہلو سے روشناس ہوں گے۔

بچوں کی دلچسپی کے حوالے سے نظم "بلبلے" بھی بہت اہم ہے جس میں بلبلے بنانے کا سارا عمل سکھایا گیا ہے۔

"آؤ بنائیں بلبلے
مل کر اُڑائیں بلبلے
پیالی میں پانی لو ذرا اور اس میں صابن لو ملا
پھر ایک نلکی کا سرا اس میں ڈبو کر لو اُٹھا

نلکی میں مارو پھونک اب وہ بن گیا اِک بُلبلا
یونہی بنائیں بلبلے
مل کر اُڑائیں بلبلے‘‘(۶۴)

وقت نے جب ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی یعنی جب کمپیوٹر اور ویڈیو گیمز کا دور ابھی نہیں آیا تھا۔ اُس وقت بچوں کے کھیل بھی سادہ ہوتے تھے اور بچے اپنی دلچسپی کے بہت سے کھیل گھروں میں ہی ڈھونڈ لیتے تھے۔ جیسے یہ بلبلے بنانے والا کام بچے گھروں پر ہی کرتے تھے اور قیوم نظر نے بے حد خوبصورتی کے ساتھ اس بلبلے بنانے کے سارے عمل کو بیان کیا ہے کہ کوئی بھی بچہ آج بھی آسانی سے یہ گھر پر بنا سکتا ہے۔ یہ بلبلے دیکھنے میں بھی بے حد خوبصورت لگتے ہیں۔ قوس وقزح کے رنگ ان میں بکھرے نظر آتے ہیں اور یہ بچوں کا بے حد پسندیدہ مشغلہ بھی ہیں۔

بچے جہاں بے شمار کھیل کھیلتے ہیں اور اپنے فارغ وقت کو صحت مندانہ سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں وہاں ایک کھیل ’’کبڈی‘‘ بھی ہے۔ جسے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے زیادہ شوق سے کھیلتے ہیں۔ اسی کھیل کا ذکر اس نظم ’’کبڈی‘‘ میں میں ہو رہا ہے۔

’’کھیلوں میں اِک کھیل کبڈی جس میں لنگوٹے کس کے کھیلیں
ایک طرف سے ’’کبڈی کبڈی‘‘ کہتے نکلیں اور جا پہنچیں
پالے کے اُس پار جہاں پر دوسری جانب والے پکڑیں
جھانسا دے کے، چھو کے کسی کو پھرتی سے تیزی سے پلٹیں
بھاگ کے پھر پہنچیں پالے پر روکنے والے کو جھٹکا دیں
یوں ہی ماریں، چلائیں ساتھی پالا جیت کے کودیں، اُچھلیں
لڑکے بالے کھیلیں کبڈی باغوں، کھیتوں، میدانوں میں‘‘(۶۵)

کبڈی بھی ایک اہم کھیل ہے جو زیادہ تر ہمارے ایشاء میں کھیلا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ کھیل صرف ملکی و قومی سطح تک محدود تھے۔ اب اس کھیل کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ بلکہ کافی حد تک یہ کھیل اب جانا جاتا ہے۔ اس کھیل میں دونوں طرف کے کھلاڑی اپنی اپنی حدود کی حفاظت پر ہوتے ہیں۔

جبکہ مخالف ٹیم کا کھلاڑی دوسرے کی حدوود میں جا کر کسی ایک کھلاڑی کو چھو کر واپس اپنی حدود میں آ جائے تو اس سے اس ٹیم کا گراف اوپر چلا جاتا ہے اور اس طرح زیادہ نمبر بنانے والی ٹیم جیت جاتی ہے۔ قیوم نظر نے اس کھیل کی اس نظم میں بڑے بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے کہ بچوں کو اس کھیل کے متعلق ساری معلومات آسانی سے سمجھ آ جائے گی۔

بچے عمر کے اس حصے میں بہت سے کھیل کھیلتے ہیں۔ بہت سی باتیں سیکھتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب بچے خود سے اچھے بُرے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ اب یہ بڑوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ بچوں کو بتائیں کہ اُن کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے؟ کون سا کام وہ کر سکتے ہیں اور کس کام سے دور رہنا اُن کے حق میں بہتر ہے؟ نظم ”لٹیرے“ اسی حوالے سے ایک بہت اہم نظم ہے۔

”باندھ کے ڈھنگر   بانس کے اوپر
ہاتھ میں تھامے   دوڑیں لڑکے
تانگا گاڑی   آئے کچھ بھی
یہ سڑکوں پر   پاگل ہو کر
لپکیں، اُچھلیں   پکڑیں، جھگڑیں
سر، مُنھ نوچیں   کپڑے پھاڑیں
جس دم لوٹیں   کٹی پتنگیں
یوں مل جانا   ایک پتنگ کا“(۶۶)

پتنگ بازی بچوں یعنی لڑکوں کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ بلکہ اب تو بسنت کو باقاعدہ ایک تہوار سمجھا جاتا ہے جو خزاں کے جانے اور بہار کے آنے کی خوشی میں مختلف قسم کی رنگا رنگ پتنگیں اُڑا کر منایا جاتا ہے۔ بچے ایسے تہواروں میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اس پتنگ بازی میں بچے اکثر جلد بازی اور بے وقوفی کر جاتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی جان کو خطرہ ہوتا ہے بلکہ عدم برداشت کی وجہ اکثر لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب بھی کوئی پتنگ کٹ کر آتی ہے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ پتنگ اُسے مل جائے۔ بچے لمبے لمبے ڈنڈے لے کر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اس ایک پتنگ کو پانے کے لیے وہ نہیں دیکھتے کہ سڑک سے گزر رہے ہیں یا بازار سے گزر رہے ہیں۔ اُن کو تو بس وہ پتنگ نظر آتی ہے اور اُس پتنگ کو پانے کی دُھن اس وقت اُن کے دل و دماغ پر سوار ہوتی ہے۔ اس طرح پتنگ کا مل جانا مزے کی بات لگتی ہے لیکن صرف

ایک پتنگ کے لیے یوں پاگلوں کی طرح لٹیروں کی طرح بھاگتے پھرنا کہاں کی اچھی حرکت ہے؟ پھر اس میں لڑائی جھگڑے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا کھیل کو کھیل رہنے دیں اور اخلاقیات سے نیچے گرنے سے پرہیز کریں۔ ہر کام اور ہر کھیل ایک حد میں ہی اچھا لگتا ہے۔

سکول جانا بچوں کو پسند نہ ہو، جانا ہی پڑتا ہے اور اس سارے عمل میں جو چیز بچوں کو سب سے زیادہ پسند ہوتی ہے اور جس کا سب بچے شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ وہ چھٹی کا وقت ہوتا ہے جس کے بعد وہ خود کو اس سکول نما قید خانے سے آزاد کرتے ہیں۔ یہ نظم "چھٹی" بچوں کے ان جذبات کی بھرپور عکاس ہے۔

"ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجی   وہ شور اُٹھا مٹی اُڑی
کمروں سے نکلے دوڑے   لڑکے سبھی چھوٹے بڑے
چھٹی ہوئی سکول میں" (۶۷)

چھٹی کے وقت بجنے والی گھنٹی کی آواز بچوں میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے اور اس کے سُنتے ہی بچے خوشی اور جوش کے ملے جلے جذبات لے کر گھروں کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اس بھاگنے دوڑنے میں ایک شور سا اُٹھتا ہے۔ مٹی اُڑ رہی ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے سب لڑکے، لڑکیاں بھاگتے ہیں، ہنستے ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ اکثر یہ مناظر اس قدر شورشرابے سے بھرپور ہوتے ہیں کہ آس پاس کے درختوں پر موجود پرندے ڈر کر اُڑ جاتے ہیں۔ دراصل یہ سب بچوں کے گھر جانے کی خوشی میں آنے والے جذبات ہیں۔ جن کا اظہار وہ اپنے ہر ہر انداز سے کر رہے ہوتے ہیں۔

دن کا آغاز ہوتے ہی ہر جاندار اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے اور سارا دن اس تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں کو لوٹتا ہے۔

شام ہوئی   اور پنچھی
پیڑوں کو   لوٹے ہیں
بچے بھی میدان سے   گھر اپنے پہنچے ہیں
اور میٹھی   روشنیاں
ہر گھر میں   جاگی ہیں (۶۸)

دن چڑھنے پر جہاں بڑے رزق کی تلاش، کاروبار، گھر کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، وہیں بچے سکولوں کو چلے جاتے ہیں۔ پھر سکولوں سے واپس آ کر اُن کے کھیلنے کودنے کا وقت شروع ہوتا ہے تو بچے کھلے میدانوں یا باغوں کا رُخ کرتے ہیں۔ پھر جیسے ہی شام کے سائے نظر آنے لگتے ہیں تو انسان، جانور، چرند پرند سب اپنے اپنے گھروں، گھونسلوں کا رُخ کرتے ہیں۔ گھروں میں روشنیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ سب بچے بھی اب تھک ہار کر گھروں کو چلے جاتے ہیں اور گھروں کی رونق اُنہی بچوں سے ہوتی ہے۔ انہی سے گھروں اور زندگیوں میں رنگ و بو ہے۔ یہ سب بچے خود بھی بہت پیارے ہوتے ہیں اور ان کی حرکتوں اور کھیل ان کی معصومیت کی وجہ سے اور بھی پیارے لگتے ہیں۔ یہ بچے بے فکر اور سادہ زندگی گزارتے ہیں اور ان کی محبت بھی سادہ اور مخلص ہوتی ہے۔

اسی سلسلے کی نظم ''سورج نکلا'' بھی ہے کہ دن کا آغاز ہوتے ہی سب کس طرح اپنی اپنی روزمرہ زندگی اور کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

''خوشبوؤں نے باغچوں کے
کونے کونے کو مہکایا
سورج نکلا دن چڑھ آیا''(۶۹)

صبح کا منظر بے حد حسین اور دلفریب ہوتا ہے۔ جب ہر طرف خوشبوؤں کی مہک ہوتی ہے۔ رنگ برنگے پھول اور پودے باغوں کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے ہوتے ہیں۔ یہ جانور، چرند پرند، کیڑے مکوڑے سب کے سب اپنے اپنے انداز میں صبح کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ سب اللہ کی حمد و ثنا میں مشغول ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت تازہ ہوا کے جھونکے روح تک کو تازگی بخشتے ہیں۔ ہر طرف زندگی دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ سورج نکل آتا ہے اور دن چڑھ جاتا ہے۔ بچے، جوان، بوڑھے سب صبح کی سیر کو نکل پڑتے ہیں اور واپسی پر خوشی کے ساتھ دن کا آغاز کی خبر دیتے ہیں۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ چلنا ہی زندگی ہے اور کام کرنا ہی انسان کو مصروف رکھتا ہے۔ ویسے بھی دن اللہ نے کام کے لیے اور رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ لہٰذا دن چڑھتے ہی سب اس سے فائدہ اُٹھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

نظم ''صبح سویرے'' میں بھی انہی باتوں کی عکاسی کی گئی ہے جن کا ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

''کُتے بھونکے مُرغا جاگا
چوزے چونکے ڈربا جاگا
لے گئی کس کو شیر کی خالہ''(۷۰)

صبح سویرے جس طرح ہر جاندار اپنے دن کا آغاز کرتا ہے۔ اُس کو قیوم نظر نے بڑے کمال انداز میں بیان کیا ہے کہ کس طرح جانوروں سے لے کر چرند پرند اور انسان تک صبح صادق اُٹھ جاتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چوزے چونکہ ڈربے میں رہتے ہیں، اس لیے وہ صبح سب سے پہلے اُٹھ کر یہ دیکھتے ہیں کہ رات کو کہیں بلی کسی چوزے کو اُٹھا کر تو نہیں لے گئی۔ دوسری طرف سارے پرندے بھی جاگ کر اپنے کاموں میں یعنی دانہ دنکا چُننے لگ جاتے ہیں۔ ادھر گھروں میں بچے بڑے سب اُٹھ جاتے ہیں۔ گوالے صبح صبح بھینسوں کا تازہ دودھ نکال کر گھروں میں دینے آجاتے ہیں۔ زندگی اپنے پورے عروج اور رونق پر پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک ضروری سبق جو اس نظم کے آخر میں دیا گیا ہے کہ صبح اُٹھنے سے جہاں بے شمار فوائد ہوتے ہیں وہیں انسان زیادہ چست رہتا ہے۔ جب افراد چست اور چاک و چوبند ہوں گے تو تبھی وہ ملکی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں گے اور جس قوم کے افراد محنتی ہوں گے۔ وہی قومیں ترقی کی راہ پہ گامزن ہو کر دنیا میں اپنا لوہا منوا سکیں گی۔

روشنی اور دن کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ اس کا اندازہ نظم ''سورج'' سے ہوتا ہے۔

''آگ کا یہ ہے ایک سمندر — آگ کا طوفان اس کے اندر
پتھروں کو بھی جو پگھلا دے — بلکہ اُن کو بھاپ بنا دے
اس میں حرارت اتنی زیادہ — مشکل ہے اس کا اندازہ''(۷۱)

سورج کا وجود ہماری زندگیوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ بلکہ زمین پر جو زندگی کے آثار ہیں وہ سورج کی بدولت ہیں۔ یہ حرارت کا منبع ہے۔ دن کی روشنی سورج کی بدولت ہے۔ چاند کو روشنی سورج سے ملتی ہے۔ اسی سورج سے پانی بخارات بن کر اُوپر اُٹھتا ہے۔ جس سے بادل اور بارش جیسے سلسلے چلتے ہیں۔ یہ سورج ہی ہے جو ہمارے لیے اناج اور دوسری فصلیں تیار کرتا ہے۔ پھل کو پکاتا ہے۔ ساتھ ہی جتنا بھی سبزہ اور پھول

اپنے اردگرد ہم دیکھتے ہیں۔ وہ سب اسی سورج کی بدولت ہیں۔ اگر یہ سورج نہ ہوتو نہ تو دن کا پتہ چلے اور نہ ہی رات کو چاند کی روشنی میسر آ سکے۔ لہٰذا یہ نظم بچوں کو نہ صرف سورج سے متعلق بھرپور معلومات دیتی ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی زندگی کی بے شمار ضروریات اور سورج سے ملنے والے فوائد کا بھی احاطہ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا نظام بے حد حسین اور منظّم بنایا ہے۔ ہر شے اپنے مقررہ وقت پر آتی اور جاتی ہے۔ کہیں کوئی خلل یا کمی نہیں ہے اور دنیا کی ہر شے اور نظارہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہیں۔ انھی میں سے دو کا ذکر یہاں نظم ''چاند'' اور ''تارے'' کی صورت میں کیا جا رہا ہے۔

'چاند سفر پر نکلا ہے — سر پہ ہمارے پہنچا ہے
مشرق سے یہ اُبھرا تھا — مغرب میں چھپ جائے گا
شام ہی کو آتا ہے نظر — رات کو جو کرتا ہے سفر
چاند زمین کا ہمسایہ — چندا ماموں کہلایا''(۷۲)

دن میں سورج کی روشنی ساری دنیا کو روشن کر دیتی ہے اور جیسے ہی شام کے سائے ڈھلتے ہیں اور جب رات گہری ہو جاتی ہے تو چاند کی روشنی ہر شے پر پھیل جاتی ہے۔ اس کی چاندنی بہت ٹھنڈک اور سکون کا احساس دیتی ہے۔ چاند بھی دراصل سورج سے ہی روشنی لیتا ہے اور دن کے وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن سورج کی اس قدر تیز روشنی میں چاند کا نظر آنا ناممکن ہے۔ لیکن جیسے ہی سورج ڈوبتا ہے تو چاند نظر آنے لگتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور دنیا کا یہ نظام نہایت خوبصورتی سے چلتے رہتے ہیں۔ چاند اور بچوں کا رشتہ اتنا قریبی ہے کہ یہ بچوں کا چنداماموں بھی کہلاتا ہے۔ بچے اس چنداماموں سے ڈھیروں باتیں کرتے ہیں اور چاند سے منسوب کہانیاں بھی بے حد شوق سے سُنتے ہیں۔ انسان نے اس چاند کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اس پر قدم بھی رکھا ہے اور ابھی تک چاند سے متعلق بہت سی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ بے شک یہ اللہ کی قدرت کے کرشمے ہیں اور اللہ کی نعمتیں ہیں۔

اسی طرح ''تارے'' بھی ہیں جو رات کے وقت ہی نظر آتے ہیں۔

''رات ہے روشن ہیں تارے — ہنستے کھیلتے ہیں سارے
کچھ اس طور چمکتے ہیں — جیسے ہم کو تکتے ہیں
آنکھیں یوں جھپکاتے ہیں — گویا پاس بلاتے ہیں''(۷۳)

رات کو جب ہر طرف اندھیرا ہوتا ہے تو آسمان ستاروں سے روشن ہو جاتا ہے۔ یہ ستارے جب چمکتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپس میں باتیں کر رہے ہیں یا سب کو اپنی طرف بلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ بے شمار ہوتے ہیں۔ ان کا شمار ناممکن ہوتا ہے۔ کچھ تیز روشنی سے چمکتے ہیں اور کچھ کی روشنی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ وہ نظر بھی نہیں آتے۔ یہ ستارے الگ ہی دنیا کے لگتے ہیں۔ لیکن یہ آسمان کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ کر دیتے ہیں اور خصوصاً بچوں کے لیے یہ ستارے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بہت خوبصورتی سے سجایا ہے اور اس میں بے شمار نعمتوں سے سب کو نوازا ہے۔ انہی نعمتوں میں سے ایک نعمت اللہ نے موسموں کی صورت میں دی ہے۔ ہر موسم کے اپنے رنگ ڈھنگ ہیں۔ سردی زیادہ ہو تو دھوپ نعمت ہے۔ گرمی زیادہ ہو تو بارش نعمت ہے۔ خزاں کا موسم آ جائے تو بہار نعمت ہے۔ یوں دنیا کا یہ موسمی نظام چلتا رہتا ہے۔ گرمی کی شدت میں اضافے کے بعد جب ہر طرف حبس کا عالم ہوتا ہے تو اس صورت حال میں ہونے والی بارش کس طرح سب کے مرجھائے ہوئے چہرے کھلا دیتی ہے۔ اس کا انداز ان دو نظموں ''مینہ برسا ہے'' اور ''برسات'' سے ہوتا ہے۔

مینہ برسا ہے

''ندی نالے بھر بھر کرتے
جا پہنچے ہیں جانے کہاں تک
جل تھل جل تھل ہر جانب ہے
کتنے مزے کا
مینہ برسا ہے

برسات

بادل آئیں ، بادل جائیں کالی گھٹائیں مینہ برسائیں
جن کو اپنے دوش پہ لائیں دل خوش کرنے والی ہوائیں''(۷۴)

گرمی جب حد سے زیادہ بڑھ جائے اور برداشت کرنی مشکل ہو جائے تو پھر اکثر بارش آ جاتی ہے۔ گرمی سے انسان، حیوان، چرند پرند جو کہ نڈھال ہو چکے ہوتے ہیں۔ بارش اُن میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی ہے۔ اس

بارش سے جہاں انسانوں کے چہرے کھل جاتے ہیں وہیں جانور اور پرندے بھی اس بارش میں بھرپور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بچوں کے لیے تو یہ بارش عید کی سی خوشی لاتی ہے۔ وہ اس میں نہاتے ہیں، دوڑتے پھرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس برسات سے اپنے اردگرد پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بھی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے علاوہ چڑیا، مینڈک، بکرے، گائیں وغیرہ غرض سب جاندار اس موسم سے اپنے اپنے انداز میں لطف اندوز ہو رہے ہیں اور اسی خوبصورت موسم میں بچوں کی کھانے کے معاملے میں فرمائشیں عروج پر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہر جاندار اس موسم کا مزا لیتا ہے۔

موسم کے سلسلے کی ایک اور نظم ''گرمی آئی'' بھی ہے۔

''گرمی آئی گرمی آئی　　کھانے کو کیا کیا پھل لائی
شہتوت اور شہ دانے آئے　　لوکاٹ اور آلوچے آئے''(۷۵)

گرمی کا موسم جہاں تپتا سورج اور جھلسا دینے والی لو لاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف یہ بے شمار پھلوں کا موسم ہوتا ہے۔ گرمی واحد موسم ہوتا ہے۔ جس میں بہت سارے ذائقوں اور قسموں کے پھل دستیاب ہوتے ہیں جیسے شہتوت، لوکاٹ، آلوچے، بیر، فالسے، تربوز، خربوزے، جامن، امرود، گرمے، آم، سردے، انگور وغیرہ۔ یوں اس نظم سے بچوں کو پھلوں کے بارے میں اور خصوصاً موسم گرما کے پھلوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات مل جائے گی۔ قیوم نظر نے پھلوں کا ذکر بڑے ہی نرالے اور بہترین انداز میں کیا ہے۔

جانوروں اور پرندوں سے بچوں کو خصوصی لگاؤ ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے جانور یا پرندے بچے پالتے بھی ہیں۔ کیونکہ بچے بھی معصوم ہوتے ہیں اور جانور بھی معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی آپس میں دوستی بے لوث ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بچوں کے لیے بہت سازی نئی چیزوں یا جانوروں کے بارے میں جاننا باعثِ دلچسپی ہوتا ہے۔ اسی بات کے مدنظر قیوم نظر نے کچھ نظمیں جانوروں اور پرندوں سے متعلق لکھی ہیں۔ جن کا یہاں باری باری ذکر کیا جائے گا۔

سب پہلے نظم ''جگنو'' ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اس ننھے لیکن بہترین شاہکار کا ذکر ہے۔

''گھاس میں چمکے　　جو تارا سا

اور پکڑیں تو ہاتھ نہ آئے
اگلے پل میں انگارا سا
چلتا تھا اُڑتا جائے''(۷۶)

جگنو ایک چھوٹا سا کیڑا ہے۔ لیکن اس کا چمکنا اس کے ہونے یا نہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ بے شک قدرت کے کارخانے میں کوئی بھی شے بے مقصد یا بے فائدہ نہیں ہے۔ کوئی شے نکمی نہیں ہے زمانے میں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں اسی طرح یہ چھوٹا چمکنے والا کیڑا بھی کسی نہ کسی مقصد کے تحت بنایا گیا ہے۔ لیکن بچے اس مخلوق کو دیکھ کر کچھ حیران ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے چھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہاتھ نہ آئے کی صورت حیران و پریشان ہو جاتے ہیں اور اسی حیرانی کو قیوم نظر نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

اگلی نظم ''ماں اور بچے'' ہے۔

''چار بلونگڑے بلی کے دو ہوں میمنے بکری کے
چھ پلے ہوں کتیا کے بوٹ ہوں تین بھی چڑیا کے

ایک بچھیرا گھوڑی کا ایک ہو بوتا اونٹنی کا
بھیڑ کا ایک ہی ہو پلا ایک ہی بچھڑا گائے کا

بارہ چوزے مرغی کے
یہ سب مل کے کتنے ہوئے؟''(۷۷)

یہ نظم بچوں کو سکھانے کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ بچے اسے پڑھ کر حساب سیکھ جائیں۔ عموماً بچو ں کے لیے سیدھے اور روکھے انداز میں سیکھنے سکھانے کا عمل مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح نہ تو وہ کچھ سیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی سیکھنے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اگر بچوں کے لیے سیکھنے کا عمل تھوڑا دلچسپ بنا دیں تو وہ اسے بہت سے شوق سے سیکھیں گے۔ جس طرح اس نظم میں جمع کے عمل کو سکھانے کے لیے مختلف جانوروں کے بچوں کا استعمال کیا ہے۔ جس سے نہ صرف جمع تفریق کا عمل سیکھ پائیں گے بلکہ ساتھ ہی مختلف جانوروں کے نام اور ان کے بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔

جانوروں میں وفادار جانور سے متعلق اگلی نظم ''ڈبو'' ہے۔

''بھورے کالے دھبوں والا
موٹا ڈبو ہم نے پالا

اِک دم اُٹھے بھونکے، بھاگے
موٹر سے پھر نکلے آگے''(۷۸)

پالتو جانوروں میں سب سے وفادار جانور کتا ہوتا ہے اور اکثر لوگ اپنے گھر کی حفاظت کے لیے انھیں اپنے گھروں میں پالتے ہیں اور یہ وفادار جانور اپنے مالک کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ یہ بے حد سمجھ دار جانور ہوتا ہے۔ بچے ایسے جانوروں سے خصوصی اُنسیت رکھتے ہیں ۔ وہ اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جاتے ہیں اور بلی جو کہ کتے سے خاص کر ڈرتی ہے۔ بچے اس ڈر سے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور ہر بچے کی یہی کوشش ہوتی ہے ہ اُس کا کتا بہت پیارا ہو اور دوسرے سب کتوں سے بہتر ہو اور سب اس سے ڈرتے ہوں۔ یوں یہ جانور گھر کی حفاظت کے ساتھ بچوں کا دوست بھی ہوتا ہے۔

اگلی نظم ''چوزے'' ہے جو زبان و بیان اور انداز کے لحاظ سے بہت پیاری ہے۔

''مرغی انڈے دیتی ہے انڈوں کو پھر سیتی ہے
بیس اور اِک دن جب گزریں انڈوں سے چوزے نکلیں
اُجلے اُجلے پیارے سے جیسے گالے روئی کے''(۷۹)

بچوں کے لیے ایسی چیزیں تجسس کا باعث ہوتی ہے اور وہ ہر نئی چیز یا شے کے بارے میں جاننا بھی چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے معصوم ذہن میں آنے والے بے شمار سوالات کے جوابات چاہتے ہیں۔ اس نظم میں بچوں کے انہی معصومانہ سوالات کے معصومانہ انداز میں جوابات دیے گئے ہیں کہ مرغی جو انڈے دیتی ہے۔ اُن پر پھر اکیس دن تک بیٹھی ہے۔ پھر اُن انڈوں میں سے مرغی کے بچے یعنی چوزے نکلتے ہیں اور یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے۔ پھر ان چوزوں کے خدوخال بیان کیے گئے ہیں کہ وہ کتنے چھوٹے چھوٹے سے ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے اُن کے پر، پنجے، آنکھیں اور چونچ بھی چھوٹی سی ہوتی ہیں۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی سکھایا ہے کہ کس طرح چوزے

اپنی ماں کی بات مانتے ہیں اور اُس کی ایک آواز پر وہ کس طرح اُس کے پاس بھاگے چلے آتے ہیں۔ بچوں کو اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر بچے کو چاہیے کہ وہ انسان کا ہو یا جانور کا اپنے بڑوں کا کہا ماننا پڑتا ہے اور یہ بڑے ہی ہیں جو انھیں دنیا میں رہنے کا یہی طریقہ اور سلیقہ سکھاتے ہیں۔ لٰہذا بڑوں کا کہا ماننے میں ہی اُن کی بھلائی ہے۔

جانوروں سے متعلق اگلی نظم ''چڑیا گھر دیکھا'' ہے۔

''مور چمکتے پَر والے
پنجرے شیر ببر والے　　اور موٹا بندر دیکھا
ہم نے چڑیا گھر دیکھا

دیکھا بارہ سنگا بھی
پاڑا اور چکاڑ بھی
چیتا بھی بڑھ کر دیکھا
ہم نے چڑیا گھر دیکھا''(۸۰)

ہم نے چڑیا گھر دیکھا بچوں کے حوالے سے بے حد معلوماتی نظم ہے۔ بچوں کو ویسے بھی چڑیا گھر جانے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ چڑیا گھر وہ جگہ ہوتی ہے جہاں انھیں ہر طرح کے جانور دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یوں جانوروں کو اس قدر قریب سے دیکھنا اُن کے لیے نہ صرف انوکھا تجربہ ہوتا ہے بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ پسند بھی کرتے ہیں۔ جس طرح اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ چڑیا گھر میں ہر طرح کے جانور اور چرند پرند ہوتے ہیں۔ جیسے مور، سرخاب، مرغ، طوطے، بطخیں، شیر، ہرن، بارہ سنگا، پاڑا؟ چکارا، ریچھ، بندر وغیرہ۔ یوں بچے ہر جانور کے بارے میں ہر طرح کی معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد وہ مختلف جانوروں کی خود سے پہچان کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

اگلی نظم ''چڑیاں'' ہے۔

''اِک اِک کرکے آتی ہیں　　پُھر کرکے اُڑ جاتی ہیں
خود ہی پھر آ جاتی ہیں　　یوں ہی جاتی آتی ہیں

کتنی اچھی ہیں چڑیاں

مجھ کو پیاری ہیں چڑیاں''(۸۱)

ویسے تو اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ہی خوبصورت ہے۔ لیکن چڑیاں بہت ہی معصوم اور پیاری تخلیق ہے اور یہ سب کو ہی اچھی لگتی ہیں۔ چڑیاں ایسا پرندہ ہیں جو تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ ان کی حرکتیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ادھر سے اُدھر پھدکتی رہتی ہیں۔ بے حد شور مچاتی ہیں اور اگر گھر کے افراد انھیں دانہ دنکا ڈالنے لگ جائیں تو یہ جلد ہی اُن سے بھی مانوس ہو جاتی ہیں اور خصوصاً بچے انھیں ضرور دانہ اور پانی ڈالتے ہیں او ران کی معصوم حرکتوں پر خوش ہوتے ہیں۔

اسی سلسلے کی اگلی نظم ''گلہری'' ہے۔

''نہ مارو بچاری گلہری کے پتھر
اسی خوف سے تو وہ بیٹھی ہے چھپ کر
یہ چوہے سے کچھ ہی بڑی قد میں ہوگی
وہی ناک نقشہ وہی لمبی دُم بھی
مگر اس کی دُم پر بہت بال ہوں گے''(۸۲)

گلہری درختوں پر رہنے والا جانور ہے۔ زمین پر یہ بہت کم نظر آتی ہے اور بچے اکثر درخت پر موجود جانوروں یا پرندوں کو پتھر مارتے ہیں تا کہ وہ نیچے آ جائے۔ اس نظم میں اس بات سے منع کیا جا رہا ہے کہ یوں جانوروں کو پتھر مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے جانوروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ساتھ ہی قیوم نظر نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں گلہری کے تمام ظاہر کا خدو خال بتا دیے ہیں تا کہ بچے اس نظم کو پڑھ کر گلہری کو آسانی سے پہچان سکیں۔

جانوروں سے متعلق اگلی نظم ''بلی کے بچے'' ہے۔

''لکڑی کی الماری میں جس کو ہم نہ کبھی کھولیں
جس کو الگ ہی رکھا ہے جس کا اِک در ٹوٹا ہے
جس میں گھر کا گوڈر ہے جس میں ہر شے گڑبڑ ہے

اس میں بلی کالی نے نیلی آنکھوں والی نے
دے رکھے ہیں بچے چار ننھے ننھے اور ہشیار'' (۸۳)

انسانوں کی طرح جانور بھی اپنے لیے گھر بناتے ہیں کہ جہاں وہ آزادی سے رہ اور گھوم پھر سکیں۔ بلی ایسا جانور ہے جو گھروں کے ناکارہ کونوں کھدروں میں رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اکثر گھروں کی ٹوٹی الماریاں جو کہ گھر کے کسی بڑے کمرے یا چھت کے کسی کونے میں ہوں۔ یہ بلی وہاں پائی جائے گی۔ جہاں ان کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ اس نظم میں بھی ایسے ہی بلی کا ذکر ہے کہ جس نے ناکارہ الماری میں بچے دیے ہیں جو کہ تعداد میں چار ہیں۔ اب چونکہ وہ بچے ہیں۔ اسی لیے اُن کی حرکات بھی بچوں جیسی معصوم اور پیاری ہیں اور ان بلی کے بچوں کی حرکتیں دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں اور ویسے بھی ایسے جانور بچوں کو بے حد پسند آتے ہیں۔ لہٰذا اس میں یہ ہے کہ ایک تو گھر کے ایسے ناکارہ حصوں یا چیزوں کو دیکھتے رہیں اور اگر کہیں کوئی بلی ہے جس نے اس میں بچے دے رکھے ہیں تو اُن کا خاص خیال رکھیں اور انھیں تنگ کرنے کی بالکل کوشش نہ کریں۔

پرندوں سے متعلق اگلی نظم ''دو طوطے'' ہے۔

''طوطا ہے اِک پیڑ پہ بیٹھا جس کی گردن میں ہے کنٹھا
اِس ٹہنی سے اُس ٹہنی پر جاتا ہے وہ لٹک لٹک کر'' (۸۴)

آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی قدر صحیح معنوں میں اُسی کو ہوتی ہے جس کو غلامی کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ آزادی جیسی اس نعمت اور حقیقت کو قیوم نظر نے دو طوطے کے نام سے اس نظم میں بڑی آسانی سے بیان کر دیا ہے۔ ایک طوطا وہ ہے جو کہ درخت پہ بیٹھا ہے جس طرف جاتا ہے وہ اُڑتا پھرتا ہے۔ جب چاہتا ہے، بیٹھا رہتا ہے جو پھل چاہتا ہے کھاتا ہے۔ لہٰذا وہ آزاد اور اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جبکہ دوسری طرف پنجرے میں قید طوطا غلامی کی زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے جس میں وہ ایک کھونٹے سے لٹکے پنجرے میں قید ہے۔ بے شک اس پنجرے میں بھی اُسے کھانے پینے کی ہر شے میسر ہے۔ لیکن وہ کہیں بھی اپنی مرضی سے آ جا نہیں سکتا۔ زندگی تو یہ بھی گزار رہا ہے لیکن اس میں اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں چلتی۔ بلکہ وہ اس قید میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ لہٰذا ہمیں اس نظم سے سبق لینا چاہیے اور آزادی کی قدر کرنی چاہیے۔

''تتلی پھول پہ بیٹھے گی اس کی خوش بو سونگھے گی
پھر وہ پروں کو جوڑے گی اور اُڑ جانا چاہے گی'' (۸۵)

تتلی کہنے کو تو ایک نازک سا کیڑا ہے۔ لیکن اللہ پاک نے اس میں اس قدر رنگ اور خوبصورتی بھر دی ہے کہ یہ ہر ایک کو بہت پیاری لگتی ہے۔ یہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ ادھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی ہیں۔ اپنے پروں کو پھیلاتی اور بند کرتی ہیں۔ ان کی ہر ہر ادا خوبصورت لگتی ہے اور انسان اللہ کی قدرت دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ اُس ذات نے اتنے چھوٹے چھوٹے پروں میں اتنے رنگ دیے ہیں۔ اتنے خوبصورت نقش و نگار دیے ہیں کہ انسان اللہ کی اس قدرت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تتلیوں کے ساتھ کھیلنا، ان کو پکڑنا، ان کے پیچھے بھاگنا بچوں کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ بچوں کو بھی یہ بے حد پیاری لگتی ہیں اور بچے باغوں میں جانا اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اُنھیں وہاں ڈھیر ساری تتلیوں کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔

اگلی نظم ''چڑیا کا گھونسلا'' ہے۔

''چڑیا نے جو گھونسلا بنایا — تنکوں سے پروں سے سجایا
چھوٹے موٹے ہزاروں تنکے — اِک اِک کرکے اُٹھائے اُس نے
جوڑا انھیں پھر طرح طرح سے — اوپر کوئی رکھا، کوئی نیچے
ٹیڑھا، سیدھا اُٹھا کے رکھا — ہر تنکا جما جما کے رکھا''(۸۶)

انسان ہو یا جانور یا کوئی بھی جاندار ہو۔ اُسے رہنے کے لیے گھر کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ گھر وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے بناتا ہے۔ اسی طرح چڑیا اپنا گھونسلا بڑی محنت سے بناتی ہے۔ جس کے لیے وہ نہ جانے کہاں کہاں سے تنکے، گھاس پھوس، روئی، کترن وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی ہے اور پھر ایک کے اوپر دوسرا رکھ کر۔ کچھ سیدھے اور کچھ ترچھے تنکے رکھ کر وہ بہت ہی مضبوط گھونسلا تیار کرتی ہے۔ ایسا گھونسلا جس میں وہ آزادی سے رہتی ہے۔ جہاں وہ انڈے دیتی ہے۔ اپنے بچوں کو پالتی ہے۔ یوں گھر ہر جاندار کی اہم ترین ضرورت ہے اور بچوں کو بھی اس نظم کے پڑھنے کے بعد احساس ہوگا کہ چڑیا جیسی نازک سا پرندہ کس قدر و قیمت سے اپنا گھونسلا تیار کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہو۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس پر قناعت اور صبر کرنا چاہیے۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے اور اس کی عادت کو اپنا کر انسان خوش بھی رہتا ہے۔ ورنہ زیادہ پانے کی چاہت اُسے کہیں سکون نہیں لینے دیتی۔

اگلی نظم جو جانوروں کے اس سلسلے کی آخری نظم ہے وہ ''میری بلی'' ہے۔

"وہ اس کی مونچھیں بڑی بڑی سی چمکتی آنکھوں میں پھلجڑی سی
وہ لیٹے لیٹے نہ ہلنے والی وہ میری بلی کدھر گئی؟
وہ اُس کے ناخن مڑے ہوئے سے بہت ہی تیز اور چھپے ہوئے سے
زمین پہ پنجہ پٹکنے والی وہ میری بلی کدھر گئی ہے؟"(۸۷)

بچوں کو اپنے سے وابستہ چیزوں سے بے حد محبت اور لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو بروقت اپنے آس پاس دیکھنا چاہتے ہیں اور اُن سے تھوڑی دیر کی بھی دوری یا فاصلہ اُنھیں پریشان کر دیتا ہے اور پھر وہ اُس چیز کو ڈھونڈنے میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی بلی کو کھو جانے کے بعد تلاش کیا جا رہا ہے اور اس تلاش میں سب سے خوبصورت چیز بلی کے متعلق ہونے والی باتیں ہیں۔ یعنی بلی کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ اس کی عادات کے بارے میں بھی بتایا جا رہا ہے کہ وہ کس طرح کی تھی تا کہ اگر کسی کو بھی وہ بلی ملے تو وہ اُسے کسی نہ کسی بات یا خدوخال سے پہچان سکے۔ قیوم نظر بچوں کی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا اس نظم کا لہجہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ اپنی کھوئی بلی کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ ساتھ ہی بہت سے ایسے الفاظ کا استعمال ہے جو بچوں کے لیے بالکل نئے ہیں۔ جسے پھلجڑی، ٹپکنا، سرکنا، اٹکنا، خُرخُر وغیرہ۔ لہٰذا بچوں کو املا کے حوالے سے بھی بہت سے نئے الفاظ سیکھنے کو ملیں گے۔

بچہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اُس کے لیے اس اردگرد ہر شے نئی ہوتی ہے۔ وہ بہت سے نئے تجربات کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ دنیا کی حقیقتوں کو سمجھنا شروع کرتا ہے۔ اپنے سے منسوب رشتوں کی پہچان کرنا شروع کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ماحول سے مانوس ہونے لگتا ہے۔ ہر گزرتا وقت اپنے ساتھ بہت ساری نئی ایجادات لے کر آتا ہے۔ جب انسان سے شروع میں زمین پہ قدم رکھا تو وہ پتھروں کا دور تھا پھر اُس دور سے ہوتے ہوئے بہت سے نئے اور جدید ادوار سے گزرتا رہا اور آج اس ترقی کے دور تک پہنچ گیا۔ کیونکہ ہر نیا آنے والا دور اور زمانہ پچھلے زمانے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے انسان کی ضروریات بڑھتی گئیں۔ ویسے ویسے ایجادات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کچھ ایسی ہی ایجادات کا ذکر یہاں کچھ نظموں میں ہو رہا ہے جس میں "آئینہ"، "ٹی وی"، "نئی کتاب"، "جھولا"، "تانگا"، "اخبار" شامل ہیں اور ان کا ایک ایک کر کے یہاں جائزہ لیا جائے گا۔

سب سے پہلی نظم ''آئینہ'' ہے۔

''روتا ہو یا ہنستا چہرہ
جیسا بھی ہو ناک اور نقشہ
ڈبلا پتلا موٹا ، بھدا
گورا کالا کانا ، گنجا
سب کچھ اُس کے منہ پر کہنا
آئینے کا شیوہ دیکھا''(۸۸)

اس دنیا میں آئینہ وہ واحد شے ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور جو انسان جیسا بھی ہو، آئینہ اُسے اُس کا اصل چہرہ دکھاتا ہے۔ خواہ اس انسان کو اچھا لگے یا بُرا لگے۔ آئینہ حقیقت ہی دکھاتا ہے۔ یعنی انسان کی اصلی صورت اور حقیقت سامنے لاتا ہے۔ انسان نے بھی اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کی یہ عادت آئینے سے ہی سیکھی ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان بُرا ہے تو اُسے اُس اُس کے سامنے ہی بُرا کہیں اور ہمیشہ سچ بولیں۔ جھوٹ کا سہارا کبھی مت لیں ۔ کیونکہ پھر ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور یہی تعلیم ہمارا مذہب بھی دیتا ہے کہ کسی کی پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائی، غیبت یا چغلی نہ کریں ، اسے بہت بڑا گناہ مانا جاتا ہے اور نہ ہی اسلام جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ ہمیشہ سچ پر قائم رہیں اور اپنی حدوں میں رہیں جو حدیں ہمیں ہمارے مذہب نے بتادی ہیں۔ اس لحاظ سے آئینہ بے حد سچا ہے اور ہمیں بھی آئینے سے ایسی سچائی سیکھ لینی چاہیے۔

اگلی نظم ''ٹی وی'' ہے جو کہ ایک بہت بہترین ایجاد بھی ہے۔

''لکڑی کا ہے اِک ڈبا سا
اک طرف ہے اِک شیشہ سا
اُبھرا اُبھرا چمکیلا سا''(۸۹)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور انسان کی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ویسے ویسے بہت ساری نئی نئی ایجادات ہوتی رہیں اور ہر گزرتے وقت کے ساتھ ان ایجادات میں مزید ترقی اور بہتری آتی گئی۔ سب سے پہلے ریڈیو ایجاد ہوا جس میں ہر طرح کی آوازیں ہر طرف سنائی دیتی تھیں۔ پھر ریڈیو

کے بعد ٹی وی ایجاد ہوا۔ جو ٹی وی سب سے پہلے ایجاد ہوا وہ بلیک اینڈ وائٹ (Black and White) تھا۔ پھر وقت کے ساتھ اس نے بھی ترقی کی اور رنگین ٹی وی کا دور آ گیا۔ پہلے پہل ٹی وی لکڑی کا ایک ڈبہ سا تھا۔ جس کے ایک طرف اُبھرا ہوا شیشہ تھا۔ جسے سکرین کہا جاتا ہے۔ اب بچوں کے لیے یہ بہت دلچسپ شے ہے کہ ایک ڈبہ ہے۔ جس میں آپ دنیا کی ہر شے رنگوں سمیت دیکھ سکتے ہو۔ اس میں ہم جیسے ہی انسان نظر آتے ہیں جو باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے اردگرد ہونے والی ہر شے اس ٹی وی میں بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔ خواہ وہ سڑکیں ہوں، گاڑیاں ہوں، موسم ہوں، یا ملک کا جھنڈا ہو۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی دکھایا جاتا ہے۔ اس پر ڈرامے، گانے، فلمیں سب دیکھے جا سکتے ہیں۔ لٰہذا یہ رنگین ڈبہ ایک بہت بڑی رنگین دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ جسے بچے بڑے سب بہت پسند کرتے ہیں۔

اگلی نظم ''نئی کتاب'' ہے جو کہ بچوں کو کتاب کی اہمیت بتانے کے حوالے سے بہت بہترین نظم ہے۔

''آپ نے جو دیکھی تھی وہ کتاب میری تھی
میں نے خود دیے تھے دام اور نئی خریدی تھی
میں سنبھال کر رکھوں جب کتاب کو پڑھ لوں
پھر اسے ردی کہہ کے پھینک دوں نہ میں بیچوں''(۹۰)

کتاب پڑھنا بہت اچھی عادت ہے اور اگر بچوں میں شروع سے کتاب بینی کی عادت ڈال دی جائے تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کتاب بینی کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب بچوں اور بڑوں کے پاس وقت گزاری کے لیے اور بہت سی مصروفیات ہیں۔ لٰہذا اب کتابوں کے شوقین افراد میں کمی آتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب سب کا زیادہ تر وقت ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل اور انٹرنیٹ کی تیز ترین دنیا کی نظر ہو جاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ہر دور میں ایک طبقہ ایسا گزرا ہے جو کتابیں پڑھنے کا شوقین رہا ہے۔ اس نظم میں بھی بچوں میں کتاب بینی کی عادت پروان چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اپنے جیب خرچ سے کتابیں خریدیں۔ پھر اُنھیں پڑھیں اور پڑھ لینے کے بعد انھیں ردی میں ہرگز نہ دیں بلکہ کتاب کو ہمیشہ سنبھال کر سکیں اور ساتھ ہی دوسری سب سے ضروری بات یہ بھی کہ جو کچھ کتاب سے پڑھیں اس پر عمل بھی کریں۔ کیونکہ بے عمل، علم بے کار ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کو حاصل کریں اور ساتھ ہی اسے دوسروں

تک پہنچائیں تا کہ اس خزانے میں اضافہ ہوتا رہے۔ بچوں کو شروع سے ہی ایسی اہم باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔

اگلی نظم ''جھولا'' ہے۔

''پہلے ہولے ہولے جھولوں
کپڑے پُھولیں، میں بھی پُھولوں
پھر میں لٹک کر اُس کو چُھولوں
مجھے جو چُھونے آئے
کون مجھے جُھلائے''(۹۱)

بچوں کو شروع سے ہی جُھولوں سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے۔ باغوں یا میلوں میں جانے کو وہ اسی لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں انھیں طرح طرح کے جھولے دیکھنے اور جُھولنے کا موقع مل جائے گا۔ اکثر بچوں کے پاس شوق کو دیکھتے ہوئے گھر والے گھروں میں ہی چھوٹے جھولوں کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اس نظم میں جھولا لیتے وقت بچے کو جو خوشی اور سرور ملتا ہے ۔اُسی کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا جا رہا ہے کہ جھولا جب ہلکا ہوتا ہے تو کپڑوں میں ہوا بھر جاتی ہے اور وہ پھولنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ جھولا تیز ہوتا جاتا ہے اور اب بچہ زیادہ اونچائی سے ہر شے دیکھ سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ جھولا جھلانا بھی ایک کام ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری بڑے بخوبی نبھاتے ہیں اور یوں بچے خوشی خوشی جھولتے اور گاتے ہیں۔

اگلی نظم ''تانگا'' ہے۔

''گھوڑے کی چھاتی ہلتی ہے ساتھ ہی گردن بھی ہلتی ہے
دُم ہلتی ہے ، سر ہلتا ہے انجر پنجر سب ہلتا ہے
اور تانگا چلتا جاتا ہے
تانگے کے دو ہی پہیے ہیں دونوں ہی کھڑ کھڑ کرتے ہیں
دونوں ہی چکر کھاتے ہیں یوں آگے بڑھتے جاتے ہیں
اور تانگا چلتا جاتا ہے''(۹۲)

ہر زمانے اور دور کے لحاظ سے اُس وقت کی سواریاں ہوتی تھیں۔ پہلے پہل تانگے اور گڈے چلتے تھے۔ پھر جوں جوں وقت نے ترقی کی تو سائیکل، موٹر سائیکل، گاڑیاں، رکشے، ٹرک، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز وغیرہ جیسی ایجادات ہوئیں۔ تانگا بہت لمبے عرصے تک سواری کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ بلکہ آج بھی کچھ علاقوں میں تانگے چلتے ہیں۔ تانگے کے آگے گھوڑا ہوتا ہے جو اسے کھینچتا ہے اور اس میں گھوڑے کی بے پناہ طاقت اور قوت استعمال ہوتی ہے۔ تانگے کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ اس میں دو سیٹیں یا نشستیں ہوتی ہیں۔ حالانکہ اب زمانے کے کافی ترقی کر لی ہے۔ پھر بھی تانگا آج بھی ایک محفوظ اور مزے کی سواری ہے اور خاص طور پر بچے ایسی سواریوں سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اگلی نظم ''اخبار'' ہے۔

''اخبار والا اخبار لایا
جس میں خزانہ خبروں کا پایا
کل کیا ہوا تھا کس نے کہا کیا
کس رہ نما کا دورہ ہوا کی
کھیلوں میں کس کا نمبر رہا کی''(۹۳)

آج دنیا میں خبریں پہنچانے کے دو اہم ذرائع ہیں۔ ایک سوشل میڈیا اور دوسرا پرنٹ میڈیا ہے۔ سوشل میڈیا میں ٹی وی، انٹرنیٹ یہ سب آجاتے ہیں۔ جبکہ پرنٹ میڈیا میں اخبار، رسالے، جرنلز وغیرہ آتے ہیں۔ یہ اخبار یا رسالے، روزنامے، ہفت نامے اور ماہ نامے ہوتے ہیں۔ جن میں مختلف علاقوں، شہروں، ملکوں سے متعلق خبریں چھاپی جاتی ہیں۔ یعنی کہ ہر طرح کی خبریں ہمیں اخبار میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ساتھ ہی بے شمار اشتہارات بھی ان اخباروں میں پڑھے اور دیکھے جا سکتے ہیں۔ کل ملکی حالات کیا تھے۔ کون سا سفیر یا رہ نما کس ملک کے دورے پر گیا یا آیا ہے؟ کس نے سچ بولا؟ کس نے جھوٹ؟ کہاں کہاں واردات اور حادثات ہوئے؟ کہاں چور پکڑے گئے؟ کہاں نامعلوم افراد کے خلاف مقدمات درج ہوئے؟ کس ملک نے دوسرے ملک پر بم گرا کر جنگ کا آغاز کیا۔ کرایوں میں اضافہ کب اور کیوں ہوا؟ سونے کے دام کیا ہیں؟ کس ملک کی کرنسی کے کیا ریٹ رہے؟ کس ملک کی تجارت بڑھی او رکس کی کم ہوئی۔ کسی ملک پر تجارتی پابندیاں لگ گئیں۔ کھیلوں میں کون سی ٹیم او

رکھلاڑی اول رہے۔ یعنی زندگی کے ہر ہر پہلو پر ان اخبارات کی نظر ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام حالات و وقعات ان کے اخبارات میں موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا گھر میں بیٹھے ہوئے اس ایک اخبار کے ذریعے حالات حاضرہ سے بھر پور واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ بچوں کو بھی شروع سے ہی اخبار اور رسالے پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس سے ایک تو اُن کی املا اور زبان درست ہوگی۔ دوسرے وہ بھی دنیا کی خبر اور سمجھ رکھ سکیں گے۔

☆......☆......☆

بچوں کا لاہور

بچوں کی نظموں کے مجموعے ''گلگلے'' اور ''آلوچے'' میں ننھے منے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ''بلبلے'' میں ابتدائی دور سے آگے کی عمر کے بچوں کے لیے نظمیں تحریر کی گئی ہیں۔ بچوں کے ہر دور کی ضروریات اور پسند و ناپسند میں فرق ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گزرتے وقت کے ساتھ بچوں میں تبدیلی آ جاتی ہے اور بچے کو اس کی عمر کے لحاظ سے ہی ادبی مواد فراہم کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ بچوں کے سیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ لہٰذا اچھا اور عمدہ ادبی مواد فراہم کر کے ہم بچوں کی درست سمت میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جبکہ گھٹیا مواد کی فراہمی بچوں کو بگاڑ سکتی ہے۔

قیوم نظر کے مجموعے ''بچوں کا لاہور'' میں اس عمر کے بچوں کے لیے نظمیں ہیں۔ جنھوں نے شعور اور حقیقت کی وادی میں ابھی نیا نیا قدم رکھا ہوتا ہے اور اب وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھنا شروع کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اب تخیل کی دنیا سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا میں آ چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسی بات اور بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر قیوم نظر نے ''بچوں کا لاہور'' میں لاہور کی اہم تاریخی عمارتوں اور مشہور جگہوں کو نظموں کی صورت میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ جن کو پڑھ کر بچے نہ صرف لاہور شہر کی تاریخی اہمیت کے بارے میں جان سکیں گے بلکہ ان نظموں کو پڑھنے کے بعد وہ خود جا کر ان عمارات اور جگہوں کو بھی بھی ضرور دیکھنے کی خواہش کریں گے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی نظم ''ریلوے سٹیشن'' ہے۔ ریلوے سٹیشن پوری ثقافت رکھتا ہے۔ جس کی اپنی جزئیات ہیں۔ جس کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ریلوے سٹیشن کا قیام یوں تو نوآبادیاتی عہد میں عمل میں آیا۔ انگریز نے ہندوستان کا خام مال برطانیہ لے جانے کے لیے ریل کا جال پھیلایا۔ لیکن بالواسطہ اس سے مقامی افراد کو

بھی فائدہ پہنچا۔ یوں ریلوے سٹیشن جہاں سفر کی سہولت فراہم کرتا ہے، وہاں تاریخ کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔

"باہر سے جیسے قلعہ اندر لگا ہے میلہ
ڈیوڑھی ہے صاف ستھری اونچی بھی اور کھلی بھی
لوہے کے کھمبے کھڑے ہیں زینے بڑے بڑے ہیں
ملتی یہیں ہیں ٹکٹیں
پہلے جنہیں خریدیں" (۹۴)

ریل گاڑی ذرائع آمدورفت کے لیے استعمال ہونے والی کارآمد سواری ہے اور انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ریل گاڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم مال گاڑی ہے۔ اس پر سامان کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جاتا ہے۔ ریلوے سٹیشن ایک بہت بڑی عمارت ہوتی ہے جو باہر سے دیکھنے میں قلعہ نما ہی لگتی ہے جس کی بھرپور عکاسی اس نظم میں کی گئی ہے کہ اس عمارت میں میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ریل گاڑی پر سفر کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ایک تو یہ سفر گاڑی کی نسبت سستا پڑتا ہے۔ دوسرا دوردراز شہروں میں جانے کے لیے ریل گاڑی ایک آرام دہ سواری بھی ہے۔ ریل پر سفر کرنے کے لیے سب سے پہلے ٹکٹ خریدنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر وہاں بہت سارے قلی ہوتے ہیں جو کہ آپ کا بھاری بھرکم سامان اُٹھانے میں آپ کی مدد کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں اُجرت لیتے ہیں اور اکثر اس اُجرت کے لین دین پر جھگڑے اور بحث وتکرار بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی طرح ریلوے سٹیشن پر موجود بے شمار سٹال پر سفری ضرورتوں سے متعلق ہر طرح کی اشیاء مل جاتی ہیں اور کھانے پینے کی بھی بے شمار اشیاء ان سٹالز پر دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن یوں باہر کا کھانا کھانا صحت کے لیے بے حد نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ایسے کھانے پر ہر طرح کے جراثیم ہوتے ہیں جو کہ بیمار کر سکتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن پر ہر وقت گاڑیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں اور مسافروں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ یوں یہاں پر رونق کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب ریل گاڑیوں نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ اب نہ صرف ان کی رفتار میں اضافہ ہوگیا ہے بلکہ یہ پہلے سے زیادہ جدید اور آرامدہ ہوگئی ہیں اور سفر بھی تیز رفتاری سے طے کرتی ہیں۔

لاہور کی تاریخی عمارات کے سلسلے کی دوسری نظم "دروازے" ہے۔

''ماضی کے وہ کیا دن تھے ہر صبح کو جب کھلتے

اور شام تلک رہتے پھر بند بھی ہو جاتے

لاہور کے دروازے''(۹۵)

''یہ شہر دارالحکومت و دارالسلطنت ملک پنجاب کا ہے۔ دریائے راوی کے بائیں کنارے پر بفاصلہ دو میل آباد ہے۔ صد ہا سال سے یہی شہر خطہ پنجاب کا حاکم نشین اور صوبہ کا مقام رہا ہے۔ کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اگرچہ شاہان چغتائی کی عمل داری سے پہلے پنجاب کا دارالحکومت دیپالپور تھا اور سلاطین تغلیہ و خلجیہ و لودیہ وغیرہ کے عہد میں بھی دیپالپور ہی دارالحکومت تصور کیا جاتا تھا مگر بابر و ہمایونی عہد میں شہر لاہور ہی دارالسلطنت قرار پایا اور حاکم نشین ہونے کے سبب رونق اس کی روز بروز بڑھتی گئی۔''(۹۶)

لاہور شہر کے تیرہ تاریخی دروازے تھے جو دن چڑھتے ہی کھل جاتے تھے اور شام ڈھلتے ہی بند کر دیے جاتے تھے۔ قیوم نظر نے بڑے ہی نرالے اور خوبصورت انداز میں نہ صرف ان تمام دروازوں کے نام گنوا دیے ہیں بلکہ ان کی موجودہ صورت حال بھی بیان کر دی ہے۔

''اس شہر کے بارہ دروازے اور ایک چھوٹا دروازہ ہے جس کو موری دروازہ کہتے ہیں۔''(۹۷)

اوّل دہلی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ مشرق کی سمت گویا شہر دہلی کی طرف ہے۔ اس لیے اس کو دہلی دروازہ کہتے ہیں۔ لاہور کے نامی دروازوں میں سے یہ دروازہ ہے اور آمدورفت لوگوں کی بکثرت ہے۔ کیونکہ اس دروازے کے باہر سٹیشن ریلوے بنایا گیا ہے اور اسی سمت کو بڑے بڑے شہر امرتسر و جالندھر وغیرہ ہیں۔ ریل پر سوار ہونے والے مسافر اور سب اسی دروازے سے نکلتے ہیں اور جو باہر سے آتے ہیں اسی سے داخل شہر ہوتے ہیں۔ اسی دروازے کے اندر سے سیدھی سڑک قلعہ کو جاتی ہے۔

دوم اکبری دروازہ ہے۔ اس دروازے کو بادشاہ وقت محمد جلال الدین اکبر نے اپنے نام سے موسوم کیا اور ہر قسم کے غلہ کی منڈی اس دروازے کے اندر مقرر فرما کر اُس کو بھی اکبری منڈی کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ اب تک دروازہ اور منڈی دونوں اکبر کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ دروازہ بھی خستہ و بوسیدہ ہو چکا تھا اور سرکارِ انگریزی کے عہد میں قدیمی قطع پر از سرنو بنایا گیا۔

تیسرا موتی دروازہ المعروف موچی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ موتی رام جمعدار ملازم اکبری کے نام سے موسوم ہے جو تمام عمر اس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا تھا۔ مدت العمر کی ملازمت کے سبب اس دروازے نے بھی موتی کے ساتھ پوری نسبت پیدا کر لی اور ہمیشہ کے لیے موتی بنگیا سکھی عہد میں موتی کے نام سے بدل کر موچی مشہور ہوا۔ اب بھی موچی دروازہ مشہور ہے۔

چوتھا شاہ عالمی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ شاہ عالم بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا۔ چند دنوں میں بادشاہ لاہور میں آیا تو چاہا کہ اکبر بادشاہ کی طرح ایک دروازہ اس شہر کا اپنے نام سے موسوم کرے اور اپنی رونق افزاء ہونے کی یادگار لاہور میں چھوڑ جائے ۔ اُس نے یہ تجویز قائم کر کے منادی کرا دی کہ آئندہ یہ دروازہ شاہ عالمی پکارا جائے۔ چنانچہ اُس روز سے آج تک شاہ عالمی دروازہ کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ بھی انگریز عہد میں دوبارہ پہلے دروازے کی قطع پر تعمیر ہو چکا ہے۔

پانچواں لوہاری دروازہ ہے۔ اصلی نام اس کا لاہوری دروازہ ہے۔ غلط العام لُہاری دروازہ مشہور ہے۔ اس دروازے کو خاص لاہور کا دروازہ تصور کرنا چاہیے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ راجہ جیپال کو لاہور سے بے دخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کرے تو راجہ جیپال چند ماہ تک اس شہر میں محصور ہو کر لڑتا رہا۔ آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگا دی رعایا کو قتل کیا۔ جس سے شہر بالکل ویران و برباد ہوگیا۔ چند سال یہ شہر غیر آباد رہا۔ آخر جب ملک ایاز پنجاب کے انتظام کے لیے نامور ہوا تو اُس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا۔ سب سے اوّل آبادی شہر کی اسی محلہ سے شروع ہوئی۔ جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے اوّل یہی دروازہ تعمیر ہوا جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا۔

چھٹا موری دروازہ ہے۔ یہ چھوٹا سا دروازہ لوہاری اور بھاٹی کے درمیان فصیل کے برج کے گوشہ میں بنا ہوا تھا۔ قدیمی دروازہ تو بہت چھوٹا تھا۔ جس میں سے سوار کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سرکارِ انگریزی کے وقت یہ دروازہ کشادہ کر دیا گیا جس سے یہ صورت دروازہ کی بن گئی اور اس لائق ہو گیا کہ گاڑی ، اونٹ، گھوڑا اُس سے بخوبی گزر جائے۔

ساتواں بھاٹی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ بھاٹ کی قوم سے منسوب ہے۔ جو بعد آبادی ایاد کے اس دروازہ کے اندر یکجا آباد ہوئے تھے اور صدہا سال آباد رہے۔ اس واسطے یہ دروازہ اُن کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اگرچہ

اس محلّہ میں کوئی بھاٹ قیام پذیر نہیں ہے۔ مگر نام قدم بھاٹ کا اب تک لیا جاتا ہے۔ کیونکہ بوقت آبادی انھوں نے حاکم کے ساتھ شرط کر لی تھی کہ ہم اس شرط پر اپنا محلّہ اس موقع پر کرتے ہیں کہ دروازہ ہمارے نام سے موسوم ہو۔ چنانچہ حاکم نے منظور کر کے یہ دروازہ اُن کے نام سے موسوم کر دیا۔

آٹھواں ٹکسالی دروازہ ہے۔ شہر لاہور کی غربی فصیل میں صرف یہی دروازہ ہے۔ جس کو ٹکسالی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ شاہان سلف کے عہد میں اس دروازے کے اندرونی شمالی میدان میں دارالغرب شاہی ایک عالیشان مکان بنا ہوا تھا اور اسی جگہ ہر ایک کا سکہ مسکوک وصفروب ہوتا تھا۔ اس ٹکسال کے سبب سے ان کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوا۔

نواں روشنائی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ بادشاہی مسجد اور قلعہ لاہور کے درمیان ہے۔ چونکہ یہ سبب مسجد شاہی اور دروازہ غربی قلعہ لاہور کے آمدورفت ملا زمان شاہی اس دروازہ کے اندرونی میدان اور باہر روزمرہ بادشاہی حکم سے روشنی ہوا کرتی تھی۔ اس سبب سے یہ دروازہ روشنائی دروازہ کہلاتا تھا اور اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔ یہ دروازہ اصل میں قلعہ کا دروازہ ہے مگر بسبب اس کے کہ قلعہ کی غربی دیوار کے باہر اور فصیل شہر کی دیوار کے اندر ہے۔ شہر کا دروازہ گنا جاتا ہے۔

دسواں مستی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ بھی ایک شاہی ملازم کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا نام مستی بلوچ تھا اور اس کی حفاظت بادشاہ کے حکم سے اس کے سپرد تھی اور مدت العمر اسی خدمت پر مامور رہا۔ اس کی قدامت اور نیکوکار خدمتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ شاہی حکم سے یہ دروازہ اُس کے نام سے ہمنام کیا گیا تاکہ اُس کا نام تاقیام دروازہ زندہ رہے۔ یہ پُرانا دروازہ بحکم حکام انگریز گرایا گیا اور مختصر پھاٹک اُس کی جگہ بنایا گیا۔

گیارھواں کشمیری دروازہ ہے۔ یہ دروازہ کشمیریوں کے نام سے منسوب ہے۔ اس لیے کہ رُخ اس دروازے کا کشمیر کی سمت ہے۔ جیسے کہ دہلی دروازہ دہلی کی سمت ہونے کی وجہ سے دہلی دروازہ کہلاتا ہے۔ یا یہ سبب ہوگا کہ بوقت آبادی شہر کے جس طرح کہ بھاٹی دروازے کے پاس بھاٹ قیام پذیر تھے۔ اس جگہ کشمیریوں کو آباد کیا گیا ہو۔ یہ دروازہ بھی نہایت بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ سرکاری انگریزی نے انگریزی کی وضع اور دروازہ بھاٹی کی قطع پر اب بنوایا ہے۔

بارھواں خضری دروازہ ہے۔ وجہ تسمیہ اس دروازہ کا یہ ہے کہ زمانہ سلف میں دریائے راوی شہر کے بہت

نزدیک بہتا تھا۔ خصوصاً اس دروازے کے آگے تو کشتی پڑتی تھی۔ چونکہ خواجہ خضر کو دریاؤں کے ساتھ کمال نسبت ہے۔ سبب قربِ دریا کے اس دروازہ کا نام خضری دروازہ رکھا گیا۔ مگر اب لوگ اس کو شیراں والا دروازہ کہتے ہیں۔ باعث یہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت ہمیشہ دو شیروں کے پنجرے اس دروازہ کے اندر رکھے رہتے تھے اور شہر گیری شیروں کی محافظاں دروازہ کے متعلق تھی ۔ انگریزی عہد میں وہ پنجرے اُٹھوائے گئے۔ مگر دروازے کا نام شیراں والا دروازہ بحال رہا۔

تیرھواں ذکی دروازہ المعروف یکی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ پیرذکی شہید کے نام سے مشہور ہے۔ جن کے سر کی قبر عین دروازے کے اندر ہے اور جسم بے سر کے قبر شہر کے اندر ایک طویلہ میں جو اس دروازے کے پاس واقع ہے۔ دونوں جگہ قبریں بنی ہیں اور اعتقاد مند لوگ آ کر فاتحہ کہتے ہیں۔ یہ بزرگ مغلیہ محاصری کے وقت اس دروازے کا محافظ تھا۔ جب شہر فتح ہوا اور رعایا قتل ہوئی تو اس نے با کمال دلاوری دشمنوں کا مقابلہ کیا اور دروازے کے اندر شہید ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ پیرذکی کا سر گردن سے جدا ہوگیا تو جسم بے سر اُس مقام تک دشمنوں سے لڑتا چلا گیا۔ جہاں اب جسم بے سر کی قبر شہر کے اندر ہے۔

یوں یہ تمام دروازے اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ موجودہ وقت میں بھی اپنی اہمیت کی وجہ سے بے حد مشہور ہیں۔ یوں بچے اس نظم کے ذریعے سے لاہور شہر کی اس اہم تاریخی حقیقت سے واقف ہوسکیں گے۔

اگلی نظم ''اقبال کا مرقد'' ہے۔ علامہ محمد اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں۔ بلکہ انھیں ''شاعرِ مشرق'' بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا خواب دیکھا۔ اقبال نے یہ کہا کہ مسلمان جن علاقوں میں اکثریت میں ہیں، اُسے ایک الگ ریاست بنا دیا جائے۔ جہاں مسلمان مذہبی آزادی کے ساتھ اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ اس خواب کو حقیقت کی شکل قائداعظم محمد علی جناح نے دی اور انتھک محنتوں سے پاکستان وجود میں آیا۔

علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ اقبال نے اپنی تمام شاعری میں مسلمانوں کو ہر طرح سے جھنجھوڑا ہے اور ان میں زندگی کی اُمید پیدا کی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو اُن کا روشن ماضی دکھا کر اُنھیں اپنا مستقبل سنوارنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اقبال نے جس ملک پاکستان کا خواب دیکھا اُس کو حقیقت بنتے نہ دیکھ سکے اور اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ علامہ اقبال کو لاہور میں قلعے کے مقابل

دفن کیا گیا ہے۔ جہاں عقیدت مند فاتحہ خوانی اور پھولوں کی صورت میں اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال کو بچوں کی تعلیم و تربیت میں گہری دلچسپی تھی۔ اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک مضمون بعنوان ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' لکھا ہے جس میں اقبال فرماتے ہیں کہ:

''پڑھے ہوئے شاگرد کو پڑھانا ایک آسان کام ہے۔ مگر اَن جان بچوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلم اس کی دقتوں سے ابھی پورے طور پر آشنا نہیں۔ ہمارا پُرانا طریقہ تعلیم چونکہ بچوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت صفر ثابت ہوتا ہے۔'' (۹۸)

لہٰذا علامہ اقبال بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے خاصی فکر رکھتے تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے خود بھی شاعری کی۔ جس میں بچے کی دُعا، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑا اور مکھی، گائے اور بکری، جگنو وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں بچوں کو کچھ نہ کچھ نیا سکھایا گیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کی شاعری کی اہمیت تو ویسے ہی بہت زیادہ ہے لیکن بچوں کے حوالے سے بھی اقبال کی شاعری بے مثال ہے۔

''قلعے کے مقابل مسجد سے ملا ہے
اِک سمت الگ ہی کمرا سا کھڑا ہے
دیوار میں چھت میں پتھر ہی لگا ہے
کیا سادہ بنا ہے
اقبال کا مرقد''(۹۹)

ڈاکٹر علامہ اقبال بچوں کی فلاح و بہبود سے کبھی غافل نہیں رہے۔ ان کے سامنے تو ہر وقت بنی نوعِ انسان کی بہبود کا سوال رہتا تھا۔ وہ بچوں کی بہتری سے کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بچے قوم کے معمار ہیں اور بچے ہی بڑے ہو کر ملک و قوم کی ساری ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا کئی موقعوں پر اظہار کیا کہ اگر بچوں کی تربیت میں خامی رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تعمیر قوم و وطن کی بنیاد میں خامی رہ گئی ہے۔ چنانچہ ان کی اب تک سامنے آنے والی تحریروں میں سے اوّلین نثری تحریر ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' ہے۔ جو رسالہ ''مخزن'' لاہور بابت جنوری ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ لکھتے ہیں:

''تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریقِ تعلیم علمی اُصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں عام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو ملعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثناخواں بن جائیں۔ ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لیے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے: ''اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کر ان کو دیانتداری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیویں۔'' اس طرح ان کا ہر فعل خود غرضی اور خوداری کے اصولوں پر مبنی نہ ہو۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔'' (۱۰۰)

اس حوالے سے بچوں کے ادب میں اقبال کی شاعری کی بے حد اہمیت ہے۔اسی اہمیت کے پیش نظر ''اقبال کا مرقد'' کے نام سے یہ نظم ہے۔ جس میں اس عظیم شاعر کی آخری آرام گاہ کا بڑے ہی خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنا پیغام جو کہ شاعری کے ذریعے سے پھیلایا تھا ، وہ یورپ تک بھی پہنچا۔ نہ صرف مشرق میں اقبال کو مانا گیا بلکہ یورپ نے بھی ان کے پیغام کو سراہا۔ اقبال نے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا جو خواب دیکھا ، وہ انہیں بے حد عزیز تھا ۔ اسی خواب کی تعبیر حاصل کرنے میں انہوں نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ سوئی قوم کو جگایا اور یوں یہ ملک حاصل ہوا۔ اقبال اس ملک کو بنتا تو نہ دیکھ سکے۔ لیکن اُن کا مقبرہ لاہور میں قلعے کے قریب بنایا گیا تا کہ بعد میں آنے والی نسلیں اُن کے پیغام کو اور اُن کی مسلمانوں کے لیے فکر کو زیادہ بہتر سمجھ سکیں۔ جو بھی سیاح لاہور آتا ہے وہ ان کے مزار پر اپنی عقیدت کے پھول ضرور چڑھاتا ہے۔ بچوں کو بھی ایسے عظیم شاعر کے متعلق ضرور معلومات ہونی چاہئیں تا کہ وہ بھی اقبال کے پیغام کو سمجھ کر اپنی زندگیاں اُس کے مطابق گزار سکیں۔

تاریخی عمارات کے سلسلے کی ایک اور اہم ترین نظم ''قلعہ'' ہے جو ماضی کے بہت سارے اہم واقعات اور

یادوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

''یہ عالی جاہ سلطانی قلعہ لاہور کی نامی گرامی شاہی عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اکبر بادشاہ کی سلطنت سے پہلے بھی اس جگہ قلعہ بنا ہوا تھا مگر مختصر اور خام تھا۔ اکبر نے اس کو فراخ کر کے حصار اس کا پختہ بنوایا اور اچھی اچھی عمارتیں خشتی و سنگی اس میں تعمیر کیں۔ شاہ جہاں بادشاہ کے وقت اس قلعہ میں بڑی بڑی عمارتیں بنائی گئیں۔ ان عمارتوں میں سنگ مرمر کی عمارتیں بہت سی بنیں۔ .... اس قلعہ کی چار دیواری نہایت مستحکم و پختہ و بلند ہے اور چوڑی اس قدر کہ توپ اس پر چل سکتی ہے۔ تین دروازے کلاں میں ایک شرقی اور ایک غربی اور ایک گوشہ کمال مغرب میں، اس دروازے پر شاہ جہاں بادشاہ کا نام لکھا ہے۔..........''(۱۰۱)

اس قلعے کے دو بڑے دروازے ہیں۔ ایک دروازہ جسے اورنگ زیب نے بنایا اسے عالمگیری دروازہ کہا جاتا ہے اور یہ دروازہ بادشاہی مسجد کی جانب کھلتا ہے اور دوسرا پُرانا دروازہ ہے جو کہ بادشاہ اکبر نے بنوایا تھا۔ اسے مسیتی یا مسجدی دروازہ کہا جاتا ہے۔ ایک سنگ مرمر کی زنانہ مسجد بھی اس قلعے کے اندر موجود تھی۔ اس کو موتی مسجد کہتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا نام بدل کر موتی بندر رکھ دیا تھا اور سلطنت کا خزانہ اس مسجد میں رکھا جاتا تھا۔ انگریز حکومت کے وقت بھی پنجاب حکومت اپنا خزانہ اسی مسجد میں رکھتی تھی۔ قلعہ کے غربی دروازہ کے آگے جو ایک قطعہ موجود ہے اس میں رنجیت سنگھ نے باغ بنوایا۔ جس کا نام حضوری باغ رکھا۔ اس قلعہ کے اندر موجود مشہور عمارتوں کے نام شیش محل، عالمگیر دروازہ اور موتی مسجد وغیرہ بھی اس قلعے نے بہت سے ادوار دیکھے ہیں۔ جن میں بہت اچھے وقتوں کے ساتھ ساتھ بڑے وقت بھی شامل ہیں کہ جب جنگیں بھی لڑی گئیں۔ ان جنگوں کے نتیجے میں عمارت کو بھی نقصان پہنچتا رہا۔ ان سب کے باوجود یہ عمارت قائم رہی۔

''لاہور سے لگ کر مسجد کے برابر
مغلوں کا بنایا سو طرح سجایا
ہے آج کھنڈر سا اور خود ہے دکھاتا
ماضی کا تماشا
لاہور کا قلعہ''(۱۰۲)

یہ قلعہ مغلیہ دور کی ایک عظیم شاہکار اور یاد ہے۔ اکبر بادشاہ نے اس قلعے کو بہت خوبصورتی سے بنوایا اور سجایا تھا۔ لیکن اُس وقت بنائے گئے قلعے میں اور آج کے موجودہ قلعے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ موجودہ قلعہ کی عمارت حالت اور وقت کے تھپیڑوں کی وجہ سے اپنی خوبصورتی کھو چکی ہے۔ کچھ تو جنگوں کی وجہ سے اس کو بے حد نقصان پہنچا۔ پھر ہر دور کے حاکم نے اسے اپنے ہی انداز میں رکھا۔ کچھ نے تو اس قلعے میں موجود قیمتی پتھر اور سنگ مرمر کو اُتروا کر اس سے اپنی ذاتی عمارات کی تزئین و آرائش کا کام لیا۔ یوں یہ حالات اور انسانوں کے بُرے رویوں کی وجہ سے آج اس خستہ حالی کو پہنچا ہے۔ ان سب سختیوں کے باوجود یہ عمارت آج بھی موجود ہے۔ حالانکہ اس کی تعمیر کے وقت سے لے کر اب تک اس میں بے شمار تبدیلیاں آ چکی ہیں جو کہ کبھی بھی اچھی صورت میں نہیں آئیں ۔ اُن سب کے باوجود یہ آج بھی قائم ہے اور بچوں کو ایسا ورثہ دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اس سے متعلق مغلیہ عہد کے بارے میں بھی بہت سی معلومات حاصل کر سکیں گے اور مسلمانوں کے تابناک ماضی سے بھی آگاہ ہو سکیں گے۔

لاہور کی تاریخی عمارات کے سلسلے کی اگلی نظم ''بادشاہی مسجد'' ہے۔

''یہ عالی جاہ مسجد لاہور کی قدیمی مساجد میں سے بہت بڑی مسجد ہے۔ سب عمارت اس کی سنگ سُرخ و سنگِ مرمر کی ہے۔ تینوں گنبد کلاں سنگ مرمر کے نہایت بلند ہیں۔ چاروں میناروں کے اوپر کی گنبدیاں بھی سنگ مرمر کی تھیں۔ مگر اب موجود نہیں ۔ باقی عمارت سب سنگ سُرخ کی ہے۔ قلعہ لاہور کے غربی دروازے کی طرف چھوٹا سا میدان، جس کو اب حضوری باغ کہتے ہیں؛ چھوڑ کر مسجد کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں اور بہت بلند کرسی دے کر مسجد کی دیوار کا آغاز ہوتا ہے۔ دروازہ اس مسجد کا بھی سنگِ سُرخ سے برجی دار نہایت عمدہ مقطع بنا ہوا ہے اور پیشانی کے کتبہ پر اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی بانی مسجد کا نام اور اہتمام فدائی خان کوکر کا لکھا ہوا ہے۔ یہ فدائی خان جس کے اہتمام میں یہ مسجد تعمیر ہوئی ہے، نہایت متدین و بزرگ بادشاہی نوکروں میں سے تھا۔ یہ مسجد بہت بڑی مسجد ہے؛ صحن نہایت چوڑا وسیع ہے، چاروں مینار نہایت بلند ہیں؛ گنبد بھی اتنے بلند ہیں کہ میناروں کے برابر معلوم ہوتے ہیں۔ صحن مسجد میں خشتی فرش ہے اور سب عمارت دیواروں کی سنگی ہے۔ جامع مسجد دہلی سے یہ مسجد بڑی ہے۔''(۱۰۳)

"شہر سے اگر آئیں قلعہ کی طرف جائیں
باغ میں سے پھر گزریں جس طرف ہیں دو قبریں
چڑھ کر سیڑھیاں پہنچیں
بادشاہی مسجد میں
سامنے جو گنبد ہیں جو چمکتے بے حد ہیں
اِک بڑا ہے، دو چھوٹے یہ ہیں سنگِ مرمر کے
ان کے سائے میں بیٹھیں
بادشاہی مسجد میں"(۱۰۴)

بادشاہی مسجد مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ اقتدار میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسجد ۱۶۷۱ء سے ۱۶۷۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی۔ یہ دنیا کی پانچویں بڑی اور پاکستان کی دوسری بڑی مسجد ہے۔ شہر لاہور میں واقع اس مسجد میں بیک وقت ایک لاکھ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ۱۷۹۹ء میں جب رنجیت سنگھ نے لاہور شہر پر قبضہ کر لیا تھا تو بادشاہی مسجد میں اُس نے اپنی فوج کو رکھا ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں پھر جب انگریز برصغیر پر پوری طرح قابض ہوگئے تو پھر یہ مسجد اُن کے زیرِ اثر اور زیرِ استعمال رہی۔ یوں برطانیہ نے برصغیر پر ۸۹ سال حکومت کی پھر ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس مسجد کی دیکھ بھال اور باگ دوڑ پھر سے مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس مسجد کی مرمت کی گئی اور اسے نمازیوں کے لیے کھول دیا گیا۔ اس مسجد میں آٹھ اونچے مینار ہیں۔ جہاں پر کھڑے ہو کر شہر کا بھرپور نظارہ کیا جا سکتا ہے اور اب تو یہ مسجد عیدگاہ کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ نمازِ عیدین کے وقت سیکڑوں کی تعداد میں نمازی یہاں آتے ہیں۔ یہ مسجد مسلمانوں کے تاریخی ورثے کا ایک جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ مذکورہ نظم سے بادشاہی مسجد کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس نظم کے ذریعے سے مسلمان بچوں میں مسجد کے تقدس کو اُبھارا گیا ہے۔ مسجد مسلمانوں کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل جگہ ہے۔ مسجد کو خُدا کا گھر کہا جاتا ہے اور مسلمان بچوں کو ابتداء سے ہی اس جگہ کے احترام کا سبق ازبر کرایا جاتا ہے۔ مسجد نہ صرف نماز کے لیے ہے بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے ایک کمیونٹی سنٹر بھی ہے۔ جہاں دن میں پانچ وقت اکٹھے ہو کر وہ نہ صرف اللہ کے حضور اپنی حاضری دیتے ہیں بلکہ روزمرہ زندگی سے متعلق مسائل کا دینی نقطہ نظر سے موجود حل تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا بادشاہی مسجد کی اہمیت دیگر عمارتوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اگلی نظم ''مینارِ پاکستان'' ہے جو نہ صرف لاہور کی تاریخی عمارات کے حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ بلکہ پاکستان کی تاریخ میں بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ حالانکہ یہ جنگ ہندوؤں او رمسلمانوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف لڑی تھی۔ لیکن ناکامی کے بعد جنگ کا سارا الزام مسلمانوں پر ڈال دیا گیا اور مسلمان ہندو بنیے کی چالاکی نہ سمجھ سکے اور پہلے سے بھی زیادہ بدتر حالات کا شکار ہوگئے۔ مسلمانوں کی جائیداد اور املاک انگریزوں نے ضبط کر لیں اور یوں مسلمان غربت اور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر ان مشکل ترین حالات میں چند مسلمان رہنما آگے آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو اس غلامی کی زندگی سے نکالنے کا عزم کیا۔ جن میں سرسید احمد خان، چوہدری رحمت علی، علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح جیسے عظیم رہنما شامل تھے۔ یوں علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کا خواب دیکھا۔ جسے عملی جامہ اور حقیقت کا روپ قائداعظم محمد علی جناح نے دن رات کی انتھک محنتوں اور کاوشوں سے دیا۔ ۱۹۴۱ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ اُس قراردادِ کی منظوری جس جگہ ہوئی، اُس کی یاد میں اُسی جگہ پر مینارِ پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جگہ کا ابتدائی نام یادگارِ پاکستان رکھا گیا۔ یہ مینارِ پاکستان اُسی عظیم جدوجہد کی یادگار ہے۔

''لاہور پاکستان کا دل ہے یہی سب نے کہا

اس دل میں جس سے جان ہے

مینارِ پاکستان ہے''(۱۰۵)

لاہور شہر کو اُس کی رونقوں، رنگینیوں اور خوش اخلاقی کی وجہ سے پاکستان کا دل کہا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ نہ صرف خوش اخلاق اور زندہ دل ہیں بلکہ خوش خوراک بھی ہیں۔ لاہور کا ذائقہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ لیکن اس شہر کی ان سب خصوصیات کے ساتھ ساتھ جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ ہے اس شہر میں مینارِ پاکستان کا وجود ہونا۔ یعنی کہ پاکستان کے بننے کی یادگار اس شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ مینارِ پاکستان سے ہمیں خاص جذباتی لگاؤ ہے۔ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کی خوبصورتی کو مزید بڑھاتا یہ مینارِ پاکستان ہماری آزادی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ایک کھلے سے خوبصورت میدان میں موجود مینارِ پاکستان دیکھنے کے قابل ہے اور پاکستانیوں

کی اس سے محبت اور لگاؤ تو فطری جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جگہ کا گھاس بھی ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو صرف ایسی عظیم عمارات دکھا دینا کافی نہیں ہے بلکہ اُنہیں اس عمارت کے بننے کے پیچھے موجود حالات اور حقائق سے واقف ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ تا کہ اُنہیں بھی آزادی جیسی نعمت کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ بچے ان بے شمار قربانیوں کو بھی جان پائیں گے جو اس ملک پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے دی گئی تھیں۔ لہٰذا اس عظیم یادگار کو دیکھنے اور اس کے متعلق پڑھنے کے بعد اُن کے دل میں اس کے احترام میں مزید اضافہ ہوگا اور ملک سے محبت مزید بڑھے گی۔ ساتھ ہی وہ آزادی جیسی اس نعمت کی قدر کرنا بھی سیکھیں گے۔

اگلی نظم ''راوی کا نیا پُل'' ہے۔ پنجاب کا مطلب ہے پانچ دریاؤں کی سرزمین ۔ دریائے راوی پنجاب کے شہر لاہور میں بہتا ہے۔ ابتداء میں دریائے راوی قلعہ لاہور اور بادشاہی مسجد کے درمیان میں بہتا تھا اور اب یہ دریا جگہ چھوڑتے چھوڑتے شہر سے باہر آ گیا ہے۔ راوی کی اپنی ثقافتی حیثیت ہے۔ اس کے پار جنگی قافلے بھی رُکتے تھے۔ اور یہ شہر کی حفاظت کا کام بھی دیتا تھا۔ لاہور کے باسی اسے ''بڈھا دریا'' بھی کہتے تھے۔ دریائے راوی کشمیر سے بہتا ہوا آتا ہے۔ یہ دریاؤں میں سب سے چھوٹا دریا ہے۔

''سو سال پُرانا راوی پہ جو پُل تھا
جب ہوگیا بوڑھا خطرہ ہوا پیدا
گر جائے گا اب تو لے ڈوبے گا سب کو
بوجھ اور زیادہ وہ سہہ نہ سکے گا
اب اس پہ بھروسا کرنا نہیں اچھا
تب سامنے آیا
راوی کا نیا پُل''(۱۰۶)

دریائے راوی پر موجود پُل ذرائع آمدورفت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ پُل کافی پُرانا اور خستہ حال ہو چکا تھا اور جب اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس پُل پر مزید آمدورفت اور بوجھ کسی بڑے جانی نقصان کا نتیجہ بن سکتی ہے تو پھر اس پُل کو گرا کر نیا پُل تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ یہ نیا پُل مضبوط اور سیمنٹ، بجری سے

تیار کیا گیا ہے اور پہلے سے زیادہ کشادہ ہے اور زیادہ بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دریا وقت کے ساتھ ساتھ اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے پہل اس جگہ مغلوں کے وقت کا ایک باغ ہوا کرتا تھا۔ جہاں بے شمار خوبصورت پھول اور پودے تھے۔ دریا کے اندر ''کامران کی بارہ دری'' کے نشانات اب بھی موجود ہیں جو کہ مغلیہ عہد کی نشانی ہے۔ لیکن دریا کے رُخ بدلنے کے نتیجے میں وہ باغ ختم ہو چکا ہے۔ بچوں کو اس نظم سے ایک تو پُل کی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ پُل کسی بھی دریا پر دو کناروں کو ملانے اور آمدورفت کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ دریاؤں کی خصوصیات سے واقف ہوں گے اور انہیں اندازہ ہوگا کہ واقعی دریا کس طرح اپنا رستہ بدلتے ہیں اور ساتھ ہی وہ پہلے زمانے کی کچھ باقیات سے بھی واقف ہوں گے۔

تاریخی عمارات کے حوالے سے جو اگلی نظم ہے وہ ''جہانگیر کا مقبرہ'' ہے۔

''یہ عالی شان عمارت دریائے راوی کے شمالی کنارے پر لاہور سے بفاصلہ چار میل بہ سمت شمال واقع ہے۔ اس عمارت کی خوبی وخوش اسلوبی واستحکام وسنگین دیکھ کر معمار خرد حیران ہے۔ ۱۰۳۷ہجری میں یہ مکان بحکم شاہ جہان بادشاہ تعمیر ہوا اور لاکھوں روپے کا سامان جھاڑ، فانوس، قندیل، فروش، شامیانہ، خیمہ وغیرہ شاہانہ مراتب کے مقدار پر یہاں رکھا گیا۔ مصارف ضروری کے لیے ہزاروں روپے کی جاگیریں مقرر ہوئیں۔ حافظ قرآن خوان پانچ سو آدمی ملازم رکھا گیا کہ نوبت بنوبت مزار پر قرآن پڑھا کریں۔ یہ قدرومنزلت اخیر سلطنت چغتائی تک بحال و برقرار رہی۔ جب بادشاہ گردی ہوئی اور سکھا شاہی زمانہ آیا تو وہ سب سامان ایک دو دستبرد میں لوٹ لیا گیا۔ عمارت باقی رہ گئی۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو مہاراجہ اس کی عمارت کی طرف بھی متوجہ ہوا اور حکم دیا کہ مقبرے کی ضد لہروں پر جو ستون شمع جلانے کے اور جالیاں سنگ مرمر کی ہیں وہ اکھاڑ کر امرتسر لے جائیں اور سری دربار صاحب کے پُل وغیرہ پر لگائی جائیں۔ چنانچہ فی الفور حکم کی تعمیل ہوئی اور بے شمار پتھر اس مقبرے سے اکھڑوا کر امرتسر بھیجا گیا۔.........'' (۱۰۷)

''وہ جس سمت دریا ہے — جدھر ریل گاڑی چلے
جدھر شہ درہ گاؤں ہے — جہاں دھوپ ہے چھاؤں ہے
جہاں جائیں تانگے ، بسیں — جسے دیکھ کر سب کہیں
بہت خوشنما ہے بنا
جہانگیر کا مقبرہ''(۱۰۸)

مغلیہ خاندان کا چوتھا بادشاہ نورالدین اور جہانگیر لقب تھا۔ شہنشاہ اکبر کے زندہ رہنے والوں میں سب سے پہلا بچہ تھا۔ جہانگیر اپنے دورِ اقتدار میں اپنی بیوی نور جہاں کے ساتھ لاہور میں ہی رہا۔ کیونکہ یہ اس کا پسندیدہ شہر تھا۔ جہانگیر نے ۱۶۲۷ء میں وفات پائی اور اسے دل کشا باغ میں دفنا دیا گیا۔ لیکن اس کے بیٹے شاہجہان نے اپنے باپ کی عزت وتقریم میں مقبرہ بنانے کا حکم دیا۔ اس میں جہانگیر کی بیوہ نور جہاں کا بھی کردار شامل ہے۔ نور جہاں نے ہی اس مقبرے کا نقشہ بنوایا اور یوں یہ مقبرہ دس سال کے طویل عرصے میں مکمل ہوا۔ دریائے راوی اور ریلوے سٹیشن جیسے بارونق مقام کے قریب یہ مقبرہ واقع ہے۔ اس مقبرے کے چار بڑے مینارے ہیں۔ ان میناروں کی پہلی منزلیں مقبرے کی چھت تک تو سنگ سُرخ کی ہیں اور سنگ مرمر کی گلکاری ہے۔ خوبصورت سنگ مرمر اور نقش و نگار سے مزین یہ مقبرہ اپنے دور کی عظیم یادگار ہے۔ بچوں کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اُن کے سیکھنے کے لیے بہت کچھ اس نظم میں موجود ہے۔ وہ اس سے مغلیہ حکومت اور دورِ اقتدار کے متعلق بے شمار معلومات حاصل کرسکیں گے کہ تب نظام حکومت کس طرح چلائے جاتے تھے؟ ساتھ ہی وہ اس دور کے طرزِ تعمیر کے بارے میں بھی جان سکیں گے اور متاثر بھی ہوں گے کہ اُس وقت جب اتنی مشینری نہیں تھی اور تعمیر وتزئین و آرائش کے زیادہ تر کام ہاتھ سے کیے جاتے تھے جو اپنی محنت اور پائیداری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ پہلے زمانے میں بڑے بڑے بادشاہوں اور سلطانوں کے مقبرے بنانے کا رواج تھا۔ جن پہ لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ قیوم نظر نے اس نظم میں بہت ساری باتوں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ تمام تر نظارہ اور منظر بڑی تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور یوں اس اہم عمارت کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جاتی ہے۔

لاہور شہر جہاں اپنی بے شمار تاریخی عمارات کی وجہ سے مشہور و معروف ہے وہیں اس شہر کی مقبولیت کی

ایک بہت بڑی اور اہم وجہ مزار بزرگان دین حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ بھی ہے۔

''یہ متبرک و قدیمی مقبرہ لاہور کے مشہور و فرین مزاروں و مقبروں سے ہے۔ دور دور سے مسلمان معتقد لوگ اس مزار کی زیارت کو آتے ہیں۔ بادشاہانِ سلطنت بھی کمال ادب اس مزار کا کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان ابراہیم غزنوی اور سلطان شمس الدین التمش وغیرہ بادشاہوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف اس مزار پر موجود ہیں۔ یہ بزرگ سلطان مسعود، سلطان محمود کے بیٹے کے ہمراہ لاہور آیا اور مسلمانی دین کے پھیلانے میں بہت کوشش کی۔ بڑے بڑے بزرگوں مثل خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیری و خواجہ فرید پاک پتنی وغیرہ نے یہاں آ کر چلے کاٹے اور فیض پایا تھا ۔..........''(۱۰۹)

''گوشہ ہے اک لاہور کا — ہے مرتبہ جس کا بڑا
ہیں دفن نو سو سال سے — جس میں علی ہجویرؒ کے
جن کے نشیب سے مل گیا — حسنی حُسینی سلسلہ
جن کی صفت جو بھی کرے
داتا اُنہیں پہلے کہے
اُس عہد میں اس شہر میں — کیا لوگ تھے اب کیا کہیں
کافر تھے بت تھے پوجتے — اور کام کرتے تھے بُرے
پیغام حق اُن کے لیے — لائے علی ہجویرؒ کے
جس نے بھی درس اُن کا سُنا
دل سے مسلمان ہوگیا''(۱۱۰)

علی ہجویریؒ حسنی اور حسینی سید تھے۔ اُن کے والد محترم حسنی سید تھے۔ جبکہ اُن کی والدہ حسینی سید تھیں۔ عبدالحسن علی ہجویریؒ غزنی (ہجویر) میں پیدا ہوئے۔ اُن کا گھرانہ شروع سے ہی مذہبی تھا۔ آپ کا پورا نام ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الھجویری الغزنوی تھا۔ آپ کا اسم گرامی ''علی'' ہے۔ ابوالحسن آپ کی کنیت ہے اور داتا گنج بخش

آپ کا مشہور ترین لقب ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک طویل عرصے تک ہجویر اور جلاب میں قیام پذیر رہے۔ یہ دونوں شہر موجودہ افغانستان میں موجود ہیں۔ آپ صوفی تھے۔ آپ نے جنوبی ایشیا میں جب جہالت انتہا پر تھی۔ لوگ بتوں کو پوجتے تھے۔ یہاں پہ آئے اور دین کی تبلیغ کا کام کیا۔ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلایا۔ آپ نے بہت سارے لوگوں کو ایک ہی وقت میں کلمہ پڑھایا۔ آپ کی سب سے اہم کاوش فارسی میں لکھی گئی کتاب ''کشف المحجوب'' ہے جو کہ تصوف پہ سب سے پہلی اور بے حد اہم کتاب ہے۔ اب آپ کا مزار لاہور میں واقع ہے اور حضرت داتا گنج بخش کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ جہاں پر ہر وقت لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ ہر سال عرس کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ دور دراز سے لوگ آپ کے مزار پر لوگ منتیں اور مرادیں پانے کے لیے آتے ہیں۔ کیونکہ اللہ اپنے نیک بندوں کے صدقے میں کی گئی دُعائیں ضرور پوری کرتا ہے۔ اس مزار پر نذر و نیاز کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر وقت یہاں لنگر بٹتا رہتا ہے اور لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھاتے ہیں۔ یوں آپ کے مزار پر فاتحہ اور دُعائیں کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ بچوں کے لیے اس نظم میں سیکھنے اور جاننے کو بہت کچھ ہے۔ ایک تو وہ مزار کے متعلق جان سکیں گے کہ اللہ کے نیک بندوں کا نام کس طرح اُن کے جانے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور ساتھ ہی برصغیر میں اسلام کی آمد اور تبلیغ کے متعلق بھی اُن کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ مسلمان بچوں کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ انہیں پیدا ہوتے ہی اسلام کے متعلق تعلیم دینی شروع کر دی جائے اور اس سلسلے میں ایسی نیک شخصیات کا ذکر بھی بے حد ضروری ہے تاکہ اسلام کے متعلق بچوں کے ذہن میں موجود سوالوں کے جوابات اُنہیں مل جائیں۔

لاہور کے تاریخی سلسلے کی اگلی نظم ''انارکلی'' ہے۔ انارکلی اکبر بادشاہ کے محل کی سب سے خوبصورت کنیز تھی اور اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ اکبر کا بیٹا اس کنیز کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ انارکلی سید امتیاز علی تاج کا ایک مشہور کردار رہا ہے اور آج بھی یہ کردار زندہ و جاوید ہے۔ انارکلی کا مزار لاہور میں ہے او راس نسبت سے اس کے قریب موجود بازار انارکلی بازار کے نام سے مشہور ہے۔

> ''یہ مقبرہ اکبری عمارت کی یادگار شہر لاہور کے باہر بگوشہ شہرت اب تک موجود ہے۔
> انارکلی ایک کنیز نہایت خوب صورت اکبر باشاہ کے محل کی تھی۔ جس کا اصلی نام نادرہ
> بیگم تھا۔ بادشاہ نے بسبب اس کے حسن و جمال میں لاثانی تھی اور رنگ سرخ تھا۔

انارکلی کے خطاب سے اس کو مخاطب کیا ہوا تھا۔ جن دنوں میں اکبر بادشاہ دکن و خاندیس کی مہموں میں مصروف تھا۔ یہ لاہور میں بیمار ہو کر مرگئی۔ بعض کا قول ہے کہ مصموم ہوئی۔ بادشاہ کے حکم سے یہ عالی شان مقبرہ تعمیر ہوا اور باغ تیار ہوا جس کے وسط میں یہ مقبرہ تھا۔ سکھی سلطنت کے وقت باغیچہ اُجڑ گیا۔ چار دیواری کی دیواریں خشت فروش گرا کر لے گئے۔ مقبرہ باقی رہ گیا۔"(۱۱۱)

"اوپر نیچے یہاں وہاں روشنیاں ہی روشنیاں
سبز ، سفید ، اُودی ، نیلی سرخ ، سبزی ، چمکیلی
چھت میں اور دروازوں میں شہروں میں ، شہبازوں میں
روشنیاں کیسی کیسی
ہم نے دیکھی انارکلی"(۱۱۲)

انارکلی لاہور کا اہم ترین بازار ہے۔ یہ جنوبی ایشیا کا قدیم ترین بازار ہے۔ تقریباً دو سو سال پُرانا بازار ہے۔ اس بازار کا نام انارکلی اس لیے مشہور ہوا کیونکہ انارکلی کا مزار اس بازار کے قریب ترین ہے۔ انارکلی بازار بہت بڑا بازار ہے۔ یہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء میسر ہوتی ہیں۔ کپڑے، جوتے، زیورات، کھلونے، مٹھائیاں ہر طرح کی دکانیں موجود ہیں۔ انارکلی بازار اب دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ پُرانا انارکلی بازار اور نیا انارکلی بازار۔ پُرانی انارکلی روایتی کھانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ جبکہ نیو انارکلی روایتی کپڑوں اور کڑھائی کی وجہ سے مشہور ہے۔

قیوم نظر نے انارکلی بازار کی بڑے بھرپور انداز میں منظر کشی کی ہے کہ کس طرح مختلف اشیاء کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ برفی، لڈو، پیڑے ہمارے روایتی کھانوں کی عکاسی کر رہے ہیں جبکہ عورتوں کے حوالے سے موجود دکانوں کا ذکر سرے اور کاجل کے ذریعے کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بازار میں ہر وقت لوگوں کا رش لگا رہتا ہے۔ پیدل چلنے والے بھی ادھر سے ہی گزر رہے ہیں اور سواریاں بھی۔ غرض انارکلی بازار اپنے نام کی طرح بہت بارونق اور مشہور ہے۔ بچوں کو بازاروں میں جانا اور اپنی پسند کے کپڑے، جوتے اور کھلونے خریدنا بے حد پسند ہے۔ بلکہ اکثر بچے بازار میں جا کر ضد پر اڑ جاتے ہیں کہ اپنی پسند کا نیا کھلونا لے کر ہی جائیں گے۔ یوں یہ نظم پڑھ کر وہ

اس بازار میں ضرور جانا چاہیں گے۔

لاہور شہر ہمیشہ سے کالجوں کے حوالے سے مشہور رہا ہے۔ اسے علمی شہر کہنا غلط نہ ہوگا۔ اسی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے قیوم نظر نے نظم ''گورنمنٹ کالج،، لکھی ہے۔ گورنمنٹ کالج کا قیام پاکستان بننے سے بھی پہلے ہوا۔

> ''گورنمنٹ کالج ایک ایسا مدرسہ جاری ہوا جس سے ہزار ہا طالب علم تحصیل کے رتبہ پر پہنچ گئے ۔ اس کالج کی شاخیں شہر کے مختلف و متفرق محلوں میں قائم ہیں۔ مبتدی طالب علم برانچوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ جب کالج کے داخل ہونے کے لائق ہو جاتے ہیں تو وہاں بھیج دیے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ علوم مروجہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس سبب سے ہندو مسلمان دونوں فریق اپنے لڑکوں کو بے اندیشہ کالج میں داخل کرا دیتے ہیں۔''(۱۱۳)

برطانوی راج کے دور میں اس گورنمنٹ کالج کو یکم جنوری ۱۸۶۴ء میں راجا دھین سنگھ کی حویلی کے ایک حصے میں کھولا گیا اور اس ادارے کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ کیا گیا۔ کنز کالج کے پروفیسر گوٹلب ولہلم لائٹر (Gottlieb Wilhelm Leiter) کو اس کالج کا پرنسپل بنایا گیا اور یوں اس کالج کی پہلی جماعت نو طالب علموں سے شروع ہوئی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں واقع ہے۔ اسے پاکستان کی سب سے پُرانی یونیورسٹی اور مسلم دنیا کا سب سے پُرانا علمی ادارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پہلے اسے کالج کا درجہ حاصل رہا۔ پھر حکومتِ پاکستان نے اسے ۲۰۰۲ء میں یونیورسٹی کا درجہ دے دیا۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے بھی بہت سے بڑے بڑے ناموں کو اس ادارے سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

''دیکھنا وہ ٹیلا سا — اُس پہ اِک گرجا سا
موٹی موٹی دیواریں — پتھروں کی محرابیں
چھت کی وضع مخروطی — جس سے پیدا مضبوطی
چار منزلیں اونچا — سامنے کا مینارا
ٹھوس ہے بناوٹ میں — خوب ہے سجاوٹ میں
سو برس پُرانا ہے
علم کا خزانہ ہے''(۱۱۴)

قیوم نظر نے اس نظم میں اس کالج کے ظاہری خدوخال بڑی ہی خوبصورتی اور تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ کالج کا پورا نقشہ نظروں سے سامنے گھوم جاتا ہے۔ کالج کے سامنے اونچا سا ٹیلا ہے۔ جس پر ایک گرجا سا ہے۔ دراصل یہ کالج انگریزوں کا بنایا ہے۔ لہٰذا عمارت کی طرزِ تعمیر انگریزوں کے مزاج کے مطابق ہے۔ چار منزلوں جتنا اونچا ایک مینار ہے۔ جو اس عمارت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ درجنوں کمرے ہیں جن میں کمرۂ جماعت، تھیٹر اور تجربہ گاہیں شامل ہیں۔ اساتذہ کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جو اپنے اپنے مضامین میں بے حد طاق ہیں اور طالب علموں کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس کالج سے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ن م راشد، پطرس بخاری، فیض احمد فیض، قدرت اللہ شہاب، مستنصر حسین تارڑ، اشفاق احمد، بانو قدسیہ جیسی نامور شخصیات علم کے زیور سے آراستہ ہوئے اور ساری دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔ بچوں کے لیے ایسے عظیم اداروں اور شخصیات سے واقفیت بے حد ضروری ہے تا کہ وہ بھی علم سے محبت کریں۔ تعلیم کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ انسان علم کے ذریعے سے ہی زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ باشعور بنتا ہے اور خود کو پہچانتا ہے۔ یوں علم کے بغیر انسان نامکمل اور جاہل رہ جاتا ہے۔ لہٰذا علمی اداروں اور علم کی اہمیت سے بچوں کا آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے۔

علمی حوالے سے دوسری اہم ترین عمارت اور ادارہ ''پنجاب یونیورسٹی'' ہے۔ جامعہ پنجاب یا یونیورسٹی آف پنجاب پاکستان کی قدیم ترین جامعہ ہے اور برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں قائم ہونے والی پہلی جامعہ ہے۔ یہ ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی۔ یہ پاکستان کے ثقافتی مرکز لاہور میں واقع ہے۔ جامعہ پنجاب کی سینٹ کا پہلا اجلاس شملہ (موجودہ بھارت) میں ہوا۔ جس میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ برطانوی ہند کی چوتھی جامعہ تھی۔ مگر پچھلی تین جامع صرف امتحان لیتی تھیں اور جامعہ پنجاب نہ صرف امتحان لیتی تھی بلکہ ایک تعلیم دینے کی جامعہ تھی۔ یعنی جامعہ پنجاب بجا طور پر برصغیر کی پہلی ایسی یونیورسٹی تھی جہاں باقاعدہ اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے پہلے ممبئی، مدراس اور کلکتہ میں جامعات تھیں۔ یہ ہند کے مسلمان علاقوں کی پہلی جامعہ تھی۔ اس یونیورسٹی سے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، راجہ انور، ڈاکٹر طاہر القادری جیسی نامور شخصیات علم کے زیور سے آراستہ ہو کر نکلیں۔

''ٹھنڈی سڑک کے ساتھ ہی — وہ جس جگہ ہے بھیڑ سی
اور بھنگیوں کی توپ بھی — دائیں طرف اُس کے بنی
پنجاب — یونیورسٹی

اِک ہال ہے کافی بڑا کمرے ، تھیٹر جا بجا
اور ایک کیفے ٹی ریا پہلو میں جو کھلوا چکی

پنجاب یونیورسٹی"(۱۱۵)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ تعلیم سے انسان میں شعور آتا ہے۔ وہ آگہی حاصل کرتا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے درست سمت کا انتخاب کر پاتا ہے۔ ورنہ زندگی تو جانور بھی گزار دیتے ہیں۔ لیکن انسان اگر علم حاصل نہ کرے تو وہ بھی جاہل ہی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی میں تعلیم کی بے حد اہمیت ہے۔ اسی حوالے سے تعلیمی اداروں کی بھی بے حد اہمیت ہے۔ اچھے تعلیمی ادارے اور اُستاد ایک بہترین نسل معاشرے کو دینے میں بے حد اہم کردار رکھتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر قیوم نظر نے یہ نظم لکھی ہے جس میں پنجاب یونیورسٹی کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ علمی حوالے سے اس کی اہمیت بیان کی ہے۔ جہاں پر ہر طرح کے مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ، اسلامیات، فلسفہ، کیمیا وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے اس ادارے کی بہت اہمیت ہے۔ جس کا اندازہ صرف اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اَن پڑھ یا جاہل لوگوں کو ایک تعلیمی ادارے سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ دل لگا کر پڑھیں تا کہ کل آنے والے وقت میں وہ بھی ایسے ہی بہترین اداروں میں جائیں اور علم حاصل کر کے اپنا او رملک کا نام روشن کریں۔ جب بچوں کو اس طرح ایسے بڑے اداروں کے متعلق بتایا جائے گا۔ ان اداروں سے نام پیدا کرنے والی شخصیات کا علم ہوگا تو وہ بھی ضرور انہی اداروں کا رُخ کریں گے اور علم سے محبت کریں گے۔

اگلی نظم 'عجائب گھر' ہے۔ عجائب گھر وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پر انسانوں ہی کے زیرِاستعمال قدیم چیزیں بے حد سنبھال کے رکھی جاتی ہیں۔ وہ قومیں یا انسان جو موجودہ وقت سے پہلے آئے اور گزر گئے۔ اُن کے روزمرہ کی کیا مصروفیات تھیں یا کس طرح کا رہن سہن تھا۔ وہ برتن کس طرح کے استعمال کرتے تھے۔ کپڑے کس انداز میں پہنتے تھے۔ اُن کے گھروں کے نقشے یا طرزِ تعمیر کیسا تھا۔ خواتین زیور کس طرح کا پہنتی تھیں اور مرد کون کون سے ہنر یا پیشے اپناتے تھے۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہر کسی کے ذہن میں آتی ہیں اور وہ ان کے متعلق معلومات لینے میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسی سب اشیاء یا باقیات ان عجائب گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔ اُنہیں خاص دوائیں لگا کر اگلی نسلوں کے لیے بچا کر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح کتابوں کے پُرانے نسخے بھی ہوتے ہیں کہ پہلے

کے لوگوں کا طرزِ تحریر کیسا تھا؟ اس کے علاوہ قدیم ادوار میں جانور کے خدوخال کیسے تھے؟ وہ کس قدو قامت کے مالک تھے؟ ان سب کی باقیات عجائب گھروں میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ یوں عجائب گھر اپنے آپ میں ایک بہت بڑا ادارہ ہوتا ہے جو ہمیں بے حد قیمتی معلومات سے آگاہ کرتا ہے۔

''لاہور کی سب سے بڑی مسجد تھی لکڑی کی بنی

دیکھی وہاں رکھی ہوئی لے کر ٹکٹ اپنا جونہی

دروازے سے اندر گئے

کل ہم عجائب گھر گئے''(۱۱۶)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ عجائب گھر میں قدیم اشیاء رکھی جاتی ہیں۔ یا پھر ایسی اشیاء کو جگہ دی جاتی ہے جو اپنے آپ میں انوکھی ہوں۔ جیسے اس عجائب گھر میں بھی ایک طرف دیہاتی زندگی دکھائی گئی ہے۔ جس میں بھینس، گائے، بکریاں ہیں تو دوسری طرف شہری زندگی سے متعلق چیزوں کے نمونے بھی ہیں۔ جیسے ریل گاڑی، انجن وغیرہ۔ پہلے پہل جب زمانہ قدیم میں جنگیں لڑی جاتی تھیں تو اُن لڑائیوں میں تلواریں، ڈھالیں، زرہیں، نیزے، خنجر اور تیغے استعمال ہوتے تھے اور یہ انتہائی تیز ہوتے تھے کہ ان سے دشمن کو ہر طرح کا جانی نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ گوتم کا بت بھی تھا اور دیگر کئی چھوٹے بڑے بت اور مورتیاں بھی تھیں۔ یعنی عجائب گھر میں آپ اس قدیم وقت یا گزرے ہوئے حالات کی ایک بھرپور عکاسی دیکھ سکتے ہیں اور بچے تو ویسے بھی نئی چیزوں یا حیران کن باتوں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسی جگہوں پر جانا اور کچھ نیا سیکھنا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔

عجائب گھر کے بعد جو چیز یا جو جگہ بچوں کی خصوصی دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ وہ ''چڑیا گھر'' ہے۔ جہاں پر وہ ایک ہی جگہ میں بے شمار جانوروں، چرند پرند کو دیکھ سکتے ہیں۔ بچوں کو جانوروں سے خاص رغبت ہوتی ہے۔ بچے اور جانور دونوں ہی معصوم ہوتے ہیں اور بے لوث محبت دونوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قیوم نظر نے اس نظم میں بہت خوبی و مہارت سے جانوروں کی خصوصیات اور ان کے متعلقات کو پیش کیا ہے۔

"بارہ سینگے ، ہرن ، چکارے | چیل پاڑے پیارے پیارے
جمع ہوئے ہیں دوست پیارے | سارے چڑیا گھر میں
رنگ برنگے اور کچیلے | افریقہ کے سبز اور پیلے
امریکا کے سرخ اور نیلے | طوطے چڑیا گھر میں
ہنس ، بطخیں ، مرغابیاں تیریں | شور مچائیں اُجلی کونجیں
بگلے کی اِک ٹانگ کو ڈھونڈیں | مل کے چڑیا گھر میں"(۱۱۷)

چڑیا گھر پر یہ ایک طویل نظم ہے جس میں چڑیا گھر کے متعلق تمام تر تفاصیل بتا دی گئی ہیں۔ چڑیا گھر میں موجود تمام جانوروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ اُن کے طور اطوار اور عادات کا بھی ذکر کر دیا ہے کہ شیر دھاڑتا ہے۔ بندر اُچھلتے کودتے ہیں اور شور مچاتے ہیں۔ رنگ برنگے اور کچیلے طوطے ہیں اور ہر نسل کے طوطے موجود ہیں جو کہ مختلف ممالک سے منگوائے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ بطخیں، مرغابیاں بھی ہیں۔ زرافے اپنی لمبی گردن کی وجہ سے خصوصی توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مور، پپیہا اور ہُد ہُد بھی ہیں جو بچوں کا خوب دل لبھاتے ہیں۔ لہٰذا بچے چڑیا گھر جا کر ایک ہی جگہ پر بے شمار جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے ہیں اور ساتھ ہی جانوروں کے حوالے سے اُن کی معلومات میں بے پناہ اضافہ بھی ہوتا ہے۔

باغوں اور میدانوں میں جانا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ باغوں کی کھلی فضا سے وہ بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ خوبصورت اور رنگ برنگے پھول بچوں کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کھلے میدانوں اور باغوں میں وہ خوب بھاگتے دوڑتے ہیں۔ تتلیوں کو پکڑتے ہیں۔ درختوں کے ساتھ جھولتے ہیں اور ساتھ ساتھ تاریخی باغات میں خصوصی تعمیرات کو دیکھ کر بھی خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے متعلق اگلی نظم "گلستانِ فاطمہ" ہے۔

"ٹیلوں کے درمیان | مسجد ہے اِک جہاں
اِک اور باغ ہے | باغِ جناح میں
اس باغ میں بنا | گھوڑے کی نعل سا
دروازہ خوب ہے | باغِ جناح میں

مخمل سی ہے زمین ہر چیز ہے حسین
اس باغ میں کہ ہے باغ جناح میں''(۱۱۸)

باغ جناح لاہور شہر کا تاریخی باغ ہے۔ اسے عام طور پر لارنس گارڈن (Lawrance Garden) بھی کہا جاتا ہے۔ اسی باغ میں ٹیلوں کے درمیان مسجد کے پاس ایک چھوٹا باغ ہے۔ جسے گلستان فاطمہ کہا جاتا ہے۔ اس باغ کی بھی اپنی خوبصورت راہ داری ہے ۔ ہر طرف بہترین گھاس کے قالین بچھے ہیں اور سرو کے قدوقامت درختوں سے سجا یہ باغ اپنے آپ میں بے شمار خوبیاں اور کشش لیے ہوئے ہے۔ اسی طرح لارنس گارڈن ایک ایسا مقام ہے جو مختلف ناولوں اور افسانوں کی زینت بنا ہے۔ اس نظم میں بھی قیوم نظر نے لارنس گارڈن کی پُراسرایت اور ظاہری و باطنی خوبصورتی کو بیان کرتے ہیں۔ اس تاریخی باغ کے درمیان میں ایک بہت بڑی اور قدیم لائبریری قائم ہے جو''قائداعظم لائبریری'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس لائبریری میں بہت بڑے بڑے ادیب اور شاعر مطالعہ کرتے رہے۔ جن میں خاص نام نظم کے معروف شاعر میرا جی کا ہے۔ لہٰذا یہ نظم پڑھ کر بچوں کا دل ضرور چاہے گا کہ وہ باغِ جناح او راس میں موجود گلستانِ فاطمہ کی سیر ضرور کریں اور اس کی خوبصورتیوں کو خود اپنی آنکھوں میں محفوظ کر سکیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور نظم ''شالا مار باغ'' ہے۔ تاریخی حوالے سے اس باغ کی بے حد اہمیت ہے۔

''یہ باغ شاہ جہاں بادشاہ مُغل نے باغ شالامار کشمیر کے نمونہ پر تعمیر کیا تھا۔ اس وقت افسر اس عمارت کا نواب علی مردان خان تھا۔ اور اس کے ماتحت نواب فاضل خان میر عمارت تھا اور مسمی جانی معمار نے نقشہ اس باغ کا حسب منشائے بادشاہ کے مرتب کر کے پیش کیا جو پسند کیا گیا ۔ چونکہ مہر منگا باغبان اس زمیں کا مالک تھا۔ اس نے یہ زمین برضامندی خود بادشاہ کی نذر کی اور قیمت باوجود اصرار بادشاہ کے نہ لی۔ چنانچہ باغبانی اس باغ کی اس کے سپرد نسلاً بعد نسلاً ہوگئی اور اب تک اس کی اولاد باغبان چلی آتی ہے۔ اس کی سرسبزی کے واسطے مادھو پور سے نہر کھدوائی گئی اور وہ نہر باہتمام نواب علی مردان خان لاہور تک آئی۔ بارہ پڑتا چاہ بھی کھدوایا گیا۔ اور چاہات بھی تیار ہوئے۔ غرض بادشاہ اور اہلکاران نمک ہلالی نے اس باغ کو عمارت و اشجار و گلزار سے وہ رونق دی کہ نمونہ خلد بریں کر دیا۔''(۱۱۹)

”باغ ہے عجب دل کش شہر سے ذرا ہٹ کے
شیر شاہ سوری کی شاہ راہ سے کٹ کے
شہ جہاں کا بنوایا جس میں سب کا دل اٹکے
واہگہ کی جانب سے
آئیں جو اُنہیں کھٹکے“(۱۲۰)

’شالا مار باغ‘ مغلوں کا بنایا ہوا باغ ہے۔ یہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں بنایا گیا۔ جی ٹی روڈ سے قریب ہے اور واہگہ کی جانب سے آتے ہوئے بھی نظر آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس کا رُخ کیا جائے۔ حالانکہ آج یہ اپنی اصلی حالت سے کافی مختلف ہے۔

> ”محمد شاہ بادشاہ کے عہد تک اس باغ کی خبر گیری بخوبی ہوئی اور نہایت رونق پُر رہا۔ پھر جب سلطنتِ دہلی ضعیف ہوگئی اور سکھوں کا دور دوراں شروع ہوا تو تین حاکمان لاہور جو پتھر قیمتی اس میں پاتے اکھڑوا کر لے جاتے اور ایک حوض سنگ یشب کا جو لاکھوں روپے کی لاگت کا تھا۔.......... حوض لہنا سنگھ نے کھدوایا اور پچیس ہزار روپے کو حکاک لوگوں کے پاس اس کا پتھر فروخت کر دیا۔ بعدازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے قبضہ وعمل داری کے وقت بے شمار سنگ مرمر کی سلیں بہ ضرورت عمارت دربار امرتسر کے اتروائیں یعنی بارہ دری کلاں جو بالائے آبشار ہے۔ اس کا تمام پتھر مع جالیوں کے جو منڈیروں پر لگی ہوئی تھیں اُتار لیا..........“(۱۲۱)

یوں اس باغ کے بننے اور بگڑنے کی ساری روداد سامنے آ گئی ہے۔ یہ باغ اپنے دور کی شاہکار ہے۔ باغ تین حصوں میں بٹا ہوا ہے اور تینوں کی بلندی ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ ان حصوں کے نام فرح بخش، فیض بخش اور حیات بخش ہیں۔ باغ کو ایک نہر سیراب کرتی ہے۔ اس نہر کے اوپر سنگ مرمر کا ایک تختہ بنا ہوا ہے جس پر بیٹھ کر نہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اس باغ میں جس طرف نظر دوڑائیں فوارے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی پانچ آبشاریں ہیں اور آرام کرنے کو کئی عمارتیں بھی ہیں۔ بچوں کو تو ویسے بھی پانی بے حد پسند ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بھی یہ باغ اُن کی بھرپور توجہ کا مرکز بن سکتا ہے اور ساتھ ہی مغلیہ دور کی اس

خوبصورت عمارت کو دیکھ کر انہیں اندازہ ہو سکے گا کہ پہلے مغلیہ ادوار میں لوگ کس قدر محنتی تھے اور زیادہ تر ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ یوں ان کی معلومات کے حوالے سے بھی اس باغ کی سیر بہت فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔

حوالہ جات (باب سوم)

۱۔ قیوم نظر سے ایک ملاقات از امجد طفیل، ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور، شمارہ ۱، ۲ سالنامہ ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۴۔ امجد طفیل، قیوم نظر سے ایک ملاقات، ماہنامہ ''سیارہ'' ۸۷ء

۵۔ قیوم نظر، گلگلے، فیروز سنز، لاہور، بارِ اوّل ۱۹۹۰ء، ص ۱

۶۔ ایضاً، ص ۲

۷۔ ایضاً، ص ۶

۸۔ ایضاً، ص ۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۲۔ ایضاً، ص۱۵

۲۳۔ ایضاً، ص۱۹

۲۴۔ ایضاً، ص۲۰

۲۵۔ قیوم نظر، آلوچے، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، س ن، ص۱

۲۶۔ ایضاً، ص۲

۲۷۔ ایضاً، ص۵

۲۸۔ ایضاً، ص۶

۲۹۔ ایضاً، ص۹

۳۰۔ ایضاً، ص۴، ۱۸

۳۱۔ ایضاً، ص۸

۳۲۔ ایضاً، ص۱۳

۳۳۔ ایضاً، ص۱۶

۳۴۔ ایضاً، ص۳، ۱۷

۳۵۔ ایضاً، ص۱۰، ۱۱

۳۶۔ ایضاً، ص۷

۳۷۔ ایضاً، ص۱۴

۳۸۔ ایضاً، ص۱۹

۳۹۔ ایضاً، ص۲۰، ۲۱

۴۰۔ ایضاً، ص۱۲

۴۱۔ ایضاً، ص۱۵

۴۲۔ قیوم نظر، بچوں کے لیے نظمیں بلبلے، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، بار اوّل، ۱۹۹۱ء، ص۳

۴۳۔ ایضاً، ص۴

۴۴۔ ایضاً، ص۶

۴۵۔ ایضاً، ص۵۹

۴۶۔ ایضاً، ص۹، ۱۰

۴۷۔ ایضاً، ص۲۶

۴۸۔ ایضاً، ص۳۰

۴۹۔ ایضاً، ص۶۲

۵۰۔ ایضاً، ص۶۳

۵۱۔ ایضاً، ص۱۲

۵۲۔ ایضاً، ص۱۸

۵۳۔ ایضاً، ص۴۰

۵۴۔ ایضاً، ص۴۸

۵۵۔ ایضاً، ص۲۰

۵۶۔ ایضاً، ص۱۹

۵۷۔ ایضاً، ص۲۳

۵۸۔ ایضاً، ص۵۶

۵۹۔ ایضاً، ص۵۷، ۵۸

۶۰۔ ایضاً، ص۵۴

۶۱۔ ایضاً، ص۴۷

۶۲۔ ایضاً، ص۱۷

۶۳۔ ایضاً، ص۳۴

۶۴۔ ایضاً، ص۲۱

۶۵۔ ایضاً، ص۴۹

۶۶۔ ایضاً، ص۳۱

۶۷۔ ایضاً، ص۴۱

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۹۔ ایضاً، ص ۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۴

۷۱۔ ایضاً، ص ۶۱

۷۲۔ ایضاً، ص ۴۳

۷۳۔ ایضاً، ص ۴۴

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۴، ۶۴

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۸

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۱

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۷۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۶، ۳۷

۸۱۔ ایضاً، ص ۳۹

۸۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۸۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۸۴۔ ایضاً، ص ۵۲

۸۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۸۷۔ ایضاً، ص ۶۰

۸۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۹

۹۰۔ ایضاً، ص ۳۲

۹۱۔ ایضاً، ص۳۳

۹۲۔ ایضاً، ص۴۲

۹۳۔ ایضاً، ص۵۰، ۵۱

۹۴۔ قیوم نظر ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۵

۹۵۔ ایضاً، ص۷

۹۶۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، لاہور، س ن، ص۲۷

۹۷۔ ایضاً، ص۲۹-۳۴

۹۸۔ زیب النسا بیگم، ''اقبال اور بچے: اقبال اور بچوں کا ادب''، قومی کونسل برائے فروغ زبان اُردو، نئی دہلی، اشاعت اوّل ۲۰۰۰، ص۱۲۳

۹۹۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۹

۱۰۰۔ عبدالغفار شکیل، مرتبہ، ''اقبال کے نثری افکار''، س ن

۱۰۱۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۳۳۷، ۳۳۸

۱۰۲۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱

۱۰۳۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۱۲۷-۱۵۰

۱۰۴۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۳

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۵

۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۷

۱۰۷۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص۳۱۳-۳۱۷

۱۰۸۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۹-۲۰

۱۰۹۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۲۸۶-۲۸۸

۱۱۰۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۲۱_۲۲

۱۱۱۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص۳۱۰

۱۱۲۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۲۳

۱۱۳۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۵۰

۱۱۴۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۱۹۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۳۴۹

۱۲۰۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸

۱۲۱۔ کنہیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور، س ن، ص ۳۵۰

باب چہارم

صوفی تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا تقابلی مطالعہ

بچوں کے مشہور ادیب الیاس احمد مجتبٰی نے کس قدر مناسب بات کہی ہے کہ:

''بچوں کے واسطے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں''۔(۱)

یہ بڑا ہی کٹھن اور مشکل کام ہے۔ ہم اسے جتنا آسان اور ہلکا پھلکا تصور کرتے ہیں ۔ یہ اتنا ہی مشکل اور محنت طلب ہے۔ یہ خیال کر لینا کہ بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھنا ہر ایک کے بس کی بات ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بڑوں کے لیے نظم و نثر لکھ سکتا ہو، وہ بچوں کے لیے بھی کچھ لکھ سکے۔ بچوں کے ادب کے اپنے تقاضے اور مقاصد ہوتے ہیں۔ اس کی مخصوص زمین ہے جو بے حد نازک اور نفیس ہے۔ لکھنے والے کو نہایت ہوشیاری سے محدود دائرہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے ہر ہر قدم پر اس بات کا احساس ہونا ضروری ہے کہ وہ ایک نئی نسل کے لیے اپنے فن کی تخلیق کر رہا ہے ۔ جو پُرشوق، پُرتجسس اور پُرسوال تو ہے لیکن کمسن اور ناتجربہ کار بھی ہے۔ لہٰذا اس نئی نسل کے ذوق وشوق کو ملحوظ رکھ کر کچھ لکھنا، لکھنے والے کا فرض ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں بڑی جانفشانی اور محنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بڑوں کے لیے کوئی صنفِ ادب تخلیق کرنا ایسا مشکل نہیں ہے مگر بچوں کے لیے ان کے پسندیدہ فن کی تخلیق آسان کام نہیں ہے۔ محمد حسین آزاد کے الفاظ میں ہے کہ:

> ''جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ انہیں بار بار کاٹتا اور بناتا، لکھتا اور مٹاتا، بڈھا ہو کر بچہ بننا، پھرتے چلتے، سوتے جاگتے، بچوں ہی کے خیالات میں رہا کرتا، مہینوں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔''(۲)

یہ حقیقت ہے کہ ادبی کھلونے جتنے نرم و نازک ہوتے ہیں۔ ان کو بنانے میں اتنی ہی زیادہ محنت درکار

ہوتی ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا بھی کوئی کام میں کام ہوا۔ کتنا غلط اور بے بنیاد خیال ہے۔ اسی احساس و خیال کی وجہ سے ہم بچوں کے ادب کو قابلِ اہم نہیں سمجھتے اور ہمیشہ بے توجہی برتتے ہیں۔ ایک اور رجحان بھی ہمارے شاعر و ادیب میں پایا جاتا ہے کہ بچوں کے لیے تو بچے ہی لکھیں۔ بڑوں کا اس سے کیا واسطہ؟ ....کتنی عجیب بات ہے نہ؟ ....گویا بچوں کا ادب نہ ہوا مٹی کا گھر ہوا کہ جہاں چاہا اور جیسے چاہا اسے بنایا اور جی بہلایا۔

بچوں کا ادب تو بڑا ہی مقدس اور اہم ہے ۔ اس کی بھی بڑی صفحات بڑوں کی کتابوں کی طرح ہیں۔ بچوں کے ادب کو بچے تخلیق نہیں کرتے ، بڑے بڑے ادیب و شاعر کرتے ہیں اور انہیں ان تمام باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جن کے متعلق انگریزی کا مشہور نقاد ڈاکٹر ہنری اسٹبل کومیگر رقمطراز ہے :

> ''بچوں کے لیے ایک اچھی کتاب لکھنے کے لیے اعلیٰ اخلاق، بلندئ فکر اور عمدہ کردار کا حسین امتزاج نہایت ضروری ہے۔''(۳)

اخلاق و کردار اور فکروفن کی آمیزش ہی بچوں کے اچھے ادب کی پہچان ہے۔ بچوں کے ادیب و شاعر میں ان خوبیوں کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسری اصنافِ ادب کے ادیبوں اور دانشوروں میں!

بہرحال بچوں کے ادب کے اپنے تقاضے اور مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ لہٰذا بچوں کے لیے ادب تخلیق کرتے وقت ان خصوصیات کو بروئے کار لانا نہایت ضروری اور اہم ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر عمدہ ، نتیجہ خیز اور سبق آموز ادب تیار نہیں ہوسکتا۔ بچوں کا دل بہلانے اور انہیں متاثر کرنے کے لیے جو ادب تخلیق کیا جاتا ہے اُس کے لیے چند اُصول وضوابط اور کچھ اہم باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ ان کی عدم موجودگی نہایت بے جان ادب کا باعث بنے گی اور ایسا ادب بچوں کے لیے نہ صرف غیر دلچسپ ہوگا بلکہ صفر بھی ہوگا۔ بچو ں کے ادب میں سب سے اہم چیز اس کے موضوعات ، پیغام اور سبق یا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تشبیہات، استعارات، آسان زبان، آسان الفاظ ، موسیقیت اور ترنم کو بھی خاصا دخل حاصل ہے۔ صوفی تبسم اور قیوم نظر نے جو بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں اُن کا موازنہ اور تقابل انہی نکات کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا۔

نظموں کے موضوعات کا تقابل

بچوں کے ادب کی پہلی منزل موضوع کا انتخاب ہے۔ یہ ابتداء نہ صرف اہم ہے بلکہ مشکل بھی ہے۔ ہر

موضوع بچوں کا موضوع نہیں بن سکتا۔ مختلف موضوعات سے چند ایسی چیزیں چن کر ان کے سامنے رکھنا ہے جو ان کے خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بچوں کے خیالات ہر عمر کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

> ''اپنے شعور کی ابتداء میں بچہ پرندوں اور دوسرے جانوروں سے دلچسپی لینا شروع کرتا ہے۔ اگر اس زمانے میں پرندوں وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنائی جائیں تو یہ اس کو بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔''(۴)

جب ہمیں نہایت کم سن بچوں کے بارے میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ جانوروں کی کہانیوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو ان کے لیے ایسی کہانیاں اور نظمیں منتخب کی جانی چاہئیں جن میں مختلف جانوروں اور پرندوں کی باتیں ہوں۔ اس طرح کی کہانی یا نظم لکھتے وقت ایک اور بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ جانوروں اور پرندوں کا انتخاب بچوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہونا چاہیے۔ کہانیوں اور نظموں میں ایسے جانوروں کا ذکر ہو جو بچوں کے اردگرد رہتے ہوں۔ جن سے وہ مانوس ہوں۔ جن کو وہ روزانہ دیکھتے ہوں۔ مثلاً بلی۔ یہ بچوں سے بے حد مانوس ہوتی ہے۔ گھر گھر ڈیرے ڈالتی ہے۔ بچوں کی دوست ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو کر ان کا جی بہلاتی ہے۔ بچے اس کو گود میں اُٹھاتے ہیں۔ اس سے پیار کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتے ہیں اور سلاتے بھی ساتھ ہی ہیں۔ جب کمسن بچے بلی کے متعلق کوئی دلچسپ نظم سنتے ہیں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ سراپا شوق بن کر ایسی نظمیں سُننا اور دُہرانا بے حد پسند کرتے ہیں۔

اسی طرح کتا بھی ایک پالتو اور گھریلو جانور ہے۔ بچے شروع سے ہی اسے گھروں میں دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ اسے بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہیں۔ اس کا نام لے کر اسے پکارتے ہیں۔ لہٰذا اس سے متعلق جو بھی کہانی یا نظم ہوگی۔ وہ بچوں کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث ہوگی۔

کوّا اور چڑیا بھی بچوں کے جانے پہچانے جانور ہیں۔ وہ ان دونوں کو روزانہ صبح ہی صبح گھر کی دیواروں پر بیٹھا دیکھتے ہیں۔ روز صبح چڑیوں کی آواز سے ان کی آنکھ کھلتی ہے اور دوسری طرف کوّا سارا دن گھر کی دیوار پر بیٹھا کائیں کائیں کرتا رہتا ہے اور اکثر موقع ملتے ہی ان بچوں کے ہاتھ سے روٹی اُچک لیتا ہے۔ اب بچے جب ان کے متعلق کوئی بھی نظم یا کہانی سنتے ہیں تو ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھتی ہیں۔ اسی طرح بندر بھی ان کا دیکھا بھالا جانور ہے۔ وہ جیسے ہی ڈگڈگی کی آواز سُنتے ہیں، بھاگ کر اپنی امی کے پاس پہنچتے ہیں اور ان سے پیسے

لے کر بندر کا ناچ دیکھتے ہیں۔ یہی ناچ دکھانے والا بندر جب کہانی یا نظم کا روپ دھارتا ہے تو ننھے منے بچے اس میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ غرضیکہ بچوں کے لیے وہی کہانیاں اور نظمیں موزوں اور مناسب ہیں جو جانوروں سے آراستہ ہوں اور جانور بھی ایسے جو جانے پہچانے اور دیکھے بھالے ہوں۔ مثلاً شیر، گیدڑ، بھیڑیا، بکری وغیرہ۔ اگر اس دور میں ننھے منے بچوں کو بادشاہوں اور پریوں کی لمبی لمبی کہانیاں یا مشکل مشکل نظمیں سنائی جائیں گی تو وہ ان کے حافظے میں محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ ان کی دنیا، نہایت ابتدائی دور میں، بڑی محدود ہوتی ہے۔ ان میں انہی چیزوں کا ذکر ہوتا ہے جو ان کے اردگرد موجود ہوں یا جن سے وہ مانوس ہوں۔ بچوں کے ماہر لکھنے والے جب ان کے لیے کچھ لکھتے ہیں تو موضوع کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے والا مشہور ادیب اینڈرسن ان موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو ان کے سن و سال سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ نہ صرف جانوروں اور چڑیوں کی کہانی سُناتا ہے بلکہ گھریلو سامان کے متعلق کہانیاں بھی بچوں کو سناتا ہے۔ ان میں کیل سے لے کر بندوق کی گولی اور مرغیوں سے لے کر چھت کے منڈیرے پر بسنے والی ابابیل تک شامل ہے۔

بچہ جب زندگی کی ابتدائی سرحد عبور کر کے آگے بڑھتا ہے تو وہ جانوروں اور کھلونوں کی دنیا سے آگے نکل کر قدرے وسیع ماحول میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں اس کے کاندھوں پر ہلکی ہلکی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ سکول کی پڑھائی، سبق یاد کرنے کی فکر، کھیل کے میدان میں بازی لے جانے کی دُھن، امتحان کا خوف اور دوسرے آداب و قواعد کا لحاظ۔ وسیع ماحول کی یہ باتیں ذرا تلخ ہوتی ہیں اور ان کے حصول کی خاطر بچے کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تھک جاتا ہے اور چند لمحوں کے لیے ان حقائق سے فرار حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر اسے اپنی محبوب خیالی دنیا یاد آتی ہے۔ وہ دنیا جو اسے اپنے ماحول کے مقابلے میں بہت زیادہ دلچسپ اور حسین معلوم ہوتی ہے۔ اس دنیا میں کھو کر وہ حقیقی دنیا کی سختیاں بھول جاتا ہے اور اسے اپنی ذمہ داریوں سے کچھ دیر کے لیے سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کو سکون و قرار مل جاتا ہے۔ ایسی دلچسپ اور حسین دنیا پریوں اور جنوں کی ہوتی ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نت نئے مناظر سامنے آتے ہیں۔ بہت ساری دلچسپیوں سے بھرپور یہ لمبی لمبی کہانیاں بچوں کو بے حد پیاری معلوم ہوتی ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک ان رنگینیوں میں رہ کر اپنے ماحول سے فرار حاصل کر سکتے ہیں جنوں اور پریوں کی کہانیاں بچوں کی فطرت کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ بڑوں کو ان بے سروپا کہانیوں اور نظموں میں کوئی لطف حاصل ہو یا نہ ہو۔ بچوں کے لیے یہ بے حد دلچسپ ہوتی ہیں۔ وہ ہر

آن ایسی کہانیوں اور قصوں میں ڈوبا رہنا پسند کرتے ہیں اور ان کا یہ شوق غیر فطری نہیں ہے۔

> ''ہمیں بچے کے اس شوق پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہی شوق اس کی قوتِ متخلیہ کو جلا اور نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ ان کہانیوں سے ہم بچے کے ذہن کو سوچنے، سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔''(۵)

مافوق الفطرت کردار کی باتیں اور حیرت انگیز واقعات سن کر بچوں کے دلوں میں اُمنگوں کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ ان کے تخیلاتی دنیا کی سرحد پھیلتی چلی جاتی ہے۔ تخیل کی جلا ان کے لیے بڑی ضروری اور اہم ہوتی ہے۔ مارجیری بینکو (Margery Banco) بچوں کے لیے فینٹیسی (Fantacy) کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہے:

> ''یہ تخیل ہے جس کے سہارے ایک بچہ اپنی اردگرد کی دنیا سے رابطہ قائم کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ صبر، رحم، سمجھ اور تمام جانداروں سے محبت کرنے کا سبق سیکھتا ہے۔''(۶)

اس عمر کے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا جائے اس میں حیرت و تجسس کی کارفرمائی ضروری ہے۔ اپنے ماحول سے دلچسپی لینے کے باوجود بچے خیالی دنیا کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے ذوق کی تسکین کی خاطر جنوں اور پریوں کو بچوں کے ادب کا موضوع بنایا جا سکتا ہے جو حضرات مافوق الفطرت کہانیوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ دراصل بچوں کی نفسیات سے بے خبر ہیں۔

پھر ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ بچے کے لیے اس کی محبوب خیالی دنیا کوئی کشش نہیں رکھتی۔ وہ خیالات کے تانے بانے توڑ کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہے۔ اس کا شعور تیز ہو جاتا ہے۔اس کی سوچ وسیع ہو جاتی ہے۔ حقائق سے آنکھیں چار کرنے اور ان سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے کی طرح وہ فرار حاصل کرنے کے بہانے نہیں ڈھونڈتا بلکہ

> ''خیال سے زیادہ حقیقت کو پسند کرنے لگتا ہے۔ اس عمر میں اسے قطعی طور پر معلوم ہے کہ پریوں کی دنیا جس میں وہ اکثر پہنچ جاتا تھا وہ خواب کی طرح بے حقیقت تھی۔''(۷)

جنوں کے حیرت انگیز واقعات اس کے لیے غیر دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ وہ انہیں جھوٹ سمجھ کر ان سے نظریں پھیر لیتا ہے۔ اب بچہ مافوق الفطرت کرداروں کے عجیب و غریب کارناموں پر یقین نہیں کرتا وہ تو حقیقت پسند بن چکا ہے۔ زندگی اور اس کے حقیقی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی ہمت اس کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی فضا اور ماحول میں پوری دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ نیلگوں آسمان پر اُبھرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر یہ نہیں کہتا:

دیکھو نکلا ہے آسمان پر چاند
روشنی کر رہا ہے گھر گھر چاند

بلکہ اب اسے چاند اور اس کے طلوع و غروب کی حقیقت معلوم کرنے کی دُھن ہوتی ہے۔ پریوں کے قصے، کہانیاں سُننے کی بجائے وہ بہادر انسانوں اور جوان مرد سپاہیوں کی حکایت سُننا زیادہ پسند کرتا ہے۔ سوانح عمریاں اور تاریخی واقعات اس کی دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کے رجحانات کو پیش نظر رکھے بغیر اگر کوئی انہیں

طوطا ہے یہ رنگ رنگیلا
لال ہرا اور پیلا پیلا

والی نظم اور ''چڑیا چڑے'' کی کہانی سنائے تو انہیں کیا خاک لطف آئے گا۔ وہ تو ایسی چیزیں سُننا پسند کریں گے جن میں عزم و ہمت کی باتیں ہوں۔ شجاعت و بہادری کے کارنامے ہوں۔ صداقت اور سچائی کے موقعے ہوں۔ جن کو پڑھ کر ان میں جوش و جذبہ پیدا ہو جائے۔ وہ بھی بہادر انسانوں کی طرح اس دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ کرنے لگیں۔ علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھنے اور منزل کو پا لینے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہو جائے۔

بچوں کی عمر اور مزاج کو ملحوظ رکھ کر موضوع کا انتخاب بے حد ضروری ہے۔ موضوعات کا بچوں کے ذہن سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔ اگر ہم آہنگی اور مطابقت پیدا نہ ہو سکی تو اچھی سے اچھی چیز بھی بے کار ہے۔ اس کے برعکس بُری اور گھٹیا چیز بھی بچوں کو متاثر کر لیتی ہے۔ اگر ان کے ذہن و دل سے مطابقت رکھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہو۔

مگر یہ کام بڑا دشوار اور محنت طلب ہے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقفیت حاصل کیے بغیر اس امر میں کامیابی ناممکن ہے۔ مجتبیٰ حسین کے الفاظ میں:

''اس میں اتنی ہی علمی و ادبی کاوش کی ضرورت پڑتی ہے۔جتنی کسی علمی یا ادبی تخلیق کے سلسلے میں۔''(۸)

مندرجہ بالا حقائق کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ بچوں کے ادب میں موضوع کا انتخاب ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔جس پر نظم و نثر کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

اب صوفی تبسم اور قیوم نظر کی بچو ں کے لیے لکھی گئی نظموں کے موضوعات کا فکری سطح پر تقابل کیا جائے گا۔تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ ان دونوں شاعروں نے بچو ں کے حوالے سے کس طرح کے موضوعات لیے ہیں۔

صوفی تبسم اور قیوم نظر نے بچوں کے لیے جتنی بھی شاعری کی ہے یا نظمیں لکھی ہیں۔اُن موضوعات میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ایک بات تو واضح ہے کہ دونوں شاعر بچوں کو نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور دونوں نے ہی بچو ں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر ہی موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔مثلاً حمد و نعت، حب الوطنی، قدرتی مناظر، موسم، کھلونے، جانور اور پرندے، رشتے، دوستی، اخلاقیات یہ کچھ ایسے موضوعات ہیں جو دونوں کی نظموں میں پائے جاتے ہیں۔یعنی دونوں شاعر بچوں کے کردار اور اخلاق کی نشوونما کے حوالے سے سوچ رکھتے ہیں۔لیکن صوفی تبسم کی نسبت قیوم نظر کے ہاں موضوعات کے سلسلے میں زیادہ بلوغت پائی جاتی ہے۔صوفی تبسم نے بچوں کے لیے جتنی بھی نظمیں لکھی ہیں۔وہ ابتدائی بچپن کے حوالے سے ہیں کہ جب بچہ تیلیوں ، چوزوں، بلیوں سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔جب اُس کی کل کائنات اُس کے کھلونے ہوتے ہیں اور جب اُس کے لیے الفاظ سے زیادہ نظم کا سُر اور لَے اہمیت رکھتے ہیں کہ جنہیں وہ ہر وقت بنا کسی مطلب کے گا سکتا ہے۔

قیوم نظر کے ہاں نظموں کے موضوعات عمر کے لحاظ سے تبدیل ہوتے ہیں۔بہت ابتدائی بچپن کے لیے موضوعات الگ ہیں اور تھوڑی بڑی عمر کے بچو ں کے لیے موضوعات الگ اور تھوڑے سنجیدہ ہیں۔یا یو ں کہہ سکتے ہیں کہ قیوم نظر کے ہاں موضوعات بچو ں کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔اب دونوں شاعرو ں کی نظموں کا موضوعات کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔ حمد و نعت:

صوفی تبسم اور قیوم نظر دونوں شاعروں کے ہاں نظموں کے آغاز سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں نعت ضرور موجود ہوتی ہے۔اس سے ایک تو یہ کہ انسان کو ہمیشہ اور ہر

وقت اپنے بنانے والے کو یاد رکھنا چاہیے اور مسلمانوں کے حوالے سے تو یہ بات بے حد ضروری ہے کہ وہ کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو ضرور یاد کریں یعنی ہر کام کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے ہونی چاہیے۔ پھر ہی اُسی کام میں برکت اور کامیابی حاصل ہوتی ہے اور بچوں کے حوالے سے تو یہ اور بھی ضروری ہے کہ اُنہیں ابتدا سے ہی نہ صرف اپنے مذہب کے حوالے سے معلومات ہوں۔ بلکہ اُنہیں عبادت کی عادت بھی ہو۔ وہ بھی اپنے ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے کریں۔ خواہ وہ پڑھائی ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اُس کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ یہ اُس کا مذہب ہی ہے جو اُس کو پہچان اور نام دیتا ہے۔ اُسے زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اُسے یہ بتاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں آیا؟ اُس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اور زندگی کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ اور ہم چونکہ مسلمان ہیں تو ہمارے لیے اللہ، نبی ﷺ اور قرآن سب سے اہم ہیں۔ انہی سے ہماری زندگی کی ابتداء اور اسی پر ہماری زندگی کی انتہا ہے۔ لہٰذا بچپن سے ہی بچوں کو اللہ کی حقیقت بتا دینا اور مذہب کے بارے میں سمجھا دینا بے حد ضروری ہے کہ ہمارا رب کون ہے؟ ہمیں کس نے پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ کتنے ہیں؟ ہم سب کون ہیں؟ یہ چند سوال وہ ہیں جو ہر مسلمان بچے کو سب سے پہلے سنائے اور ان کے جواب سکھائے جاتے ہیں یعنی یہ سب سے ضروری اور اہم سوالات ہیں جن کے متعلق بچوں کو بہت چھوٹی عمر سے ہی معلوم ہونا بے حد ضروری ہے۔ اسی لیے بچوں کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں بھی یہ اہم ترین باتیں جو اللہ اور رسول ﷺ کے بارے میں ہیں وہ سب سے پہلے بتائی اور سمجھائی گئی ہیں۔ کیونکہ بچوں کے لیے ان اہم ترین موضوعات کا سمجھنا بے حد ضروری تو ہے لیکن اگر سمجھانے کے لیے انداز بھی اُنہی کی سمجھ کے مطابق ہو تو بچوں کے لیے زیادہ آسانی ہو جاتی ہے۔ صوفی تبسم اور قیوم نظر نے اس سب سے اہم اور ضروری بات کو بچوں کے حوالے سے بڑے ہی آسان اور عام فہم انداز میں بتا دیا ہے تاکہ بچوں کو ان باتوں کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

صوفی تبسم کا ہاں اس سلسلے میں جو موضوعات ہیں وہ میرا خدا، تو زمین آسمان کا مالک، نبی ہمارے، دُعا اور نعت ہیں۔

جس نے بنائی دنیا ‌ ‌ ‌ جس نے بسائی دنیا
ہاں وہ مرا خدا ہے

(میرا خدا) ص:۸۹

☆......☆......☆

تو زمین آسمان کا مالک بھولے بھٹکوں کا رہنما تو ہے
ساری دنیا جہاں کا مالک نا اُمیدوں کا آسرا تو ہے

(تو زمین آسمان کا مالک) ص: ۹۰

☆......☆......☆

اے خُدا! اے خُدا! اے خُدا! اے خُدا!
تو ہمیشہ سے ہے تو رہے گا سدا

(دُعا) ص: ۹۲

اوپر دی گئی ان تینوں حمدوں میں خُدا کی تعریف کا موضوع ہے ۔ تینوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کی تعریف کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کی ہے کہ اے اللہ تو ہی ہمیشہ سے ہے او رہمیشہ رہے گا ۔ تجھے فنا نہیں ہے۔ باقی ہر شے کو فنا ہے اور ہم سب کا پیدا کرنے والا تو ہے تو ہی سب کا خالق مالک اور رازق ہے۔ ہم سب گنہگار اور خطاوار ہیں لیکن تو رحیم و کریم ہے۔ تیری رحمت بے شمار ہے اور تو سب کا معاف کرنے والا ہے۔ ہم سب تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے ڈرتے ہیں اور بخشش مانگتے ہیں۔ یوں زندگی کی یہ اہم ترین باتیں جب بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے حمد کا روپ دھارتی ہیں تو اُن معصوم ذہنوں کے لیے ان باتوں کو سمجھنا اور اللہ کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہو اور اللہ کے محبوب رسول ﷺ کی شان میں نعت نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ حق کی باتیں بتانے والے
وہ سیدھا رستہ دکھانے والے
وہ رہبر و رہنما ہمارے
نبیؐ ہمارے نبیؐ ہمارے
درود اُن پر سلام اُن پر

(نبیؐ ہمارے) ص: ۹۱

دل آرا محمدؐ ہمارا محمدؐ!
ہے ہم سب کی آنکھوں کا تارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ، تمہارا محمدؐ
جہاں میں ہر اِک کا سہارا محمدؐ

(نعت) ص:۹۳

حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی آیا ہے اور نہ کوئی نبی آئے گا۔ آپؐ قیامت تک آخری نبی رہیں گے۔ آپؐ اللہ رب العزت کے محبوب پیغمبر اور رسول ہیں۔ اللہ پاک نے آپؐ کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا۔ اللہ پاک اور فرشتے ہر وقت آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ آپؐ پر درود و سلام بھیجتے رہیں۔ مسلمانوں کا ایمان تب تک نامکمل ہے جب تک وہ اللہ کے تمام نبیوں، کتابوں، قیامت اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان نہ لائیں۔ لیکن تمام نبیوں میں اللہ کے محبوب نبی بھی آپؐ ہیں۔ لہٰذا ہم سب کو بھی اپنی تمام تر محبتوں میں سب سے عزیز آپؐ کو رکھنا چاہیے۔ یوں اللہ اور رسول ﷺ کے متعلق اس قدر نازک اور اہم باتوں کو بچوں کے حوالے سے موضوع بنا کر صوفی تبسم نے بہت اہم کام کیا ہے۔

اسی طرح قیوم نظر نے بھی اس سلسلے میں شاعری کی ہے اور ان کے موضوعات حمد، میرا خُدا اور نعت ہیں۔

پھول اور چڑیاں اور ہوا بھی
سب کرتے ہیں حمد خدا کی
ان میں شامل اب ہوں میں بھی

(حمد۔ بلبلے۔ ص:۳)

☆......☆......☆

سب کو بنایا میرے خُدا نے
ہر ایک جانے ہر ایک مانے

(میرا خُدا۔ بلبلے۔ ص:۴،۵)

دونوں حمد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت کی تعریف کی گئی ہے کہ ہر شے اللہ تعالیٰ نے بنائی ہوئی

ہے اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس کائنات کی ہر ایک شے میں اُس کی قدرت کے بے شمار نظارے ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، جہاز، دریا، سمندر، پھل، پھول، پودے، انسان، جانور، پرندے غرض ہر شے اللہ پاک نے بنائی ہے۔ یہ کائنات اُس رب نے سنواری سجائی ہے اور اس دنیا کی ہر شے، ہر جاندار اپنے انداز میں اپنے بنانے والے کی حمد وثنا کرتا ہے۔ اتنے اہم موضوع کو بڑے ہی آسان انداز میں بتا اور سمجھا دیا ہے۔

وہ تھا محمدؐ حق کا پیمبر
نبیوں میں وہ سب سے بڑھ کر
دونوں جہاں کو فخر ہے اُس پر
(نعت ۔ بلبلے۔ ص:۶)

قیوم نظر نے یہ بہت خوبصورت نعت لکھی ہے اور اُس چھوٹی سی نعت میں بھی ساری بات شروع سے آخر تک بڑے خوبصورت اور نرالے انداز میں سمجھا دی ہے۔ ہمارے ایمان کی مضبوطی اور مذہب کی سمجھ بوجھ کے حوالے سے نہایت اہم موضوع ہے۔ جس کے بغیر ایمان اور زندگی دونوں نامکمل رہتے ہیں۔ لہٰذا نعت آسان اور مختصر ہے لیکن اس کو پڑھ کر بچوں کو ساری بات آسانی سے سمجھ آ جائے گی۔

۲۔ حب الوطنی:

وطن سے محبت یا حب الوطنی فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ انسان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور بڑھتی عمر اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ جذبہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان اسی جذبے کے تحت اور وطن کی محبت میں اپنی جان کا نذرانہ دینے سے بھی گریز نہیں کرتا اور اسی وطن کی ترقی کے لیے دن رات محنت بھی کرتا ہے تاکہ ملک وقوم کا نام روشن ہو سکے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ جذبات انسان کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ ضرورت صرف ان جذبات کو اُبھارنے یا مضبوط کرنے کی ہوتی ہے۔ صوفی تبسم اور قیوم نظر نے بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں اس اہم موضوع کو بھی لیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بچپن میں سکھائی ہوئی باتیں اور عادتیں انسان ساری زندگی نہیں بھولتا۔ لہٰذا وطن سے محبت، وطن کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ، وطن کے نام روشن کرنے کی سوچ۔ یہ سب ان نظموں میں سکھا اور سمجھا دیا گیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بچے ان نظموں سے بے حد مثبت اثرات لیں گے اور اپنے ملک کے لیے پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش سے کام کریں گے۔

صوفی تبسم کے ہاں یہ موضوعات دیس ہمارا، پیارا دیس ہمارا، یہ نشان، ہیہ ہمارے وطن کے نشان اپنا راج ہیں۔

ہم سب کی آنکھوں کا تارا
اپنے دیس پہ ہم قربان
دیس ہمارا پاکستان

(دیس پیارا، ص ۱۰۱)

☆......☆......☆

ہمارا دیس ہمارا، پیارا دیس ہمارا
ہر اس شے کی شان نرالی
شان نرالی، آن نرالی
گوشہ گوشہ ایک چمن ہے
ذرّہ ذرّہ ایک ستارہ
پیارا دیس ہمارا، پیارا دیس ہمارا

(پیارا دیس ہمارا۔ ص: ۱۲۲)

☆......☆......☆

اس سے رشکِ فلک ہے زمین وطن
اس سے روشن ہوئی ہے جبینِ وطن
ذرہ ذرہ وطن کا ہوا ضُوفشاں
یہ نشان یہ ہمارے وطن کا نشاں

(یہ نشان یہ ہمارے وطن کا نشان، ص: ۱۲۵)

☆......☆......☆

لاکھ مصیبت اِک سلجھاؤ

لاکھ بگاڑ او رایک بناؤ

لاکھ دکھوں کا ایک علاج اپنے دیس میں اپنا راج

(اپنا راج۔ص:۹۰)

یوں ایک ہی موضوع سے متعلق یہ چار نظمیں دی گئی ہیں۔جن میں ایک ہی بات یعنی وطن سے محبت اور وطن کے لیے کچھ کر جانے کے جذبے کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بچے اپنے وطن کے لیے محبت کے جذبات رکھتے ہیں او ر یہ ایسا موضوع ہے جو ان کا پسندیدہ بھی ہے کیونکہ جب بھی کوئی ملکی تہوار آتا ہے تو بچے اس میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ جو کہ اُن کے وطن سے محبت کا والہانہ اظہار ہے۔ لٰہذا یہ موضوع جو حب الوطنی کا صوفی تبسم نے لیا ہے ۔ بچوں کا پسندیدہ موضوع ہے اور ان نظموں کے پڑھنے کے بعد وہ زیادہ محنت اور جانفشانی سے پڑھیں گے تا کہ اپنا اور ملک وقوم کا نام روشن کر سکیں۔

قیوم نظر کے ہاں حب الوطنی سے متعلق جو موضوعات ہیں وہ سب سے اُونچا اور وطن میرا ہیں۔

میرا جھنڈا میرے وطن کا

سب سے اچھا سب سے اُونچا

(سب سے اونچا۔ص:۷)

☆......☆......☆

جسے چاہوں اس میں رہیں کھیلوں ، کودوں ، لکھوں ، پڑھوں

پیار اس کی ہر شے سے کریں جان ہے میری بدن تیرا

پاکستان وطن میرا

(وطن میرا۔ص:۵۴)

قیوم نظر نے ان دونوں نظموں میں وطن سے محبت کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں دیا ہے۔ساتھ ہی آزادی کا مطلب بھی سمجھا دیا ہے کہ آزاد ملک میں رہنا کتنی بڑی نعمت ہے اور اسی ملک سے ہماری پہچان ہے اور ہمیں بھی اس ملک کی عزت کا پاس رکھنا چاہیے۔ایک بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ کہ بچپن میں جب بھی بچوں

سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ بڑے ہو کے کیا بنیں گے تو اکثریت کا جواب یہی آئے گا کہ وہ بڑا ہو کر فوجی بنے گا یعنی اتنی چھوٹی عمر میں ایسی بڑی اور بہادر سوچ رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وطن سے محبت بچوں میں بہت زیادہ موجود ہوتی ہے۔ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اُس محبت کو درست سمت دی جائے اور ان نظموں کے ذریعے وہی کام کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ قدرتی مناظر/موسم

سورج، چاند، ستارے، بارش، بادل، ہوا یہ وہ قدرتی مناظر ہیں جو بچے ہر وقت اپنے اردگرد دیکھتے رہتے ہیں۔سورج کی روشنی اُن کے لیے کھیلنے کودنے اور گھر سے باہر جانے کی علامت ہے۔یعنی دن کا وقت وہ وقت ہوتا ہے جس میں بچے گھومتے پھرتے، کھیلتے کودتے ہیں۔جبکہ شام ہوتے ہی گھروں کو چل پڑتے ہیں او رپھر رات کو چندا ماما اور تاروں سے سارے دن کی بے شمار باتیں اور قصے کہانیاں کہتے ہیں۔ماموں وہ رشتہ ہے جس سے بچوں کو سب سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔لہٰذا چاند کو بھی اسی لیے چندا ماما کا لقب دیا گیا ہے کیونکہ بچے اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔اُنہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ چاندرات کے وقت صرف اُن سے باتیں کرنے، انہیں بہلانے اور میٹھی نیند سلانے آیا ہے او راس سے بڑھ کر سورج، چاند کا کوئی تصور اُن کے ذہن میں نہیں ہوتا۔اسی طرح بارش اور بادل بھی بچوں کے لیے خوشی کا پیغام ہیں۔بارش میں کھیلنا، بھیگنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔لہٰذا یہ وہ موضوعات ہیں جو بچوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جسے وہ جانتے نہ ہوں یا انجان ہوں۔

صوفی تبسم کے ہاں قدرتی مناظر او رموسم سے متعلق یہ موضوعات بادل، آیا بسنت میلہ، بادلوں سے، موسم بہار، آیا آیا نکلا چاند، رات دن اور تارے ہیں۔

کالے بادل آئیں گے — آ کر مینہ برسائیں گے
مینہ میں لوگ نہائیں گے — کالے بادل آئیں گے

(بادل۔ص: ۹۵)

☆......☆......☆

آیا آیا ہے موسم بہار کا
آیا آیا ہے موسم بہار کا
کتنا اچھا ہے موسم بہار کا
آیا آیا ہے موسم بہار

(موسم بہار۔ص:۱۴۱)

☆......☆......☆

آہا آہا نکلا چاند
کیسا اچھا پیارا چاند

(آہا آہا نکلا چاند۔ص:۱۴۲)

☆......☆......☆

رات آئی اور جاگے تارے
ننھے منے چھوٹے چھوٹے
گول مٹول اور موٹے موٹے
آ بیٹھے ہیں مل کے سارے
رات آئی اور جاگے تارے

(تارے۔ص:۱۰۹)

☆......☆......☆

کیسے اللہ نے بنائے رات دن　　　کیسی حکمت سے سجائے رات دن
دن ہوا سب کام کرنے لگے گئے
شب ہوئی آرام کرنے لگ گئے

(رات دن۔ص:۱۱۹)

اوپر دی گئی نظموں کو دیکھا جائے تو ساری نظموں کا بنیادی موضوع قدرتی مناظر ہیں۔ بادل اور بارش بچوں کا پسندیدہ ترین موسم ہے۔ بارش میں بھیگنا ہر بچے کو اچھا لگتا ہے۔ لہٰذا بارش اور بادل سے یہ محبت اور دوستی بہت پُرانی اور مضبوط ہے۔ لہٰذا ایسے موضوعات بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر دن رات اور چاند تاروں کا ایک مربوط نظام ہے جو بچے شروع سے ہی اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اور اُسی نظام کے تحت چلتے ہیں یعنی دن میں وہ بھی پڑھتے ہیں اور کھیلتے ہیں۔ جبکہ رات کے وقت دوسروں کے ساتھ بچے بھی آرام کرتے ہیں۔ بلکہ نیند تو بچوں کو بھی بے حد پسند ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رات سے بچوں کی محبت یقینی ہے۔ لہٰذا یہ وہ موضوعات ہیں جو بچوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ایسی نظمیں پڑھنا اور دُہرانا بچوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔

قیوم نظر کے ہاں موسم اور قدرتی مناظر سے متعلق موضوعات سورج نکلا، صبح سویرے، مینہ برسا ہے، گرمی آئی، چاند، تارے، سورج اور برسات ہیں۔

خوشبوؤں نے باغیچوں کے
کونے کونے کو مہکایا
سورج نکلا دن چڑھ آیا

(سورج نکلا۔ بلبلے۔ ص:۸)

☆......☆......☆

ندی نالے بھر بھر کرتے
جا پہنچے ہیں جانے کہاں تک
جل تھل، جل تھل ہر جانب ہے
کتنے مزے کا
مینہ برسا ہے

(مینہ برسا ہے۔ بلبلے۔ ص:۲۴)

☆......☆......☆

گرمی آئی ، گرمی آئی — کھانے کو کیا کیا پھل لائی
شہتوت اور شہ دانے آئے — لوکاٹ اور آلوچے آئے

(گرمی آئی۔ بلبلے۔ص:۳۸)

☆......☆......☆

چاند سفر پہ نکلا ہے — سر پہ ہمارے پہنچا ہے
مشرق سے یہ اُبھرا تھا — مغرب میں چھپ جائے گا
شام ہی کو آتا ہے نظر — رات کو جو کرتا ہے سفر
چاند زمین کا ہمسایہ — چندا ماموں کہلایا

(چاند۔ بلبلے۔ص:۴۳)

☆......☆......☆

رات ہے روشن ہیں تارے — ہنستے کھیلتے ہیں سارے
کچھ اس طور چمکتے ہیں — جیسے ہم کو تکتے ہیں

(نظم تارے۔ بلبلے۔ص:۴۴)

☆......☆......☆

بادل آئیں ، بادل آئیں — کالی گھٹائیں ، مینہ برسائیں
جن کو اپنے دوش پہ لائیں — دل خوش کرنے والی ہوائیں
لڑکے بالے باغ میں جائیں — جھولے ڈالیں اور جھلائیں

(نظم برسات۔ بلبلے۔ص:۶۴)

قیوم نظر نے بھی قدرتی مناظر میں اُنہی مناظر اور موسموں کی بات ہے جو کہ بچوں کے دیکھے بھالے ہیں اوران کے لیے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ دن چڑھتے ہی بڑوں کی طرح بچے بھی اس کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سکولوں کو جاتے ہیں، پڑھتے ہیں اور پھر رات کے وقت آرام کرتے ہیں یا اپنے دوستوں چاند اور تاروں سے بے شمار باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح برسات کا موسم بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کسی تہوار سے کم نہیں ہوتا۔

برسات کا موسم بچوں کو بے حد خوشی دیتا ہے۔ وہ اس میں نہاتے، گاتے اور کھیلتے ہیں اور پھر موسموں کے حوالے سے طرح طرح کے پھل اور کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ موسموں کی پہچان بچوں کو شروع سے ہی ہوتی ہے اور ایسے موضوعات ہیں جو کہ بچوں کے آس پاس ہی ہوتے ہیں اور بچے ان سے مانوس بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا موضوعات بچوں کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

۴۔ جانور اور پرندے

جانور اور پرندوں سے بچوں کی دوستی ازل سے ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں اور اپنے پاس آنے والے اور اپنے ساتھ کھیلنے والے ہر جاندار سے دوستی اور محبت کر لیتے ہیں۔ بہت سے جانور اور پرندے بھی ایسے ہوتے ہیں جو انسانوں اور خصوصاً بچوں سے بے حد مانوس ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان سے بہت محبت کرتے ہیں اور بدلے میں انسانوں سے بھی محبت کی توقع رکھتے ہیں اور ایسی بے لوث محبت انہیں سب سے زیادہ بچوں سے ملتی ہے۔ جو بنا کسی فرق یا امتیاز کے جانوروں اور پرندوں سے محبت کرتے ہیں۔ بشرطیکہ بچے ان جانوروں اور پرندوں سے مانوس ہوں۔ اگر کوئی جانور یا پرندہ ایسا ہوگا جس کو بچوں نے پہلی دفعہ دیکھا ہو تو وہ کبھی بھی فوراً سے اُس کے پاس نہیں جائیں گے۔ اور اگر کوئی جانور یا پرندہ کبھی انہیں کوئی نقصان پہنچا دے تو ایسے میں بچے دوبارہ کبھی اس جانور یا پرندے کے پاس نہیں جاتے اور نہ اُن سے دوستی کر پاتے ہیں۔ بہر حال صوفی تبسم اور قیوم نظر کی نظموں کا ایک خاصا اچھا حصہ انہی موضوعات کی نظر ہے۔ جو جانوروں اور پرندوں سے متعلق ہیں۔

صوفی تبسم کے ہاں جانوروں اور پرندوں سے متعلق موضوعات بلی، سانپ کی دم، دونوں شیر، کالا ریچھ، بندر اور بندریا، نہر میں آگ، سنو گپ شپ، گیٹو گرے، شمیم کی بلی، مرغا اور چوزا، انڈہ، نمک ٹم، نرالا شیر، ٹمک ٹالا، پانچ چوہے، چیچوں، چوہا، چوہوں کی میٹنگ، چوہوں کا ترانہ آزادی اور بلیاں اور چوہے ہیں۔

دنیا کے رنگ نرالے
بلی نے چوہے پالے

چوہوں نے دھوم مچائی
بلی کی شامت آئی

(بلی۔ ص:۱۹)

☆......☆......☆

مُرغے میں نے انڈہ دیا　　مرغی تو نے خوب کیا
انڈے اتنے چنگے ہیں　　پاؤں میرے ننگے ہیں
کیسی باتیں کرتے ہو؟　　انڈے بیچو جوتا لو

(انڈہ۔ص:۲۵)

☆......☆......☆

ایک نرالا شہر　　شہر کے اندر نہر
نہر کے بیچ میں آگ　　آگے میں کالا ناگ
ناگ کے اوپر پیڑ　　پیڑ کے نیچے بھیڑ
بھیڑ کے سر پر مور　　مور مچائے شور

(نرالا شہر۔ص:۲۷)

☆......☆......☆

ایک تھا تیتر ایک بٹیر　　لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہوگئی گم　　ایک کی چونچ ایک کی دُم

(دونوں شیر۔ص:۲۷)

☆......☆......☆

ریچھ نچانے والا آیا، ریچھ نچانے والا
پاؤں بھی کالے، ہاتھ بھی کالے
منہ بھی اُس کا کالا

(کالا ریچھ۔ص:۲۸)

بندر یا نے گھگرا پہنا
بندر نے شلوار
بندریا چھری اُٹھائی
بندر نے تلوار

(بندر اور بندریا۔ص:۳۳)

☆......☆......☆

اِک تھا گیٹو گرے　　اُس کے دو مور تھے
اک کا کالا تھا سر　　اِک کے پیلے تھے پَر
دانہ کھاتے تھے وہ　　دُم ہلاتے تھے وہ

(گیٹو گرے۔ص:۹۸)

☆......☆......☆

ایک لڑکی تھی ننھی مُنی سی　　موٹی سی اور تھن متھنی سی
اس نے پالی تھی اِک بڑی بلی　　جتنی وہ خود تھی اتنی ہی بلی

(شمیم کی بلی۔ص:۱۱۱)

☆......☆......☆

ہے نرالی بہت میری بلی　　ہے یہ چوہا بھی اور یہی بلی
میری بلی میں ایک خوبی ہے　　کبھی چوہا ہے اور کبھی بلی

(بلیاں اور چوہے۔ص:۱۳۴)

☆......☆......☆

ہے میرے پاس اک مرا چوہا　　خوبصورت سا دلربا چوہا
دُم بھی چوہے کی سر بھی چوہے کا　　ہے میرا چوہا بس نرالا چوہا

(نظم چوہا۔ص:۱۰۶)

ہم اصلی شیر بہادر ہیں　　یہ شیر تو خالی نام کا ہے
ہم چوں چوں چوں چوں کرتے ہیں　　وہ میاؤں میاؤں میاؤں کرتی ہے
یہ تخت یہ تاج ہمارا ہے　　جنگل میں راج ہمارا ہے

(نظم ، چوہوں کا ترانہ آزادی۔ص:۱۳۳)

☆......☆......☆

مُرغا جو ہے منڈیر پہ بیٹھا
ککڑوں ککڑوں گائے
جو بھی اس کی دُم کو پکڑے
خود مُرغا بن جائے

(نظم ، مرغا اور چوزہ۔ ص:۱۳۵)

یوں اوپر بیان کی گئی تمام نظموں میں جانوروں یا پرندوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جیسے چوہا اور بلی ازلی دشمن ہیں اور بچے ان دونوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بلکہ بلی سے بے حد مانوس بھی ہوتے ہیں۔ اکثر بچے ان بلیوں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں۔ وہ بلیاں ان کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ ان کے ساتھ سوتی ہیں۔ کھاتی پیتی ہیں اور ہر طرح سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ پھر اسی طرح چوہے اکثر گھروں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ گھروں میں گھس کر اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں۔ انہیں بچوں نے بہت بار دیکھا بھی ہوا ہے اور اکثر بچے ان سے ڈرتے ہیں۔ چوہا بھی ایسا جانور نہیں ہے کہ جسے پالا جا سکے۔ لیکن پھر بھی بچوں کی ایک ایسی تعداد ہے جو چوہے کو بھی پالتی ہے۔ لہٰذا یہ موضوع بھی بچوں کا دیکھا بھالا ہے۔

پھر مرغے اور مرغیاں تو ہیں ہی ایسے جانور کو جنہیں گھر میں آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بچوں کو تو رنگ برنگے چوزے زیادہ پسند ہوتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں آج بھی ہر گھر میں مرغیاں اور مرغے پالنے کا رواج ہے اور مرغی کے انڈوں کو بیچ کر اپنی گزر بسر کا انتظام کرتے ہیں۔ اور شہروں میں مرغیاں پالنے کا رواج تو نہیں ہے۔ ممکن ہے کھانے میں بچے اور بڑے مرغی کو ہی پسند کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بچوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ لہٰذا یہ موضوع ہر طرح سے بچوں کا پسندیدہ ہے۔

بندر اور ریچھ کا تماشا بھی بچے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان جانوروں کو صرف وہی لوگ پالتے ہیں جنہوں نے ان کو ذریعہ معاش بنایا ہوتا ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ بچے ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ صرف بندر اور ریچھ کا ناچ دیکھنا انہیں پسند ہے۔ لہٰذا یہ موضوع بھی بچوں کے اردگرد یا ان کے گلی محلے میں ہی پایا جاتا ہے۔ یعنی بچوں کا دیکھا بھالا موضوع ہے۔

اسی طرح مور، تیتر، بٹیر یا اسی کے پرندے بھی بچوں کی نظروں سے گزرے ہوئے ہیں۔ بچے بہت اچھی طرح سے ان کے خدوخال سے واقف ہیں اور اکثر بچے تو مور کو پالتے بھی ہیں۔ لہٰذا ایسے مانوس پرندوں یا

جانوروں کو موضوع بنانا صحیح ہے۔ کیونکہ اس سے ایک تو بچوں کو ان پرندوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے جن سے وہ مانوس ہوں۔ دوسرے وہ ان کے بارے میں مزید بہتر طور پر جان سکیں گے۔

قیوم نظر کے ہاں پرندوں اور جانوروں سے متعلق موضوعات جگنو، ڈبو، چوزے، چڑیا گھر دیکھا، چڑیاں، گلہری، بلی کے بچے، دو طوطے، تتلی، چڑیا کا گھونسلا، میری بلی اور ماں اور بچے ہیں۔

گھاس میں چمکے جو تارا سا
اور پکڑیں تو ہاتھ نہ آئے
اگلے پل میں انگارے سا
جلتا بجھتا اُڑتا جائے

(نظم، جگنو۔ بلبلے۔ ص:۱۱)

☆......☆......☆

بھورے کالے دھبوں والا
موٹا ڈبو ہم نے پالا
باغ میں دوڑے ساتھ ہمارے
اُچھلے کودے اور نہ ہارے

(نظم، ڈبو۔ بلبلے۔ ص:۱۶)

☆......☆......☆

مرغی انڈے دیتی ہے انڈوں کو پھر سیتی ہے
بیس اور اک دن جب گزریں انڈوں سے چوزے نکلیں
اُجلے اُجلے پیارے سے جیسے گالے روئی کے

(نظم، چوزے۔ بلبلے۔ ص:۲۸)

☆......☆......☆

مور چمکتے پَر والے		پنجرے شیر ببر والے
اور موٹا بندر دیکھا		ہم نے چڑیا گھر دیکھا

(نظم، چڑیا گھر دیکھا۔ بلبلے۔ ص:۳۶، ۳۷)

☆......☆......☆

نہ مارو بچاری		گلہری کے پتھر
اسی خوف سے تو		وہ بیٹھی ہے چھپ کر
یہ چوہے سے کچھ ہی		بڑی قد میں ہوگی

(نظم،گلہری۔ بلبلے۔ص:۴۵)

لکڑی کی الماری میں		جس کو ہم نے نہ کبھی بھولیں
جس کو الگ ہی رکھا ہے		جس کا اِک در ٹوٹا ہے
جس میں گھر کا گوڈر ہے		جس میں ہر شے گڑبڑ ہے
اس میں بلی کالی نے		نیلی آنکھوں والی نے
دے رکھے ہیں بچے چار		ننھے ننھے اور ہشیار

(نظم،گلہری۔ بلبلے۔ص:۴۵)

☆......☆......☆

طوطا ہے اِک پیڑ پہ بیٹھا		جس کی گردن میں ہے کنٹھا
اس ٹہنی سے اُس ٹہنی پر		جاتا ہے وہ لٹک لٹک کر
اِک طوطا پنجرے میں بھی ہے		یہ آواز اُس طوطے کی ہے
کھونٹی سے پنجرا لٹکا ہے		جس میں طوطا بند کیا ہے

(نظم، دوطوطے۔ بلبلے۔ص:۵۲)

☆......☆......☆

چڑیا نے جو گھونسلا بنایا		تنکوں سے پروں سے ہے سجایا
چھوٹے موٹے ہزاروں تنکے		اِک اِک کرکے اُٹھائے اُس نے

پھر جو ملا اُس پر کی قناعت
جس میں بھی ہو خوب ہے یہ بات

(نظم، چڑیا کا گھونسلا۔ بلبلے۔ص:۵۵)

یوں صوفی تبسم کی طرح قیوم نظر نے بھی اُنھی جانوروں کو موضوع بنایا ہے۔ جن سے بچوں کو خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ جو بچوں کے دیکھے بھالے جانور ہیں۔ جیسے جگنو صرف رات کے وقت نظر آتا اور چمکتا ہے۔ یہ ننھا سا کیڑا بچوں کے لیے بے پناہ دلچسپی اور حیرت کا مظہر ہے۔ کیونکہ اُس کا چمکنا اور بجھنا تجسس پیدا کرتا ہے اور بچے اکثر اس تجسس کے نتیجے میں جگنو کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ موضوع بچوں کا پسندیدہ ہے۔

پھر کتا ایسا جانور ہے جس سے بچے کافی مانوس ہوتے ہیں۔ کتا تقریباً ہر گھر میں پایا جانے والا جانور ہے۔ لوگ اسے پالتے ہیں اور جانور گھروں کی حفاظت کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ ایسے پالتو جانوروں سے بچوں کی کافی اچھی دوستی اور انسیت ہو جاتی ہے۔ یہ جانور ان بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے ۔ ان کے ساتھ بھاگتا دوڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ موضوع اور جانور بچوں کا جانا پہچانا بلکہ اچھا خاص دوستانہ موضوع ہے۔

چوزے پالنا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ رنگ برنگے، نازک چوزے آنکھوں کو بے حد لبھاتے ہیں۔ بچے ان ننھے منے جوڑوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چوزے بھی بچو ں سے خاصے مانوس ہوتے ہیں تو وہ بھی بچوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ بچے ان چوزوں کو دانے ڈالتے ہیں۔ ان کے رہنے اور حفاظت کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے موضوعات بچو ں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

چڑیا گھر جانا بچوں کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ عید ہو یا شب برات ہو۔ بسنت ہو یا کوئی آزادی کے جشن کا دن ہو بچوں کو ہر اہم موقع اور دن پر صرف اور صرف چڑیا گھر جانے کی دُھن سوار ہوتی ہے۔ وہ چڑیا گھر جانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ کیونکہ چڑیا گھر میں اُنہیں ہر طرح کے جانور ایک ہی جگہ پر دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے اور بچوں کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ایسے موضوعات بچوں کی خصوصی توجہ حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح گلہری بھی ایسا جانور ہے جو یہ گھر کے صحن میں ضرور موجود ہوتا ہے جن گھروں میں بڑے پودوں کی تعداد زیادہ ہو وہاں گلہریوں کو بہت قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ جانور منہ سے چوہے کی طرح ہے۔

لیکن دُم لمبی ہوتی ہے۔ لہٰذا بچے اس جانور کی نہ صرف پہچان رکھتے ہیں بلکہ اکثر وہ اس کو درختوں سے نیچے لانے کے لیے پتھروں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ بلی کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ بچے بلی سے خاصے مانوس ہوتے ہیں اور یہ موضوع بچوں کو خاصا پسند ہے۔ بلکہ بلیوں سے ہی بچوں کو خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔

چڑیاں اور طوطے ایسے پرندے ہیں۔ جو بچے شروع سے ہی اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ اکثر طوطے گھروں میں پالے بھی جاتے ہیں۔ لہٰذا بچے چڑیا طوطے سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہ ان کی آوازوں کو بہت اچھے سے پہچانتے بھی ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے پرندوں سے خاصی محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مانوس موضوعات بچوں کو بے حد پسند آتے ہیں۔

تتلیاں کسے اچھی نہیں لگتیں۔ قدرت نے ان تتلیوں کو بے حد حسین رنگوں کے بہترین امتزاج سے بنایا ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں کو دیکھنے میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بچوں کو تو ویسے بھی رنگ برنگی چیزیں بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ تتلیوں کو پکڑنا، ان کے پیچھے بھاگنا بچوں کو بے حد اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح اس طرح کے موضوعات بھی بچوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

۵۔ کھلونے

بچپن کی چند قیمتی اشیاء میں جو شے بچوں کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور جسے وہ کبھی دوسرے بچوں کو دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے، وہ ان کے کھلونے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے کھلونوں سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ وہ نہ تو ان کھلونوں سے کسی دوسرے بچے کو کھیلنے دیتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے کھلونوں کو کسی کو برباد کرنے یا توڑنے یا خراب کرنے دیتے ہیں۔ بچپن عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں بچے زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور اس بے فکری کی محدود عرصے پر محیط عمر میں کھلونے اُن کے سب سے بہترین دوست اور ساتھی ہوتے ہیں۔ وہ اُن سے ہر طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بچپن کے معصوم مسئلے وہ اپنے انہی دوست کھلونوں سے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ کھلونے تو بولتے نہیں۔ لیکن بچوں کو صرف ایک اچھا سننے والا ساتھی اور دوست چاہیے ہوتا ہے جو کھلونوں سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کھلونوں کی اسی اہمیت کے پیش نظر صوفی تبسم اور قیوم نظر نے انہیں کی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

صوفی تبسم کے ہاں کھلونوں سے متعلق یہ موضوعات ثریا کی گڑیا، گڑیا اور عذرا کی گڑیا ہیں۔

عذرا کی گڑیا
سوئی ہوئی ہے
گھنٹی بجاؤ
اس کو جگاؤ
توبہ ہے میری
میں نہ جگاؤں
وہ رو پڑے گی
مجھ سے لڑے گی

(نظم،گڑیا۔ص:۲۴)

☆......☆......☆

کبھی جب کبھی غل مچاتی ہے گڑیا
ہر اِک طرح سے دل لبھاتی ہے گڑیا
نہ پوچھو مزاج اُس کا نازک ہے کتنا
ذرا کچھ کہو منہ بناتی ہے گڑیا

(نظم،گڑیا۔ص:۱۰۷۔۱۰۸)

گڑیا بچیوں کی بہترین دوست اور ساتھی ہوتی ہے۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے دور نہیں کرتیں۔ اس کا بے پناہ خیال رکھتی ہیں۔ اُسے بچوں کی طرح ایک جاندار سمجھتی ہیں۔ یہ ایسا موضوع ہے جو بچوں کا پسندیدہ ہے۔ لہٰذا ایسے موضوعات بچوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

قیوم نظر کے ہاں کھلونوں کے موضوع پر نظم میرے کھلونے ہے۔

ٹین کی موٹر دوڑے فر فر
ناچیں مل کے ریچھ اور بندر
یہ نہیں لیکن میرے کھلونے
مٹی کے ہیں میرے کھلونے

طوطا ، مینا چڑیاں کوے
بھیڑیں ، گائیں گھوڑے ، ہاتھی
یہ ہیں میرے پیارے ساتھی

(نظم، میرے کھلونے۔ بلبلے۔ ص:۹۔۱۰)

بچوں کو صرف اپنے کھلونوں سے محبت ہوتی ہے۔ خواہ وہ مٹی کے ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ دوسروں کے کھلونوں سے اُنہیں کوئی اُنسیت نہیں ہوتی۔ خواہ وہ کتنے ہی اچھے ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ صرف اپنے کھلونوں کا خیال رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ موضوع ان کو بے حد پسند آتا ہے۔ کیونکہ کھلونے اُن کے ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں اور وہ ان کھلونوں کے ساتھ ہی بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن کیونکہ بچپن کا ایک بڑا حصہ انہوں نے ان کھلونوں کے ساتھ گزارا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کھلونوں اور ان کے متعلق نظموں سے انہیں خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔

اب صوفی تبسم اور قیوم نظر کی بچوں سے متعلق نظموں کے اُن موضوعات کا جائزہ لیا جائے گا جو ایک دوسرے سے تھوڑے مختلف ہیں۔ اس سے پہلے ان موضوعات کو دیکھا گیا جو دونوں کی نظموں کے حوالے سے مشترک تھے۔ اب موضوعات دیکھے جائیں گے وہ بھی بچوں سے متعلق ہی ہیں۔ لیکن دونوں نے خاصے مختلف موضوعات لیے ہیں۔ پہلے صوفی تبسم کی نظموں کے موضوعات دیکھے جائیں گے اور پھر قیوم نظر کی نظموں کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے گا۔

صوفی تبسم کی بچوں کے لیے نظموں کے موضوعات

ا۔ نرسری رائمز

صوفی تبسم نے بچوں کے لیے ہنسی مزاح پر جو نظمیں تخلیق کی ہیں، بچے انہیں پڑھ کر مسکراتے اور خوش ہوتے ہیں۔ صوفی تبسم نے بچوں کے لیے کچھ نظمیں نرسری رائمز کی طرز پر اُردو میں لکھی ہیں۔ بلکہ اکثر کو ترجمہ کر کے بھی اُردو میں ایسے ہی دے دیا ہے۔

انگریزی شاعری میں نرسری رائمز قدیم عرصے سے رائج اور مقبول ہیں اور ہر انگریزی دان بچہ رائمز سے آگاہ ہے اور رائمز کو بے حد پسند بھی کرتا ہے۔ صوفی تبسم نے اپنی انگریزی رائمز کی شہرت ومقبولیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسے ہی تجربات اُردو میں بھی کیے اور بلاشبہ اس میں خاصے کامیاب بھی رہے۔ نرسری رائمز

میں موجود نان سنس پوڑی کے نمونوں کو صوفی تبسم نے اُردو میں بڑی کامیابی سے آزمایا اور اپنایا ہے اور ان رائمز کے موضوعات اُردو میں ''ایک دو'' اور گنتی ہیں۔

ایک دو تین چار
آؤ مل کر بیٹھیں یار
پانچ چھ سات
سنو ہماری بات
آٹھ نو دس
بات ہماری بس

(نظم، گنتی۔ ص:۱۹)

ایک دو
میری بات سنُو
تین چار
چنے مسالے دار
پانچ چھ
تم نے کھائے تھے
سات آٹھ
قلب صاحب کی لاٹھ
نو دس
آم کا میٹھا رس

(نظم، ایک دو۔ ص:۳۱)

یوں نظموں کے حوالے سے یہ ہلکی پھلکی نظمیں ہیں اور موضوعات کے لحاظ سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بچوں کو بے حد پسند آنے والی نظمیں ہیں کیونکہ یہ ایسی نظمیں ہیں جو وہ ہر وقت خوشی خوشی پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ بچوں کو پڑھنے اور سیکھنے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ایسے موضوعات والی نظمیں سکھانے میں بہت مدگار ثابت ہوتی ہیں۔

۲۔ بادشاہت کے موضوعات

بچپن کے خوبصورت دور میں بادشاہ، ملکہ اور راجا، رانی سے متعلق بہت سی کہانیاں اور نظمیں بچوں کو سننے کو ملتی ہیں۔ وہ خود کا کہیں نہ کہیں ان کرداروں سے تعلق جوڑ لیتے ہیں۔ یعنی یہ کردار بچوں کے جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر صوفی تبسم نے ان موضوعات کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔

آ ؤ بچوں سُنو کہانی

ایک تھا راجا ایک تھی رانی
راجا بیٹھا بین بجائے
رانی بیٹھی گانا گائے
طوطا بیٹھا چونچ ہلائے

(نظم، راجا رانی۔ص:۲۳)

☆......☆......☆

آ ؤ بچو سُنو کہانی ایک تھا راجا ایک تھی رانی
دونوں اِک دن شہر میں آئے شہر سے اِک اِک گڑیا لائے
راجے کی گڑیا تھی ڈبلی رانی کی گڑیا تھی موٹی
راجے کی گڑیا تھی لمبی رانی کی گڑیا تھی چھوٹی

(نظم، راجا رانی کی کہانی، ص:۱۱۵،۱۱۶)

یہاں راجا رانی سے مراد کسی ریاست کے راجا رانی نہیں ہیں جو کہ بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں راجا رانی وہ ہیں جو خود گڑیاؤں سے کھیلتے ہیں یعنی ان کرداروں کو بچوں کے حوالے سے ہی پیش کریا گیا ہے اور یہ موضوعات اور کردار بچے بہت شروع سے سنتے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ایسے موضوعات بچوں کی خاصی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

۳۔ نصیحتی موضوعات

بچپن زندگی کا وہ حصہ جو نہایت بے فکری کا ہوتا ہے۔ انسان زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر صرف اپنی

چھوٹی سی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بچپن ہی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جس میں سکھائی گئی باتیں اور عادات ساری زندگی انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ انہیں وہ ساری زندگی نہیں بھولتا۔ لہٰذا بچپن کا یہ سنہری دور اگر بچوں کو زندگی گزارنے کے متعلق سکھانے اور سمجھانے میں گزر جائے تو اس سے بہترین بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس حوالے سے صوفی تبسم کے موضوعات مدرسہ، چلا چل، میں کیا بنوں گا اور بچو میرے بچو ہیں۔

کیوں نہ میں پائلٹ بن جاؤں
جگہ جگہ کی سیرا کراؤں
جا کر دیکھوں
روس، امریکا، انگلستاں
چین، عراق، عرب، ایران
کیوں نہ میں پائلٹ بن جاؤں

(نظم، میں کیا بنوں گا۔ ص:۱۳۶)

☆......☆......☆

کنارے چلا چل کہ دھارے چلا چل
مگر اپنے بل کے سہارے چلا چل
کہاں تک کسی پہ بھروسہ کرے گا
کہاں تک کسی کے سہارے چلے گا
جو چلنا ہے اپنے سہار چلا چل

(نظم، چلا چل۔ ص۱۳۲)

☆......☆......☆

خوبصورت پیارا پیارا مدرسہ
کتنا اچھا ہے ہمارا مدرسہ

(نظم، مدرسہ۔ ص:۱۴۰)

☆......☆......☆

آؤ بچو!

میرے بچو میرے پیارے آؤ

اپنی اپنی خوشیوں میں مجھے بھی ساتھ ملاؤ

آؤ

آؤ بچو! آؤ

(نظم، بچو میرے بچو۔ ص۱۴۴)

بچپن میں ہی بچوں کو اگر اپنے مدرسے سے محبت کا احساس دلایا جائے تو وہ اور زیادہ خوشی اور محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اسی مدرسے سے محبت بھی کرنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کو شروع سے ہی تعلیمی حوالے سے اپنے لیے خود کوئی سمت متعین کرنے دیں۔ یعنی بڑے ہو کر وہ جو بننا چاہتے ہیں اُسے ابھی سے اُن کے لیے سوچنے دیں اور ابھی سے اُنہیں اپنے بل بوتے اور اپنے سہارے پر کچھ کرنے کی تلقین کریں کہ اگر ابھی سے وہ سہارے تلاش کرنے کے عادی بن جائیں گے تو زندگی میں کبھی آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ لہٰذا یہ سب باتیں اُنہیں شروع سے ہی سمجھا دینا بہت ضروری ہیں۔ پھر یہ کہ بچے بڑے ہو کر کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کو وقت دینا بھول جاتے ہیں۔ اُنہیں ابھی سے اس بات کا احساس دلانا کہ جس طرح ماں باپ نے آپ کو پالا ہے اور اپنا وقت دیا ہے۔ اسی طرح اب ماں باپ کا بھی حق ہے کہ بچے انہیں اپنی مصروف زندگی میں سے وقت دیں۔ یہ باتیں بچوں کے اردگرد ہی گردش کرتی رہتی ہیں بلکہ اُن کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایسے اہم معاملات کو موضوعات کا رنگ دے دیا جائے تو بچوں کے لیے انہیں سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ لڑکوں کے پسندیدہ موضوعات

بچپن میں سب بچوں کو پیار سے منا یا مُنی کہا جاتا ہے اور یہ وہ نام ہے جو تقریباً ہر دوسرے گھر میں بولا اور سُنا جاتا ہے۔ دراصل ماں باپ بچوں کے پیار کے نام رکھ لیتے ہیں اور اپنی محبت کا والہانہ اظہار وہ ان ناموں سے کرتے ہیں۔ صوفی تبسم اس بات سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں اس سے متعلق موضوعات منے رولے، منا اور لڈو، منے کی ماں، منا، ٹیٹو، شریر لڑکا، ٹول مٹول، کھیرا، خوانچے والا اور کیا چیز لو گے ہیں۔ جن میں کہیں نہ کہیں منے نام کو گردش کرتے دکھایا گیا ہے۔ یعنی منا دراصل وہ کردار ہے جو ہر بچے میں

کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔

جیسے چڑیا گانا گائے　　جیسے مینا راگ سُنائے
جیسے بلبل بولے　　رو لے منے رو لے
ابا کو آواز نہ آئے　　امی بھی سننے نہ پائے
ہولے ہولے ہولے　　جتنا چاہے رو لے

(نظم، منے رو لے۔ص:۲۱)

☆......☆......☆

آہا آہا ہو ہو ہو
منا ایک اور لڈو دو
ایک لڈو منے نے کھایا
دوسرا منا دوڑا آیا
آہا آہا ہو ہو ہو
لڈو ایک اور منے دو

(نظم، منا اور لڈو۔ص:۳۰)

☆......☆......☆

منے نے کھیرا، چاقو سے چیرا
منے کی بہنیں، منے کے بھائی
ہر ایک آیا، یوں غل مچایا
منے نے کھیرا، چاقو سے چیرا

(نظم، کھیرا۔ص:۲۹)

☆......☆......☆

منے کی ماں نے انڈا اُبالا
ہنڈیا میں ڈالا دو منٹ گزرے

ڈھکنا اُٹھایا
انڈہ نہ پایا
چمچہ تھا ٹیڑیا

(نظم، منے کی ماں۔ص:۳۲)

لہٰذا یہ سب کردار بچوں کے اپنے اندر کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں۔ بچے ضدی بھی ہوتے ہیں ۔ ہر نیا کام کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے ہیں۔خواہ وہ اُلٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر چیز میں بڑوں کی طرح نوک پلک نکالتے ہیں۔ پھر اگر کوئی کام غلط ہو جائے تو اس پر روتے بھی ہیں۔ شرارتیں بھی کرتے ہیں۔ بڑوں کو بتائے بغیر اکثر گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔یعنی ہر طرح سے یہ موضوعات بچوں کے جانے پہچانے ہیں۔لہٰذا ایسی نظمیں اُن کو خاصا محظوظ کریں گی۔

۵۔ قومی رہنماؤں سے متعلق موضوعات

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے کون واقف نہیں ہے۔ پاکستان بنانے میں جو کردار ان دو عظیم رہنماؤں نے ادا کیے اور جو انتھک محنت اور جدوجہد کی اُس کو کون نہیں جانتا۔ بلکہ بڑوں کی نسبت بچے ان سے زیادہ محبت اور اُنسیت رکھتے ہیں۔ ان عظیم شخصیات سے متعلق بچوں کو معلومات ہونا بے حد ضروری بھی ہے تا کہ بچے بھی کل کو اُنہی کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے اپنے میدان میں خوب محنت اور جانفشانی سے کام کریں اور اس ملک وقوم کا نام روشن کریں۔صوفی تبسم کے ہاں ان عظیم شخصیات سے متعلق موضوعات اقبال کا خواب، قائداعظم اور اقبال ہیں۔

کتنا اچھا ہے کتنا پیارا ہے
اِک چمکتا ہوا ستارہ ہے
کس نے پہلے پہل یہ راہ دکھائی
کس نے خوشخبری ہم کو آ کے سنائی

جانتے ہو یہ کام کس کا تھ
ڈاکٹر اقبال نام جس کا تھا

(نظم، اقبال کا خواب، ص:۱۰۲)

☆......☆......☆

تیرے خیال سے دل شاداں ہمارا   تازہ ہے جاں ہماری دل ہے جواں ہمارا
تیری ہی ہمتوں سے آزاد ہم ہوئے ہیں   حوشیاں ملی ہیں ہم کو دل شاد ہم ہوئے ہیں

(نظم، قائداعظم، ص:۱۰۳)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کا خواب دیکھایا کہ جہاں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، اُنہیں ایک الگ ریاست بنا دیا جائے تو اس خواب کو تعبیر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے دی۔ آپ کی دن رات کی انتھک محنتوں اور کوششوں سے یہ ملک ہمیں ملا۔ یہ سب باتیں اور قصے بچے شروع سے ہی پڑھتے اور سنتے چلے آ تے ہیں۔ یعنی یہ موضوع ایسا ہے کہ جسے بچے بہت زیادہ محبت، عزت اور احترام دیتے ہیں۔ ان موضوعات سے متعلق نظمیں پڑھ کر اُن کی محبت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

۶۔ دوستی سے متعلق موضوعات

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رشتوں میں ماں، باپ، بہن، بھائی ہوتے ہیں۔ جن سے ہر ایک کو بے پناہ محبت ہوتی ہے اور ان رشتوں کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان رشتوں کے ساتھ جو ایک اور رشتہ بنتا ہے جو کہ انسان دنیا میں آنے کے بعد خود بناتا ہے۔ وہ رشتہ دوستی کا ہوتا ہے۔ سگے رشتوں کی طرح ہی مضبوط اور بے لوث محبت سے بھرپور یہ رشتہ دوستی کا ہوتا ہے اور ہر انسان کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے اور دوست بنانا انسان تب شروع کرتا ہے جب وہ بچہ ہوتا ہے۔ جب وہ اس دنیا میں پہلی دفعہ ماں باپ کے بغیر باہر قدم نکالتا ہے تو جو ہاتھ سب سے پہلے اُسے تھامتا ہے وہ اچھے دوست کا ہاتھ ہوتا ہے۔ صوفی تبسم زندگی کی اس خوبصورت حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دوستی کے حوالے سے ان کے ہاں نظمیں موجود ہیں۔ جن کے موضوعات ''آؤ آؤ سیر کو جائیں'' اور ''آؤ مل کر کام کریں'' ہیں۔

آؤ آؤ سیر کو جائیں باغ میں جا کر شور مچائیں
اُچھلیں کودیں ناچیں گائیں آؤ آؤ سیر کو جائیں
باغ میں تازے پھول کھلے ہیں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں
ہم بھی اپنا رنگ جمائیں آؤ آؤ سیر کو جائیں

(نظم، آؤ آؤ سیر کو جائیں۔ص:۸۸)

☆......☆......☆

آؤ مل کر کام کریں
آؤ مل کر کام کریں
مل کر پیدا نام کریں
آؤ مل کر کام کریں

(نظم، آؤ مل کر کام کریں۔ص:۱۳۹)

دوستوں کے ساتھ مل کر باغ کو جانا، وہاں کھیلنا کودنا، شور مچانا، بارش سے لطف اندوز ہونا، کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں بہانا، تتلیوں کے پیچھے بھاگنا۔ یہ سب وہ کام ہیں جو سب بچے اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ جہاں کھیل کود ساتھ ہو، وہاں اگر محنت بھی ساتھ مل کر کی جائے تو اس محنت سے سب کو فائدہ ہوگا۔ یوں دوستی ایسا موضوع ہے جو ہر بچے کو معلوم ہے یعنی دوست کا لفظ سنتے ہی اُن کے ذہن میں اُن کے دوست کا عکس اور چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ لہٰذا ایسا موضوع بچوں کے دل کے بہت قریب ہوگا اور وہ اسے بے حد شوق سے پڑھیں گے۔

۷۔ ٹوٹ بٹوٹ سے متعلق موضوعات

ٹوٹ بٹوٹ صوفی تبسم کی نظروں کا ایک مقبول ترین کردار اور موضوع ہے۔ اس سلسلے کی پہلی نظم ''ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ'' نظموں کے پہلے مجموعے ''جھولنے'' میں شائع ہوئی۔ پھر اس کے بعد ان نظموں کا سلسلہ جاری رہا۔ ٹوٹ بٹو بچوں کے لیے ایک جیتا جاگتا کردار اور موضوع ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو ہر بچے کے اندر کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ جب صوفی تبسم کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ بچے اس کردار سے خود کو بہت زیادہ جوڑتے اور قریب تر پاتے ہیں تو انہوں نے اس کردار کے لیے کافی زیادہ موضوعات بنائے۔ لیکن ہر موضوع

اپنی جگہ نرالا ہے اور کوئی ایک بھی موضوع اس کردار سے متعلق ایسا نہیں ہے جیسے بچے پسند نہ کریں یا پڑھتے نہ ہوں۔ بلکہ ٹوٹ بٹوٹ کے متعلق تمام نظمیں بچوں کی زبان زدِ عام ہیں۔ ٹوٹ بٹوٹ کا موضوع یا نام ذہن میں آتے ہی بچوں کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ آ جاتی ہے اور نظم کو پڑھنے کی بے تابی اس موضوع کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ ٹوٹ بٹوٹ کے متعلق موضوعات میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ 'ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے'، 'ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار'، 'ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار'، 'ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا'، 'ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی'، 'ٹوٹ بٹوٹ کے چوہے'، 'مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ'، 'ٹوٹ بٹوٹ بڑا ہشیار'، 'شعر کہنے لگا ہے ٹوٹ بٹوٹ'، 'ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے'، 'ٹوٹ بٹوٹ کا گھر'، 'ٹوٹ بٹوٹ کا ٹیلی فون' وغیرہ۔

ٹوٹ بٹوٹ کے دو مرغے تھے   دونوں تھے ہشیار
اک مرغے کا نام تھا گیٹو   اِک کا نام گٹار

(نظم، ٹوٹ بٹوٹ کے مرغے۔ ص:۴۱)

☆......☆......☆

اس موٹر کی شان نرالی   دو سیٹوں دو پہیوں والی
تین انجن اور ہارن چار   ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

(نظم، ٹوٹ بٹوٹ کی مٹور کار۔ ص:۴۳)

☆......☆......☆

ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار   لے کر آیا مرغے چار
ہر مرغے کی اِک اِک مرغی   ہر مرغی کے انڈے چار

(نظم، ٹوٹ بٹوٹ گیا بازار۔ ص:۵۱)

☆......☆......☆

ایک بڑا ہے اِک چھوٹا ہے   اِک دُبلا ہے اِک موٹا ہے
دو کہتے ہیں اس کو بھیا   دو کہتے ہیں اس کو بھائی
ٹوٹ بٹوٹ کی شامت آئی   ٹوٹ بٹوٹ کے چار ہیں بھائی

(نظم، ٹوٹ بٹوٹ کے بھائی۔ ص:۵۴،۵۳)

☆......☆......☆

آج چپ چاپ سب کھڑے ہو جاؤ — شان سے آ رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ
آج کوئی نہ اور بات کرو — مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ
گھر سے باہر نکل تو آیا ہے — کیا کرے گا وہ مدرسے جا کر
دل میں گھبرا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ — مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ

(نظم، مدرسے جا رہا ہے ٹوٹ بٹوٹ۔ص:۶۶-۶۹)

☆......☆......☆

اب ٹوٹ بٹوٹ کی بات نہ کر — اب ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے
اب چھوٹوں کا تو ذکر ہی کیا — اب بڑے بھی سہمے رہتے ہیں
اب جو وہ منہ سے بات کرے — سب جی ہاں جی ہاں کہتے ہیں
اب ٹوٹ بٹوٹ کلرک نہیں — اب ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے

(نظم، اب ٹوٹ بٹوٹ اِک افسر ہے۔ص:۸۶)

ٹوٹ بٹوٹ کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ بچوں کا پسندیدہ اور مقبول ترین کردار ہے۔ وہ اس کردار کو کہیں نہ کہیں خود میں یا اپنے کسی بھائی میں یا دوست میں تلاش کر لیتے ہیں یعنی وہ اس کردار کو بہت زیادہ خود سے منسوب کر لیتے ہیں۔لہٰذا اس کردار سے متعلق جتنے بھی موضوعات ہیں۔ وہ بچوں کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ کیونکہ ٹوٹ بٹوٹ ایک جیتا جاگتا انسان ہے تو پھر اس کے متعلق تمام موضوعات بھی بچوں کو حقیقی ہی لگتے ہیں۔ لہٰذا اس کردار اور موضوع کے ذریعے بچوں کو بہت کچھ سکھایا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

اب یہاں پر قیوم نظر کی نظموں کے موضوعات کا جائزہ لیا جاۓ گا کہ انہوں نے بچوں کی نفسیات یا عمر کے لحاظ سے کس طرح کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ پہلے قیوم نظر اور صوفی تبسم کے قدرے مشترک موضوعات کا جائزہ لیا گیا تھا لیکن اب غیر مشترک موضوعات کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ موضوعات بچوں کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں۔

ا۔ باغ اور باغیچوں کے متعلق موضوعات

رنگ برنگ پھول اور طرح طرح کے پودے آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں اور بچوں کو بھی ان پھولوں

اور پودوں سے بہت لگاؤ ہوتا ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی مختلف پودوں کی پہچان ہونی چاہیے اور انہیں اُن پودوں کی خصوصیات کے متعلق بھی معلومات ہونی چاہیے کہ کون سے پودے صرف پھول دیتے ہیں ؟ کون سے پھل دیتے ہیں؟ اور کون سے پودے سدا بہار ہوتے ہیں۔ قیوم نظر کے ہاں پودوں سے متعلق موضوعات ''پیڑ لگائیں''، ''چنبلی''، ''پودے اور سرو'' ہیں۔

پیڑ لگائیں ہم آموں کے
امرودوں کے آلوچوں کے
خوبانی کے یا سیبوں کے
جو بھی چاہیں پیڑ لگائیں
پانی دینا ہم نہ بھلائیں

(نظم، پیڑ لگائیں۔ بلبلے۔ ص:۲۶،۲۷)

☆......☆......☆

مانو میری بات سہیلی
پھولوں میں ہے پھول چنبلی
مجھ کو اس پر فخر رہے گا
پھول چنبلی میرے وطن کا

(نظم، چنبلی۔ ص:۳۰)

☆......☆......☆

نہر پر وہ دیکھنا پیڑ سرو کا لگا
کس قدر بلند ہے اور سیدھا بانس سا
ایک ہی تنا ہے جو سربز چلا گیا

(نظم، سرو۔ بلبلے۔ ص:۶۳)

بچوں کو ہر نئی اور انوکھی چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور پھر وہ خود کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کے لیے ہر اس نئی چیز کے متعلق بے شمار سوالات کرتے ہیں۔ اسی طرح نئے نئے اور انوکھے پھل دار اور پھول دار پودے

بھی اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ بچوں کو اس بات کا بڑا تجسس ہوتا ہے کہ جو مختلف پھل وہ کھاتے ہیں وہ آ خر کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے موضوعات سے متعلق نظمیں بچوں کو بے حد متوجہ کرتی ہیں اور وہ ایسی نظمیں پڑھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ ایسے موضوعات ہیں جو بچوں کے دیکھے بھالے ہیں اور ایسی نظمیں اُن کی معلومات میں بھی اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

۲۔ کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق موضوعات

کھانا پینا کسے پسند نہیں اور بچوں کو تو خصوصی طور پر کھانے پینے سے لگاؤ ہوتا ہے۔ اُنھیں بہت سارا کھیلنا اور پھر بہت سارا کھانا پسند ہوتا ہے۔ اس کھانے پینے میں گھر کے کھانے کے علاوہ پھل اور سبزیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ موسمی پھل بھی بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ قیوم نظر نے بچوں کی ایسی پسندیدگی کے پیش نظر کھانے پینے سے متعلق نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے موضوعات دال چنے کی، مولی، موسم آموں کا، کچالو، کریلے، خربوزے ہیں۔

دال چنے کی　　　بڑے مزے کی
بھڑ بھوجن نے　　　ہم کو کھلائی
بھڑ بھوجن نے　　　دال چنے کی
گرم اور خستہ　　　ہم کو کھلائی

(نظم، دال چنے کی۔ بلبلے۔ ص:۱۹)

☆......☆......☆

سفید مولی　　　بڑی نہ چھوٹی
اِدھر سے پتلی　　　اُدھر سے موٹی

(نظم، مولی۔ بلبلے۔ ص:۲۳)

گنجے ہوں یا بالوں والے　　　بوڑھے ہوں یا لڑکے بالے
پکے پکے، میٹھے میٹھے　　　کھائیں آم سبھی چُن چُن کے
ذکر کریں ہر دم آموں کا
آیا ہے موسم آموں کا

(نظم، موسم آموں کا۔ بلبلے۔ ص:۴۷)

اوپر دی گئی نظموں میں مختلف سبزیوں اور پھلوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں بچے بڑے سبھی شوق سے کھاتے ہیں۔ مولی ایسی سبزی ہے جو ہمیشہ ہے کچی کھائی جاتی ہے۔ بچے اسے بڑے شوق سے نمک مرچ لگا کر کھاتے ہیں۔ اسی طرح آم ایسا پھل ہے جو خود بھی پھلوں کا بادشاہ ہے اور سب اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً بچے آم بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اسی طرح خربوزے گرمیوں کا میٹھا پھل ہیں۔ جسے بچے بڑے سبھی بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ امرود بھی بچوں کا بے حد پسندیدہ پھل ہے۔ لہٰذا یہ تمام وہ پھل اور سبزیاں ہیں جو بچوں کی دیکھی بھالی ہیں۔ وہ ان کے رنگ اور ذائقے سے بہت اچھی طرح سے واقف ہیں۔ لہٰذا ایسے ذائقے دار موضوعات بچوں کو بے حد پسند آتے ہیں۔

۳۔ رشتوں پر مبنی موضوعات

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو بہت سارے رشتے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جیسے ماں، باپ، بہن، بھائی وغیرہ۔ ان رشتوں سے ہی اس کی پہچان ہوتی ہے اور انہی رشتوں سے اس کی زندگی میں رنگ ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ ان خونی رشتوں کے علاوہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے جو ہر اچھے بُرے وقت میں اُ کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ رشتہ دوستی کا ہوتا ہے۔ اسی رشتے میں روٹھنا، منانا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی اس رشتے کی مضبوطی کو کم نہیں کر پاتیں۔ یہ تمام رشتے اور ان کی موجودگی انسان کی زندگی میں رنگینیوں کی علامت ہیں۔ زندگی کے سارے رنگ انہی خوبصورت رشتوں کی بدولت ہوتے ہیں۔

قیوم نظر کے ہاں ان خوبصورت رشتوں کے متعلق خوبصورت موضوعات میری امی، میری بہن، شکایت، دوست ہے میرا اور سالگرہ ہیں۔

صاف اور ستھرے　　　اُجلے　اُجلے
پیارے　پیارے　　　اچھے　اچھے
پہناتی　ہے　　　مجھ　کو　کپڑے
کتنی　پیاری
میری　امی

(نظم، میری امی۔ بلبلے۔ ص:۱۲)

☆......☆......☆

میری بہن پنکی — مجھ سے ذرا لمبی
سوکھی لکڑی سی — ہوتی نہیں موٹی

(نظم، میری بہن۔ بلبلے۔ ص:۱۸)

☆......☆......☆

دوست ہے میرا نیک اختر — اُس کا ہمارے قریب سے گھر
دوست ہے میرا بسم اللہ — لڑکے اس کو کہیں بلاّ
دوست ہے میرا چھم بھی بڑا — رہتا ہے صاف اور ستھرا

(نظم، دوست ہے میرا۔ بلبلے۔ ص:۴۸)

ماں وہ عظیم ہستی اور رشتہ ہے۔ جس سے بچہ سب سے پہلے مانوس ہوتا ہے اور سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس رشتے کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ بچہ جتنا مرضی پریشان ہو ماں کی ایک نظر پڑتے ہی اُس کے سارے دُکھ ختم ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا پُرسکون ترین مقام ماں کا آغوش ہے۔ بچہ ماں سے الگ ہو کر اور ماں بچے سے الگ ہو کر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ مائیں بچوں کو پیدا کرتی ہیں، پالتی ہیں۔ اُن کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری ماں پر ہوتی ہے۔ وہ ہر طرح سے اپنے بچے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اور بچہ بھی اپنی اماں سے اپنی ہر مشکل کا حل پوچھتا ہے اور بچے کو پُرسکون دیکھ کر ماں بھی خوش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ موضوع بچوں کی زندگی ہے۔ اسی طرح بھائی بہن کا رشتہ بھی بے حد خوبصورت رشتہ ہے۔ لڑنا جھگڑنا، روٹھنا منانا ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ انسان کا سب سے پہلا دوست اس کا بھائی یا بہن ہوتا ہے اور بہن بھائی کی یہ نوک جھونک زندگی کو اور بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔ اسی طرح دوست بھی ایک بے حد خوبصورت رشتہ ہے۔ دوستوں سے ملنا جلنا، کھانا پینا، کھیلنا کودنا سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام موضوعات ایسے ہیں جو بچوں کی زندگی میں اُن کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ایسے موضوعات سے بچے بے حد مانوس ہوتے ہیں اور ان کی خصوصی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

۴۔ میلوں اور کھیلوں کے متعلق موضوعات

میلے دیکھنا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ میلوں میں مختلف کرتب بچوں کو حیران کرنے کے لیے کافی

ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف کھیل بھی ہوتے ہیں جو بچے کھیلتے ہیں۔ بلکہ بہت سارے کھیل بچے خود سے ایجاد کرتے ہیں۔ بچے ان کھیلوں سے بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ قیوم نظر کے ہاں ان سے متعلق موضوعات بچہ نٹ کا، میلہ شالامار کا، بلبلے، کبڈی، لیٹرے، چھٹی اور بچے ہیں۔

سر پہ رکھے رس کا مٹکا
ناچنے آیا باندھ کے پٹکا
بچہ نٹ کا

(نظم، بچہ نٹ کا۔ بلبلے۔ ص:۱۷)

☆......☆......☆

کھیتوں سے مُنھ موڑ کے
سب کاموں کو چھوڑ کے
دہقانوں کو ٹولیاں
گاتی آئیں بولیاں
اور منائیں شوق سے
میلہ شالا مار کا

(نظم، میلہ شالامار کا۔ بلبلے۔ ص:۳۴)

☆......☆......☆

باندھ کے ڈھینگر بانس کے اُوپر
ہاتھ میں تھامے دوڑیں لڑکے
کھیل یہ کیا ہے بھول کے ہر شے
بن کے لٹیرا بھاگے پھرنا

(نظم، لٹیرے۔ بلبلے۔ ص:۳۱)

آؤ بنائیں بلبلے
مل کر اُڑائیں بلبلے

(نظم، بلبلے۔ بلبلے۔ ص:۲۱)

لہٰذا میلوں میں مختلف کرتب دکھاتے بچے خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں ۔ کیونکہ اتنی چھوٹی عمر میں مشکل کرتب دکھانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ ساتھ ہی میلوں میں کھانے پینے کی بے شمار اشیاء ہوتی ہیں جو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور جھولے لے کر بھی خوب لطف اُٹھاتے ہیں۔ پھر کھیلوں میں پتنگ بازی بچوں کا محبوب ترین کھیل ہے۔ جس میں پتنگ اُڑانے سے زیادہ کٹی پتنگ پکڑنے پر نظر رکھی جاتی ہے۔ یہ کھیل تھوڑا خطرے والا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے دوری ہی بہتر ہے۔ بلبلے بنانا اور اُڑانا ایسا کھیل ہے جس سے نہ تو کوئی جانی نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس میں بچوں کی لڑائی کا خدشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کھیل اور یہ میلے بچوں کی زندگی کا حصہ ہیں اور ایسے ہی موضوعات بچوں کو زندگی سے مزید قریب تر کرتے ہیں۔

۵۔ مختلف و متفرق اشیاء کے متعلق موضوعات

اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد بچہ بہت سی نئی اور حیران کن چیزوں کو دیکھتا ہے۔ جب تک تو بچہ بول نہیں سکتا تب تک وہ ان اشیاء کو صرف گھورتا ہے۔ لیکن پھر جیسے ہی وہ بولنے لگتا ہے اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں ہر نئی اور انوکھی شے کے متعلق ڈھیر سارے سوالات کرتا ہے اور پھر جب تک وہ ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہو جاتا تب تک اُس کے یہ سوالات جاری رہتے ہیں۔ ویسے بھی دنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں نئی اور انوکھی اشیاء کے بارے میں جاننا اور انہیں تسخیر کرنا ہی سب سے بڑا مقصد ہے۔ بڑوں کو خیرہ کرنے والی اشیاء اور نظارے اور ہوتے ہیں۔ جبکہ بچے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔

اسی بات کے پیش نظر قیوم نظر نے اپنی نظموں میں کچھ ایسی اشیاء کا تعارف دیا ہے جو بچوں کے حوالے سے انوکھی ہیں۔ ان سے متعلق موضوعات آئینہ، ٹی وی، نئی کتاب، جھولا، تانگا، اخبار ہیں۔

روتا ہو یا ہنستا چہرا
جیسا بھی ہو ناک اور نقشہ
سب کچھ اُس کے مُنھ پر کہنا

آئینے کا

شیوہ دیکھا

(نظم، آئینہ۔ بلبلے۔ ص:۲۸)

☆......☆......☆

لکڑی کا ہے ایک ڈبا سا

ایک طرف سے اِک شیشہ سا

اُبھرا اُبھرا چمکیلا سا

(نظم، ٹی وی۔ بلبلے۔ ص:۲۹)

☆......☆......☆

آپ نے جو دیکھی تھی وہ کتاب میری تھی

میں نے خود دیے تھے دام اور نئی خریدی تھی

میں سنبھال کر رکھوں جب کتاب کو پڑھ لوں

(نظم، نئی کتاب۔ بلبلے۔ ص:۱۹)

☆......☆......☆

پہلے ہولے ہولے جھولوں

کپڑے پھولیں ، میں بھی پھولوں

پھر میں لٹک کر اُس کو چُھولوں

مجھے جو چُھونے آئے

کوئی مجھے جھلائے

(نظم، جھولا۔ بلبلے۔ ص:۳۳)

☆......☆......☆

گھوڑے کی چھاتی ہلتی ہے　　ساتھ ہی گردن بھی ہلتی ہے
دُم ہلتی ہے سر ہلتا ہے　　اِنجر پنجر سب ہلتا ہے
اور تانگا چلتا جاتا ہے
اور تانگا چلتا جاتا ہے

(نظم، تانگا۔ بلبلے۔ ص:۴۲)

بچہ جب بہت چھوٹا ہوتا ہے تو اگر اُسے آئینے کے سامنے لے جایا جائے تو پہلے تو تھوڑی دیر کو وہ حیراں ہوتا ہے اور پھر آئینے میں ایک اور بچہ دیکھ کر اس سے کھیلنے لگتا ہے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے۔ آئینے سے متعلق اسکے خیالات بدلتے ہیں کہ آئینہ دراصل اُسی کا عکس دکھا رہا ہوتا ہے اور ویسے بھی آئینہ دیکھنا بچوں کو خاصا پسند ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ایسا موضوع ہے جس سے بچے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور اس سے خوب محظوظ بھی ہوتے ہیں۔

پھر ٹی وی ایک بہت خوبصورت ایجاد ہے۔ اس سے سب سے زیادہ پیار بچے ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس پر اُنہیں اپنی پسند کے پروگرام دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ساتھ ہی وہ حیران بھی ہوتے ہیں کہ اتنے چھوٹے سے ٹی وی پر اتنی بڑی بڑی چیزیں کیسے سما جاتی ہیں۔ اور ویسے بھی ٹی وی ہر گھر میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اس موضوع سے بچوں کی جان پہچان پُرانی ہے اور دلچسپی بھی بے حد زیادہ ہے۔

اسی طرح رنگ برنگی کتابیں پڑھنا اور دیکھنا بچوں کو بے حد بھاتا ہے اور وہ شروع سے ہی تصویری کتابوں کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کتاب سے متعلق موضوع بھی بچوں کی دلچسپی کا ہی ہے۔

جھولا جھولنا کس بچے کو پسند نہیں ہے۔ نئے نئے اور بڑے بڑے جھولے جھولنا بچوں کا خواب ہوتا ہے۔ اسی لیے بچے باغوں کا رُخ کرتے ہیں کہ اُنہیں وہاں جھولے مل جاتے ہیں۔ بچے شروع سے ہی جھولوں کے عادی اور شوقین ہوتے ہیں۔ اس لیے جھولوں سے متعلق موضوعات بچوں کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ ایسے ہی موضوعات بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

سڑکوں پر ہر وقت رونق ہوتی ہے۔ مختلف قسم کی سواریاں اور لوگ ہر وقت سفر میں ہی ہوتے ہیں۔ سائیکل، رکشے، گاڑیاں، موٹر سائیکلیں ٹرک، بسیں وغیرہ ۔ یہ سب سڑکوں پر ہر وقت رواں دواں ہوتے ہیں اور

بچے انہیں بہت غور سے جائزہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح چلتے ہیں۔ خاص طور پر تانگا تو خصوصی توجہ کا مرکز ہوتا ہے جس میں ایک گھوڑا، اتنی ساری سواریوں کو کھینچ رہا ہوتا ہے۔ یہ موضوع بھی بچوں کی دلچسپی کا ہے۔

لہٰذا قیوم نظر نے جس قدر بھی موضوعات لیے ہیں وہ بچوں کے حوالے سے بے حد متاثر کن ہیں اور بچوں کی دلچسپی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ کیونکہ اگر موضوع ہی بچوں کے لیے غیر اہم اور غیر دلچسپ ہوگا تو اُس نظم سے حاصل ہونے والا پیغام اور سبق بچوں پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑے گا۔

قیوم نظر کی نظموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی عمر کے حوالے سے نظمیں لکھی ہیں۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے اُن کی نظمیں ''آلوچے'' اور ''گلگلے'' کی صورت میں موجود ہیں کیونکہ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب بچہ اپنے شعور کی ابتداء میں پرندوں، جانوروں، تتلیوں، رنگوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ لہٰذا قیوم نظر نے اسی ابتدائی عمر کے معصوم ذہن کے لیے ایسی ہی نظمیں تحریر کی ہیں اور ان نظموں میں زیادہ تر موسیقیت پیدا کرنے کے لیے (کہ وہ بچوں کی دلچسپی کا باعث بنے) مختلف جانوروں کی آوازوں سے بہت کام لیا گیا ہے۔ یا ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ جن کا لغات میں کوئی وجود یا مطلب نہیں ہے۔ لیکن چونکہ وہ بچوں کو پسند ہیں تو بچوں کے حوالے سے ہی اُن الفاظ کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ بلکہ اکثر ایسے الفاظ کو تو موضوع کے طور پر بھی استعمال میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ اگر بچوں کو موضوع متوجہ کرنے والا ہوگا۔ تبھی بچے اُس نظم کو بھی پسند کریں گے۔

گلگلے میں شامل موضوعات

بچپن کے اس ابتدائی حصے میں ذہن بہت معصوم اور صاف ہوتے ہیں یعنی بچے کے ذہن میں کسی چیز کا ابھی کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر شے کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب خواہ وہ کوئی جانور ہو، کوئی کھلونا ہو، کوئی پرندہ ہو یا گھر کی آرائش کی کوئی بھی شے ہو، بچے کے لیے ہر چیز نئی ہی ہوتی ہے اور ہر چیز کو دیکھنے کا انداز بھی نیا اور نرالا اور بڑوں سے ہٹ کر (جُدا) ہوتا ہے۔ لہٰذا قیوم نظر نے موضوعات بھی نرالے ہی لیے ہیں لیکن یہ تمام موضوعات ایسے ہیں جو بچوں کے دیکھے بھالے بھی ہیں اور بچوں کے معصوم ذہنوں اور سمجھ بوجھ کے مطابق بھی ہیں۔

ان موضوعات میں 'ٹکڑوں ٹوں'، 'کبوتر'، 'بلی سکول کو'، 'اگڑم بگڑم'، 'مٹھائی کھائی'، 'جادو کا پنجرا'، 'کاٹھ کا گھوڑا'، 'ریل گاڑی'، 'چڑیا اور کوا'، 'بھینس پہ کوا'، 'میری سائی کل'، 'بلبل کا بچہ'، 'کالے بادل'، 'گل گلے'، 'پری اُڑ گئی'، 'سفید بطخیں'، 'میری گڑیا'، 'میرا لٹو'، 'گھڑی' اور 'ٹین کا بندر' شامل ہیں۔

ایک نظر ان موضوعات کو دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تمام موضوعات بچوں کے ذہنوں اور سمجھ بوجھ کے حوالے سے بہترین ہیں۔ ان موضوعات کو کسی بچے کے سامنے دُہرا کر دیکھیں۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں گی اور وہ فوراً سے ان نظموں کو پڑھنے یا سننے کی ضد کرنے لگے گا۔

تمام نظموں کے موضوعات ننھے منے بچوں کے ذہنوں کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً مرغا، کبوتر، چڑیا، کوا، بلبل، بطخیں، غرض یہ تمام پرندے ایسے ہیں جن کو بچوں نے اپنے گھر میں یا اپنے اردگرد کے ماحول میں ضرور دیکھا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ان سے کافی مانوس ہوتے ہیں بلکہ مرغی، کبوتر، بطخیں تو اکثر گھروں میں پالے جاتے ہیں۔ اسی طرح کوا اور چڑیا ایسے پرندے ہیں جو گھروں کی دیواروں پر اکثر بیٹھے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بچے ان سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کوا کس طرح موقع پا کر اُن سے روٹی چھین کر لے جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تمام موضوعات خصوصی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے کاٹھ کا گھوڑا، ریل گاڑی، مری سائی کل، میرا لٹو یہ سب کھلونے بچوں کے انتہائی پسندیدہ بھی ہیں۔ کیونکہ جو کھولنے والی چابی سے چلتے ہوں۔ اُن سے بچے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی انتہائی جانے پہچانے موضوعات ہیں۔ پھر اگر جانوروں کی طرف آ جائیں تو اُن سے متعلق موضوعات بھینس اور بندر وغیرہ ہیں۔ بھینس بھی پالتو جانور ہے۔ اس کا دودھ پینے کے لیے استعمال میں آتا ہے اور بندر، چڑیا گھر، جنگلوں میں رہتا ہے۔ لیکن اکثر بندر کا تماشا دیکھنے بچے گلی محلوں میں نکل جاتے ہیں اور بندر سے جو پہلی بات ان کے ذہن میں آتی ہے۔ وہ بندر کا تماشا دیکھنا ہی ہے۔ بندر اپنی سکھائی گئی مختلف حرکات سے بچوں کو محظوظ کرتا ہے تو یوں یہ موضوع بھی خاصا پسندیدہ ہے۔ لہٰذا اس چھوٹی سی کتاب میں موجود تمام موضوعات بچوں کی پسند اور سمجھ بوجھ کے مطابق ہیں۔

اسی طرح ''آلوچے'' میں بھی قیوم نظر نے خوبصورت نظموں کی ایک حسین دنیا سجا کر رکھی ہوئی ہے بلکہ ایک عجائب کدہ تیار کر رکھا ہے۔ جس میں پُراسرار بھید ہیں جو بچوں کو کبھی حیران اور کبھی مسرور رکھتے ہیں۔ اس میں بے شمار دیکھنے کی چیزوں میں یعنی ایسے حسین موضوعات ہیں جو بچوں کو بے حد خوش کر دیتے ہیں۔

لہٰذا نظموں کی اس حسین وادی کے ان موضوعات میں 'دن اور رات'، 'بھولی چڑیا'، 'چھومنتر'، 'پتنگ'، 'گوگوگو'، 'کبوتر'، 'لڑائی'، 'بسکٹ'، 'مرغا'، 'ہاتھی'، 'لالو'، 'تارے'، 'جامن'، 'آندھی'، 'ٹیں میں قیں'، 'میں کھاؤں گا'، 'جادو کی پڑیا'، 'میرا جوتا'، 'گانا'، 'انجن'، 'نظم سنائیں' شامل ہیں۔

آلوچے میں شامل نظموں کے موضوعات بھی بچوں کے دیکھے بھالے ہیں۔ یعنی یہ موضوعات کوئی ایسے نہیں ہیں جو بچوں کی سمجھ سے بالاتر اور اُنہیں سمجھنے میں دشواری ہو بلکہ یہ تمام موضوعات خود بچوں کے رہن سہن سے متعلق ہیں۔ جیسے دن اور رات کا یہ مربوط نظام سب کے سامنے ہے۔ بچوں کو بھی اس کا بھرپور احساس ہے۔ وہ بھی اپنی زندگی کی مصروفیات اور روزمرہ زندگی اسی دن اور رات کے تابع ہو کر گزارتے ہیں۔ اسی طرح مرغا، چڑیا، کوئل، کبوتر، ہاتھی، ریچھ یہ سب جانور اور چرند پرند ایسے ہیں جن سے بچے اچھے خاصے مانوس ہیں اور اچھی خاصی پہچان رکھتے ہیں۔ پھر اگر کھانے پینے والے موضوعات کی طرف آ جائیں تو بسکٹ بچوں کے ہمیشہ کے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ انہیں یہ کہیں بھی اور کبھی بھی کھانے کو مل جائیں تو خوشی سے اُن کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اسی طرح جامن، خربوزے، آلوچے، آلو بخارہ ایسے پھل ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی جو موسمی پھل ہیں، وہ بچوں کو بہت پسند ہوتے ہیں اور وہ انہیں بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

چھومنتر جادو کی پڑیا بچوں کے حوالے سے بڑے دلچسپ موضوعات ہیں۔ بہت بچپن سے ہی بچوں کو جادوگروں سے جادو دیکھنے اور مختلف کرتب دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے بلکہ اکثر بچوں کی سالگرہ کے موقعوں پر ایسے جادوگری کے پروگراموں (Magic Shows) کا خصوصی انتظام کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کو اچھی تفریح کی جا سکے۔

اس کے علاوہ میرا جوتا اور میری گڑیا ایسے موصوعات ہیں جو بچوں اور بچیوں سے ہی متعلق ہیں۔ بچوں کو اپنے کھلونوں، جوتوں اور کپڑوں سے خصوصی محبت بلکہ غیر معمولی حد تک محبت اور لگاؤ ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کھلونے، کپڑے، جوتے سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں اور کسی دوسرے کو انہیں استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا تمام کے تمام موضوعات خصوصاً بچوں کی دلچسپی کے ہیں جن کو پڑھ کر بچے کبھی بھی اُکتائیں گے نہیں بلکہ ہمیشہ خوشی سے پڑھیں گے۔

قیوم نظر نے ''بچوں کا لاہور'' کے عنوان سے لاہور کے اہم اور تاریخی مقامات اور عمارات کے متعلق نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے بچے صرف اپنے تاریخی ورثے سے واقف ہوں گے بلکہ اُنہیں ان عمارات اور مقامات کے اہمیت کا بھی اندازہ ہوگا۔ قیوم نظر اُن مقامات یا عمارات کے ناموں کو ہی موضوعات بنایا ہے جس سے صرف نظم کا نام پڑھنے سے ہی فوراً بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ان نظموں کو پڑھنے سے بچوں میں ان جگہوں کو دیکھنے کا شوق بھی پیدا ہوگا اور ساتھ ہی وہ اپنے اردگرد موجود ان تاریخی ورثوں کی حفاظت کا بھی

خیال رکھیں گے۔ ان نظموں کے موضوعات ’ریلوے سٹیشن‘، ’دروازے‘، ’اقبال کا مرقد‘، ’قلعہ‘، ’بادشاہی مسجد‘، ’مینارِ پاکستان‘، ’راوی کا نیا پل‘، ’جہانگیر کا مقبرہ‘، ’مزار داتا گنج بخش‘، ’انارکلی‘، ’گورنمنٹ کالج‘، ’پنجاب یونیورسٹی‘، ’عجائب گھر‘، ’چڑیا گھر‘، ’گلستانِ فاطمہ‘ اور ’شالامار باغ‘ ہیں۔

یوں ’’بچوں کا لاہور‘‘ میں تحریر تمام نظموں کے موضوعات تاریخی عمارات اور جگہوں کے متعلق ہیں۔ یہ موضوعات بچوں کے لیے معلوماتی حوالے سے بہت اہم ہیں۔ جیسے ’’ریلوے سٹیشن‘‘ اکثر بچوں نے دیکھا ہوگا لیکن اُس کے متعلق یوں نظم کی صورت میں پڑھنا انوکھا اور دلچسپ تجربہ ہوگا۔ اسی طرح مزار اقبال اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کے متعلق موضوعات عقیدت اور احترام سے بھرپور ہیں۔ ان کو پڑھنے سے مذہبی اور قومی خدمات میں مزید اضافہ ہوگا۔ پھر گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے متعلق نظمیں بچوں کو ان علمی اداروں کے زیادہ بہتر طور پر جاننے کا موقع دیں گی اور علم حاصل کرنے کی لگن پیدا کریں گی۔ پھر انارکلی بازار موضوع پر نظر پڑتے ہی بازار کی رونقیں نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں اور بازاروں سے بچوں کو ویسے بھی گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی طرح چڑیا گھر کا موضوع بچوں کا سب سے پسندیدہ اور جانا پہچانا موضوع ہے۔ وہ جگہ جہاں اُنہیں تفریح کے لیے تمام جانور دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ پھر شالامار باغ اور گلستانِ فاطمہ کا ذکر بھی ان نظموں میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ تمام کے تمام موضوعات بچوں ہی کی دلچسپی کے ہیں اور ان کے پڑھنے کے لیے ہیں۔

موضوع کے انتخاب کی طرح الفاظ اور اندازِ بیان کی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ بلکہ بچوں کے ادب کے لیے یہ ضروری عناصر قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کا سہارا لے کر ہم ننھے قاری کے دیدہ و دل کو منور کر سکتے ہیں اور اس کے اندر صحیح ادب کا ذوق بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ انہی الفاظ اور انداز و بیان کی مدد سے بچوں سے دوستی کی جا سکتی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بچوں کا ذوق بڑا ہی اعلیٰ اور نفیس ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی بہت اچھی چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ کھانے پینے اور پہنے اوڑھنے میں عمدہ اشیاء کی تلاش ان کے ذوق کی دلیل ہے۔ بُری اور بے رُوح شے ان کے جی کو کسی حال میں بھی نہیں بھاتی۔ ان کی زبان کو چٹ پٹی چیز کا چسکا لگ جاتا ہے۔ وہ ایسی غذا کے شوقین ہوتے ہیں جو خوب مزے دار اور میٹھی ہو اور بہت لذیذ ہو۔ ان خصوصیات کی کمی بچوں کو ناخوش اور ناراض کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں:

> ’’بچوں کو تو چنگم اور ٹافی یا چاکلیٹ کا دلاسہ دیے بغیر انہیں پرچانا، متوجہ کرنا سہل نہیں۔‘‘(۹)

یہی چنگم، ٹافی اور چاکلیٹ بچوں کے ادب پر بھی محیط ہے۔ بچوں کو ان کی من پسند چیزیں دیے بغیر ہم کوئی بات ان کے ذہن و دل میں اُتار نہیں سکتے یا اپنی بات منوا نہیں سکتے۔ ہم انہیں ایک لمحے کے لیے بھی متاثر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا بچوں کے ادب میں چنگم اور ٹافی الفاظ اور اندازِ بیان ہیں۔ ہم ان کی مدد سے ننھے پڑھنے والوں کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ ان کو بھانے اور منانے کے لیے یہ الفاظ و بیان بہترین ذرائع ہیں۔

الفاظ و بیان کے بارے میں عموماً اہلِ علم کی یہ رائے ہوتی ہے کہ وہ بے حد سادہ اور آسان ہوں۔ ان کے اندر مشکل پسندی نمایاں نہ ہو۔ گویا بچوں کے ادب کو ایسی زبان میں ہونا چاہیے جس میں وہ روزانہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اہلِ علم کی یہ رائے صحیح ہے کہ بچوں کے ادب پر سادگی نمایاں ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سادگی اور ہلکا پھلکا پن بچوں کے ادب کے لیے کافی ہے۔ کیا ہم ان چیزوں کا سہارا لے کر بچوں کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ کیا وہ ان تخلیقات کو پڑھنے پر راضی ہو جائیں گے جو سیدھی سادی اور آسان ہوں۔ جن کے اندر نہ اسلوبِ بیان کی خوبی ہے، نہ عمدہ طرزِ نگارش! جو محض سیدھی سادی ہوں۔ جہاں تک تجربے کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے ان چیزوں کو بالکل پسند نہیں کرتے جو محض سادہ ہوں۔ ایسے بہت سے اشعار بچوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے جو صرف آسان الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جنہیں بچے روزانہ بولتے چالتے اور کہتے سنتے ہیں۔ ایسے الفاظ جو بچوں کے جانے پہچانے اور آسان ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کو بالکل متاثر نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

اکیاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی
پچاسی، چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی

بے حد آسان الفاظ پر مشتمل یہ شعر بالکل موزوں ہے لیکن کیا کوئی بچہ اسے پڑھ کر محظوظ ہو سکتا ہے اور اپنے حافظے میں محفوظ رکھ سکتا ہے؟ بالکل نہیں۔ وہ تو اسے شعر ہی نہیں سمجھے گا۔ سادہ ہونے کے باوجود یہ شعر بچے کو کسی صورت میں متاثر نہیں کر سکتا۔ اس امر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کے ادب کو محض آسان لفظوں کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بقول الیاس احمد مجتبیٰ:

> ''بچوں کے لیے آسان زبان برتنی چاہیے .... کسی نے اگر اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ آسان الفاظ کا انبار لگا دیا جائے تو وہ خاک نہیں سمجھا۔ بچوں کو نہ بچوں کے ادب کو۔''(۱۰)

بچوں کی نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ اُنہیں ہر نئی اور انوکھی چیز کو معلوم کرنے اور اس کا پتہ چلانے کی دُھن سوار ہوتی ہے۔ تلاش وتجسس ان کی فطرت میں موجود ہے۔ وہ ضعیف ناتواں انسان کی طرح ایک کونے میں پڑ کر پہاڑ جیسے لمبے دن نہیں گزار سکتے۔ وہ تو کائنات کی وسعت میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ ان کی بے چین روح بروقت حرکت کی طلبگار رہتی ہے اور ٹھہراؤ ان میں نہیں ہے۔ ان کی نگاہیں عجیب وغریب چیزیں ڈھونڈتی ہیں۔ حرکت وعمل جہاں کہیں ہوگا۔ بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ نئی نویلی اور عجیب وغریب اشیاء جہاں کہیں نظر آئیں گی۔ بچے ٹھٹک کر انہیں دیکھیں گے۔ یہی حال لفظی بازی گری کا ہے جس طرح جادوگر اپنی جھولی سے مختلف چیزیں نکال کر نئے نئے کرتب دکھاتا ہے۔ اُسی طرح ادبی بازی گر نئے نئے الفاظ سجا کر بچوں کے نظر و دل کو خیرہ کرتا ہے۔ بچے آگے بڑھ کر ان الفاظ کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کی بناوٹ، ان کی ترتیب، ان کا ترنم بچوں کو حددرجہ متاثر کرتا ہے اور وہ اسے فوراً اپنے ذہن میں چھپا لیتے ہیں۔

نہ جانے کیا وجہ ہے کہ ہمارے نقاد جب کبھی بچوں کے ادب پر تبصرہ کریں گے تو سادگی پر انتہائی زور ڈالیں گے۔ گویا آسان الفاظ بچوں کے ادب کی روح رواں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے نقاد الفاظ کی اہمیت سے آگاہ نہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے آسان الفاظ کی شرط قائم کر دی جائے تو اس سے بچوں کی ذہنی نشوونما رُک جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے ہم وہی الفاظ لانے اور برتنے کی کوشش کریں گے جنہیں بچے جانتے ہیں۔ جن سے ان کی شناسائی ہے اور اس طرح ہم انہیں نئے نئے الفاظ اور ان کی افادیت سے محروم کر دیں گے۔ الفاظ تو ادب کے اندر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی بیکراں افادیت کے بارے میں مشہور مصنف جانسن اوکونر (Hohnson O'conner) رقمطراز ہے:

''وسیع خزانۂ الفاظ کامیابی کا ایک اہم زینہ ہیں۔''(۱۱)

الفاظ کے اس خزانے میں اس وقت تک اضافہ نہیں ہوسکتا جب تک نئے نئے الفاظ قاری کی نظر سے گزرتے نہ چلے جائیں۔ پڑھنے والا جیسے جیسے لفظی بازی گری سے مسحور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے خزانۂ الفاظ میں وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ لفظی بازی گری کی سب سے زیادہ ضرورت بچوں کے ادب میں پڑتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نئے الفاظ سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور صحیح معنوں میں خزانۂ الفاظ حاصل کرنے کا وقت بچپن ہے نہ کہ بڑھاپا!۔ بقول جانسن اوکونر کے:

"Normally Vocabulary is acqured early in life".(12)

اگر ہم بچوں کے ادب کو محض آسان الفاظ تک محدود کر دیں تو اس طرح بچوں کے خزانۂ الفاظ میں کیا خاک اضافہ ہوگا؟ وسعت فرہنگ کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے ادب میں الفاظ کو کافی اہمیت دی جائے۔ نت نئے الفاظ سے بچوں کو روشناس کرایا جائے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ بچوں کا ادب بھاری بھرکم الفاظ کا خزانہ ہو، سادگی اور ہلکے پن کا نشان تک نہ ہو۔ بچوں کے ادب میں سادگی کا ہونا تو ضروری ہے ہی مگر الفاظ کے انتخاب میں سمجھ بوجھ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ منتخب کیے جائیں جو بچوں کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت انہی الفاظ میں موجود ہوگی، جن کی ترتیب میں ایک حُسن ہو، جن کے پڑھنے میں دل و دماغ کو ایک لذت محسوس ہوتی ہو اور جو مترنم ہوں۔ بچے ایسے الفاظ کو فوراً قبول کرلیں گے۔ بقول مجتبیٰ حسین:

> ''اگر جابجا مشکل الفاظ بھی آ جاتے ہیں تو بچے اس کو بخوشی قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ ان کی ترتیب اور ان کا آہنگ ان کی یاد کو تازہ کرتا رہتا ہے۔''(۱۳)

الفاظ اور اندازِ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے بچوں کے مشہور ادیب الیاس احمد مجتبیٰ:

> ''یاد رکھنے کی بات ہے کہ بچے مشکل الفاظ سمجھیں نہ سمجھیں، اگر اسلوب شگفتہ ہے، زبان میں رنگینی اور چٹخارہ ہے تو مفہوم ان کے پلے پڑ ہی جاتا ہے۔ دوچار الفاظ کے معنی سے لاعلمی خارج ہوتی ہے نہ خلل انداز۔''(۱۴)

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کی نظم و نثر دونوں میں الفاظ کے برمحل استعمال اور ان کی مناسب ترتیب سے ہم بچوں کے ادب کو خوشگوار اور خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ اس اہم خصوصیت کے باعث اس میں حسن اور جاذبیت پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اگر کوئی نیا اور مشکل لفظ آ جاتا ہے تو بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریشانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نئے الفاظ اگر اپنے اندر ذرا بھی خوبی رکھتے ہیں تو بچوں کو ضرور متاثر کریں گے۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر ہے:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

کیا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ بچے ''کاشانہ'' اور ''انجمن'' کے معانی بتا دے گا؟ ''کاشانہ چمن'' جن کی ترکیب اس کی سمجھ میں آ جائے گی؟ شاعر نے جو نادر تشبیہہ استعمال کی ہے۔ اس کی خوبی کو بچہ محسوس کر سکے گا؟ یہ واضح حقیقت ہے کہ بچہ ان شعری اسرار و رموز سے ناواقف ہے۔ پھر تو یہ شعر اسے اچھا نہیں لگنا چاہیے۔ وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ بھی نہیں رکھ سکے گا۔ کاشانہ اور چمن جیسے الفاظ کے معانی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ شعر بالکل روکھا پھیکا ہوگا۔ مگر بات یہ نہیں! اس شعر کی لذت تو بچوں کے دل و دماغ پر اثر کرے گی۔ معنی نہ سمجھنے کے باوجود بچے اس شعر کو لہک لہک کر گاتے ہیں۔ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں اور بچپن کی سرحد عبور کرنے کے بعد بھی یہ شعر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی یادوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ مشکل الفاظ اچھوتی تشبیہہ کے باوجود یہ شعر بچوں کو پسند آتا ہے؟ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہر نئی اور رنگین چیز بچوں کے لیے باعثِ کشش ہوتی ہے۔ لفظی بازی گری بھی ایک عمدہ کرتب ہے جو ان کے دل و دماغ کو مسحور کر سکتا ہے۔ الفاظ کی اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بونیمی ڈوبرے (Bonamy Dobree) رقمطراز ہے:

> ''الفاظ سکے کی مانند ہیں جو رفتہ رفتہ گھس جاتے ہیں اور ہم یہ نہیں دیکھ پاتے کہ ان کے اوپر کیا کچھ ہے۔ وہ تبادلہ میں کام تو آ سکتے ہیں لیکن تاثرات اور جاذبیت کے نقطۂ نظر سے بیکار محض ہیں۔ ایک نیا سکہ اگر جاذبِ نظر ہے تو ہمیں اس کے دیکھنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک پُرانا سکہ اگرچہ ہماری ضرورت کا کفیل ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اس کے دیکھنے سے فرحت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایسی ہی الفاظ و استعارات کے ساتھ ہے۔''(۱۵)

جس طرح ایک شخص نئے نوٹ کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اسے جیب میں رکھنے کی خواہش کرتا ہے۔ اسی طرح نئے الفاظ بھی اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ وہ انہیں یاد کر لیتا ہے اور جہاں کہیں موقع ملتا ہے۔ انہیں استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ نئے الفاظ کو دیکھ کر رکتے نہیں بلکہ بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔

الفاظ کی یہی اہمیت انداز و بیان کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے۔ الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال اسلوب کو شگفتہ کر سکتا ہے۔ اگر ہم سرے سے ہی الفاظ کی اہمیت کے قائل نہ ہوں تو پھر اندازِ بیان میں کس طرح حسن اور جاذبیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لفظوں کی رنگینی، ترنم، نرمی خود بخود انداز اور اسلوب کو بچوں کے مزاج سے ہم

آ ہنگ کرتا جائے گا۔ رُتھ ایم سٹافر (Ruth M. Stauffer) کے الفاظ میں:

''اندازِ بیان بڑی حد تک الفاظ کے انتخاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی کہانی زندہ جاوید بن جائے تو ایسے الفاظ سُننے کی سعی کیجیے جو مخصوص ہیئت، رنگ و بو اور احساس و عمل کے حامل ہوں۔'' (۱۷)

الفاظ و بیان کی اہمیت ہر صنف ادب میں نمایاں ہے۔ بچوں کے ادب پر اس کے اثرات اور بھی ہمہ گیر ہیں۔ بچوں کے ادیب و شاعر کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو الفاظ استعمال کیے جائیں وہ بچوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ ان کے اندر ایک تاثر ہو۔ ایسے الفاظ کی نرمی اور موسیقی، بچوں کو اپنی طرف مائل کر لے گی۔ لفظ کی مدد سے ہم نہ صرف نظم و نثر کو بچوں کے لیے قابلِ قبول بنا سکیں گے بلکہ ان کے خزانۂ الفاظ کو بھی بڑھا سکیں گے۔

اسی طرح اندازِ تحریر میں حسن پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تکرارِ لفظی بھی ہے۔ اس سے ایک ترنم پیدا ہوتا ہے جو بچوں کی توجہ اپنی جانب کر لیتا ہے۔ بچے شعر کو گا کر پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لفظ حسین اور رنگین ہو اور تکرار بھی ہو! تو بچوں کو پڑھنے میں خاصا لطف ملتا ہے اور اس طرح نہ صرف الفاظ انہیں یاد ہو جاتے ہیں۔ بلکہ شعر بھی ان کے ذہن میں تاثر اور ترنم کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بچوں کے ہر دلعزیز شاعر اسماعیل میرٹھی نے اس خصوصیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے کلیات میں جا بجا ایسے الفاظ ملیں گے جن میں لفظی تکرار کا حسن پایا جاتا ہے جو بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

آب رواں کی ترکیب چھوٹے بچوں کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ شعر انہیں پسند آئے گا اور یاد بھی رہے گا۔ کیونکہ اس شعر کا سارا حسن اسی لفظ آب رواں میں پوشیدہ ہے۔ دوسرے مصرع میں پہلے مصرعے کی تکرار نے شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ اعتراض کرنے والے حضرات ''آبِ رواں'' کو بچوں کے لیے ناموزوں قرار دیں گے۔ مگر یہی لفظ ساری خوبیوں کا حامل ہے اور اسی اضافت نے اس شعر کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اندازِ بیان میں حسن اور نکھار صرف تشبیہہ، اضافت اور شاندار الفاظ سے ہی پیدا

ہوتا ہے۔ بلکہ معمولی سے معمولی لفظ بھی مناسب اور موزوں استعمال کی وجہ سے شعر کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ شاعر و ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ لفظ کو اس طرح استعمال میں لائے کہ تحریر میں تنوع پیدا ہو جائے۔ بونی ڈوبرے(Bonamy Dobree) کے بقول:

''الفاظ کا صحیح انتخاب اور جملے کا توازن جذبے کی تخلیق و تائید کرتا ہے۔''(۱۷)

آسان اور معمولی لفظ کے موزوں و مناسب استعمال اور اس کی تکرار سے کس طرح خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال بھی اسماعیل میرٹھی کے اشعار میں مل سکتی ہے:

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا

اسماعیل میرٹھی کے علاوہ یہ خصوصیت بچوں کے موجود شعراء میں صوفی تبسم کے ہاں بدرجہ اتم اور قیوم نظر ہاں بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ آسان الفاظ استعمال کرنے کے باوجود وہ ایسے ایسے نئے الفاظ لاتے ہیں کہ نوعمر قاری متحیر ہو جاتا ہے۔ پھر ان لفظوں کی مناسب ترکیب، تکرار اور ترنم شعر میں حسن پیدا کر دیتا ہے اور بچے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کرے ٹرٹر، کرے ٹرٹر
تیری لاری، تری موٹر

(صوفی تبسم)

صاف اور ستھرے اُجلے اُجلے
پیارے پیارے اچھے اچھے
پہناتی ہے مجھ کو کپڑے
کتنی پیاری میری امی

(قیوم نظر)

چچوں، چچوں، چاچا
گھڑی پہ چوہا ناچا

ہمارے نقاد یا تو بچوں کے لیے اضافتوں، تشبیہوں اور مشکل لفظوں کو مضر بناتے ہیں یا ایسے الفاظ کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ جو عجیب وغریب ہوں اور یہ اعتراض کر بیٹھیں گے کہ:

> چچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں اگر چاچاچ سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں اور یہ جو گھڑی پر چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ۔(۱۸)

اعتراض کرنے والے ہمیشہ اس بات پر قائم رہتے ہیں جو فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کی آماجگاہ ہوتی ہے۔ ان کا ذہن بچوں کی اس عجیب وغریب دنیا میں نہیں پہنچ پاتا جہاں احمد شاہ بخاری پطرس کے بقول:

> ''ٹرٹر-- چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔''(۱۹)

یہ آہنگ اور لَے، ترنم اور تنوع بچوں کے ادب کی خصوصیات ہیں۔ الفاظ سہل ہوں یا دشوار، استعارات ہوں یا کنایات۔ اصل مقصد بچوں کی خوشی اور مسرت ہے۔ اگر مشکل الفاظ کا استعمال کر کے بچوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے تو یہ بھی بجا -- اور اگر چچوں، چاچا جیسے غیر فصیح الفاظ سے قاری کو بہلایا جا سکتا ہے تو یہ بھی درست ہے! --- ہمیں ہر حال میں بچوں کی عمر، ان کی نفسیات اور ان کے مذاق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ چیز کیسی ہی اچھی اور عمدہ کیوں نہ ہو۔ اگر وہ بچوں کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوتی ہو تو وہ بالکل بیکار ہے۔ بچوں کے ادب کے لیے ہم آہنگی اور مطابقت بنیادی عناصر ہیں اور ان عناصر کو بروئے کار لانے کے لیے بچوں کے ادب میں، ایک اُچھوتا پن، ایک جذبہ اور خوشنمائی پیدا کرنا ہوگی اور یہ ساری باتیں نئے نئے الفاظ، استعارات، کیفیات، عجیب و غریب اسماء اور نت نئی ترکیبوں کے ذریعے ہی پوری کی جا سکتی ہیں۔

اب صوفی تبسم کی نظموں میں بچوں کے لیے موجود آسان الفاظ، آسان زبان، استعارات، تشبیہات اور موسیقیت کا جائزہ لیا جائے گا۔

نظم ''ٹوٹ بٹوٹ کا طوطا'' میں طوطے کے متعلق کچھ ایسی خصوصیات بتائی گئی ہیں کہ جن کے بیان کرنے کے لیے تشبیہ سے کام لیا گیا ہے۔ جیسے طوطا اتنا کھاتا ہے کہ دن کے وقت حلوہ پوری کھاتا ہے۔ رات کو اسی لڈو کھا جاتا ہے اس کا پیٹ اتنا بڑا ہے جیسے جنات کا لوٹا ہو۔ جنات خود بھی بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان

سے متعلق اشیاء کا سائز بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ اب اتنے سے طوطے کا پیٹ اتنا بڑا تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن صرف اس کی زیادہ کھانے کی اس بات کو بیان کرنے کے لیے اس تشبیہ کو لیا گیا ہے۔ اسی طرح طوطے کی ٹانگیں لمبی ظاہر کرنے کے لیے قطب صاحب کی لاٹھ کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔ بچوں کے لیے تشبیہات کا ہونا یا نہ ہونا ان کی سمجھ سے بالا تر ہے۔ لیکن اُن کے لیے نظم کا چلبلا اور مزے دار ہونا ضروری ہے۔

جس میں تشبیہات کے طور پر : راجہ شاہی کوٹ کے، شیر بہادر، شیر کو کھانا، فوجی شاہی کوٹ جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

اوپر جتنی بھی بہادری یا شجاعت کی باتیں کی گئی ہیں۔ اُن سب کے لیے تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے یعنی چوہوں کی بہادری کو ظاہر کرنے کے لیے شیر کا لفظ لیا گیا ہے کہ یہ اتنے بہادر چوہے ہیں کہ شیر کو بھی کھا سکتے ہیں یعنی وقت آنے پر بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ان میں موجود ہے۔

ٹوٹ بٹوٹ نے بکری پالی — دُبلی پتلی ٹانگوں والی
اِک دن کی تم سُنو کہانی — بکری کو یاد آئی نانی
کتنا ہی سمجھایا اُس کو — بہلایا پھسلایا اُس کو
وہ تھی اپنے من کی رانی — ٹوٹ بٹوٹ کی بات نہ مانی

(تشبیہ: رانی)

ٹوٹ بٹوٹ کی بکری بہت دُبلی پتلی تھی۔ حالانکہ وہ بکری تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ یہاں مرضی کی مالک کو رانی کی تشبیہ سے بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو کہ کسی سلطنت کی رانی ہوتی ہے۔ وہی اپنا ہر کام اور فیصلہ اپنی مرضی سے کرتی ہے اور کسی کی بات نہیں سُنتی۔ یہاں بکری کی من مرضی کو بھی رانی کی تشبیہ سے پر اثر بنایا گیا ہے کہ جو دل میں آئے کرتی ہے اور ٹوٹ بٹوٹ کی بات بھی نہیں سنتی۔ خواہ بعد میں کیسا ہی نقصان کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔

ٹوٹ بٹوٹ کو سب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ لیکن ٹوٹ بٹوٹ اتنا شرارتی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے شرارتی پن کو بیان کرنے کے لیے شیطانوں کا کاکا کی تشبیہ لی گئی ہے۔ شیطان لفظ اکثر ایسے بچے یا انسان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ جو بہت تیز اور بہت شرارتی ہو۔ یا جس کی ذات میں بے چینی بہت ہو۔

اُسے اکثر کہا جاتا ہے کہ ’’ یہ تو بہت شیطان ہے‘‘ اور اب یہاں کہا جا رہا ہے کہ شیطانوں کا کاکا ہے۔ یعنی انتہا کا شرارتی اور لڑاکا بتایا جا رہا ہے یعنی کہ اُلٹے کام کرنے کا اُستاد ہے۔

اس طرح نظم ’ٹوٹ بٹوٹ‘ نے کھایا پان نظم میں بھی ٹوٹ بٹوٹ کی شرارتی طبعیت اور من مرضی کی عادت کو ظاہر کرنے کے لیے شیطان کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے اور ساتھ ہی آنت کی تشبیہ ہے کہ ابھی اتنا بچہ سا ہے کہ پیٹ میں آنت نہیں ہے یعنی سارا اندرونی نظام انتہائی نازک ہے اور اس میں یہ بچہ پان کھا رہا ہے جو کہ بہت بُری بات اور خصوصاً صحت کے لیے بہت بُرا ہے۔

نظم ’ہر جگہ ایک سا ہے ٹوٹ بٹوٹ‘ میں ٹوٹ بٹوٹ کی خودغرضی کو بیان کرنے کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ کسی کے کام نہیں آتا۔ صرف خود کے بارے میں سوچتا ہے تو پھر آخر کس مرض کی دوا ہے۔ یعنی کہ پھر وہ کس کام کا ہے؟ کیونکہ دوست تو ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ ساتھ ہی ٹوٹ بٹوٹ کی صحت اور ظاہری خدوخال کے لیے چیل کا گھونسلا اور نظر بٹو کی تشبیہات لی گئی ہیں۔ چیل کا گھونسلا وہ جگہ ہے جہاں کسی قسم کا ماس یا خوراک نہیں ہوتی۔ یعنی ہمیشہ خالی ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹوٹ بٹوٹ کی صحت بھی اتنی کمزور ہے کہ گھونسلے کی طرح سوکھا ہے اور اتنا عجیب ہے کہ نظر بٹو بھی اس سے کتراتا ہے۔ کیونکہ ظاہر طور پر یہ ایسا ہے کہ اسے نظر نہیں لگ سکتی اور جس کے ساتھ جاتا ہے اُسے بھی نظر نہیں لگتی۔ یعنی نظر بٹو کا کام ٹوٹ بٹوٹ کرتا ہے۔

دل آرا محمدؐ ہمارا محمدؐ ہے ہم سب کی آنکھوں کا تارا محمدؐ
ہمارا محمدؐ، تمہارا محمدؐ جہاں میں ہر اِک کا سہارا محمدؐ

(تشبیہ: آنکھوں کا تارا)

نبی پاکؐ اللہ کے محبوب نبی ہیں۔ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوا۔ آپؐ تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ ہم سب کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ آپؐ کی آپؐ کے امتیوں کے لیے عقیدت اور محبت کا اظہار کرنے کے لیے آنکھوں کا تارا کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے۔ ویسے تو آپؐ کی اہمیت اور صفات کو بیان کرنے کے لیے کوئی بھی تشبیہ یا استعارہ کافی نہیں ہے۔ کیونکہ آپؐ کی صفات اُس میں سما ہی نہیں سکتیں۔ پھر بھی بچوں کے سمجھانے کے لیے یہ ایک کوشش ہے۔

اسی طرح آزاد ملک میں رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہوتی ہے اور اپنے ملک کی ہر شے سے محبت ہوتی ہے۔ وطن کی مٹی کا ذرہ ذرہ بھی ایک ستارہ لگتا ہے اور اس کا ہر گوشہ اور ہر خطہ خود میں ایک چمن ہے یعنی وطن کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لیے ستارہ اور چمن کی تشبیہہ استعمال کی گئی ہے۔

مدرسہ وہ جگہ جہاں انسان علم حاصل کرنے جاتا ہے اور شعور کی منازل اسی مدرسے سے طے کرنا شروع کرتا ہے۔ بچوں کو اپنے مدرسوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور بچے بھی مدرسے کے لیے سب کچھ ہوتے ہیں۔ مدرسہ اگر گلشن ہے تو بچے اس گلشن کے پھول اور کلیاں ہیں۔ بچوں کی معصومیت اور خوبصورتی کے لیے پھول اور کلیوں لفظ کا استعمال کیا گیا ہے جبکہ بچوں کے لیے مدرسہ اور مدرسے کے لیے بچے آنکھوں کا تارا ہوتے ہی۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

جہاں تک نظموں میں آسان زبان اور آسان الفاظ برتنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں صوفی تبسم کی نظمیں بہترین مثال ہیں۔ انہوں نے بچوں کی نفسیات اور اُن کی پُرتجسس طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت آسان زبان اور الفاظ پر مشتمل نظمیں لکھی ہیں۔ صرف آسان ہی نہیں بلکہ زبان کا چٹخارہ بھی ہے اور نئے الفاظ سیکھنے کی سہولت بھی میسر ہے جو بچوں کو سب سے زیادہ پسند آتی ہے۔ کوئی بات سمجھانی ہو یا بتانی ہو یا کسی نئی شے یا کام سے متعارف کروانا ہو، صوفی تبسم نے اُسے اپنی آسان زبان اور الفاظ کے ساتھ اتنے نرالے انداز میں پیش کیا ہے کہ بچے اس سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتے اور ایسی نظموں کو خوشی خوشی پڑھتے اور دُہراتے ہیں۔ صوفی تبسم نے کس حد تک آسان زبان اور الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس کے لیے اُن کی نظموں کا یہاں جائزہ لیا جائے گا۔

آسان زبان:

ایک دو تین چار　　آؤ مل کر بیٹھیں یار
پانچ چھ سات　　سنو ہماری بات
آٹھ نو دس　　بات ہماری بس

(نظم، گنتی، ص:۱۹)

☆......☆......☆

ایک دو میری بات سُنو
تین چار چنے مسالے دار
پانچ چھ تم نے کھائے تھے
سات آٹھ قطب صاحب کی لاٹھ
نو دس آم کا میٹھا رس

(نظم،ایک دو۔ص:۳۱)

ویسے تو بچوں کو گنتی سکھانا مشکل کام ہے اور بچوں کے لیے بھی ایسے ہی روکھے پھیکے انداز میں گنتی سیکھنا مشکل ہوگا۔صوفی تبسم نے بچوں کی زبان کا چٹخارہ برقرار رکھتے ہوئے بالکل آسان زبان کا استعمال کرکے گنتی کے اس عمل کو بہت آسان اور مزے دار بنا دیا ہے کہ بچے خوشی خوشی اسے سیکھیں گے اور کبھی بھولیں گے بھی نہیں۔

زندگی کی حقیتوں کو اتنی اسانی سے اور آسان زبان میں بیان کر دینے کا ہنر بے شک صوفی تبسم میں موجود ہے۔ بچوں کو اگر اسی باتیں عام انداز میں سمجھائی جائیں تو وہ اُکتا جائیں گے۔ بلکہ یہ باتیں اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوں گی۔لیکن نظم کے ذریعے آسان سی زبان کا استعمال کرکے اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا ہنر صوفی تبسم نے سکھا دیا ہے۔

منے کے متعلق نظموں جیسے منا اور منا اور لڈو وغیرہ کو بھی نہایت آسان زبان میں لکھا گیا ہے بلکہ آسانی کی خاطر اور بچوں کی دلچسپی کی خاطر آوازوں کا بھی استعال کیا ہے۔جس سے نظم کی زبان اور زیادہ آسان ہوگئی ہے۔نظم بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتی ہے۔

’دیس ہمارا پاکستان‘ میں وطن سے محبت کا اظہار نہایت ہی آسان زبان اور عمدہ انداز میں کیا ہے۔نظم کو کہیں بھی زبان کی وجہ بھاری نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اچھے سے اچھے موضوع کو بہترین اور آسان زبان میں بیان کر دینے کا فن صوفی تبسم کو بہت اچھی طرح سے آتا ہے۔ پاکستان سے ہمیں محبت تو ہے ہی لیکن بچپن کے معصومانہ ذہن کو بھاری بھرکم زبان اور جملوں میں اس وطن سے محبت کا اظہار کرنا مشکل لگے گا۔لہٰذا یہ آسان انداز بہترین ہے۔

آزادی بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی قدر وہی جانتے ہیں جنھوں نے غلامی دیکھی ہو اور آزادی کے

لیے قربانیاں دی ہوں۔ آزاد ملک کے باسی اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ اپنی عدالتیں ہوتی ہیں، انصاف پہلے سے بہتر اور جلدی ملتا ہے۔ یہ سب باتیں بچوں کو سمجھانے کے لیے اُن کی ذہنی سطح پر آنا ضروری ہے اور اس کے لیے آسان زبان اور انداز بیان سب سے زیادہ ضروری ہے جس کی بھرپور عکاسی صوفی تبسم کی نظم 'اپنا راج' میں کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کون ہیں؟ یہ دنیا کس نے بنائی؟ دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ چاند ستاروں کا مربوط نظام کون چلا رہا ہے؟ سورج کی روشنی اور چمک دینے والا کون ہے؟ پھولوں کو رنگ اور خوشبو کس نے عطا کیے؟ ہم سب جس کی عبادت کرتے ہیں۔ جو ہم سب کا معبود ہے۔ پالنے والا ہے۔ جو ہم سب کا رب ہے۔ سب کا رازق اور مالک ہے۔ ان سب باتوں اور دنیا کے نظام او رزندگی کے مقصد کو بہت سہل انداز میں اس نظم میں بیان کر دیا ہے جو کہ بچوں کے سمجھنے کے لیے بہت آسان ہے۔

یوں موسموں کے متعلق بھی بہت آسان زبان میں سب کو بتا دیا ہے جس طرح بچے کسی موسم کا مزا لیتے ہیں۔ ویسا ہی انداز ان نظموں کا بھی ہے۔ ہر طرف بہار کا موسم ہے۔ پھول کھلے ہیں۔ انسان ، چرند، پرندے سب خوش ہیں۔ اسی طرح برسات کے موسم سے بھی سب لطف اندوز ہو رہے ہیں تو ان سب باتوں کو صوفی تبسم نے بچوں کے لیے بچوں کے انداز میں نہایت خوبصورت طریقے سے بیان کر دیا ہے۔

یوں صوفی تبسم نے اپنی نظموں میں جتنے بھی موضوعات لیے خواہ وہ جانوروں سے متعلق ہوں یا انسانوں سے سب کو نہایت آسان زبان میں نظموں کا روپ دیا ہے۔ بچوں کے لحاظ سے ساری نظمیں ہی بہت آسان ہیں اور کہیں کوئی جھول یا کمی نہیں ہے۔ بلکہ بچے بات کو سمجھ بھی جاتے ہیں اور آسانی سے یاد بھی کر لیتے ہیں۔ زبان اتنی آسان ہے کہ اُنہیں ساری زندگی یہ نظمیں نہیں بھولیں گی کیونکہ بچپن کی یاد کی گئی باتیں ساری زندگی یاد رہتی ہیں۔

آسان الفاظ

اب اگر بات کرلیں آسان الفاظ کی تو صوفی تبسم نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا ہے اور انتہائی سادہ الفاظ کا انتخاب کرکے بچوں کے لیے بہترین نظمیں تخلیق کی ہیں۔ کیونکہ آسان الفاظ کے استعمال سے ہی بچوں کے ادب کو خوبصورت اور پُرکشش بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صوفی تبسم نے بھی روزمرہ استعمال کے الفاظ

کو بروئے کار لایا ہے کہ جس میں بچے باتیں کرتے ہیں اور اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن آسان الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالکل سادہ او رروکھے پھیکے انداز پر محیط نظمیں ہیں بلکہ ان میں بھی اسلوب بیان اور عمدہ طرزِ نگارش کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

'ٹوٹ بٹوٹ' نے بین بجائی کے حوالے سے بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی بچے کوئی نیا کام کرتے ہیں۔ یا کچھ نیا سیکھتے ہیں تو اُن کے لیے یہ بے انتہا خوشی کی بات ہوتی ہے۔ اُس خوشی کو بہترین الفاظ کے انتخاب سے صوفی تبسم نے حقیقی بنا دیا ہے۔ بچے اس نظم کو پڑھنے کے بعد اس کے الفاظ میں چھپی خوشی کومحسوس کر سکتے ہیں۔صوفی تبسم نے لفظوں کے استعمال میں جو ہر ایک مزے کا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے چند جانوروں کی آوازوں کو الفاظ کا روپ دے کر اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ انسان داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسے مینڈکوں کا ٹرانا، چوہوں کا شور مچانا وغیرہ۔

کہانی سننے کا ہر بچے کوشوق ہوتا ہے اور اگر کہانی نظم کے انداز میں سنائی جائے تو اس سے زیادہ مزے کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ اور پھر ردیف اور قافیے کا بہترین امتزاج اور الفاظ کا بہترین اور نپا تلا انتخاب بچوں کے بے حد دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ کہیں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے۔ بلکہ نہایت ہی آسان اور ایک جیسے الفاظ کا امتزاج اس نظم میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔جس میں بچے بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

نظم 'گڑیا' اور 'ثریا کی گڑیا' بے حد اسان الفاظ کا مجموعہ ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی روزمرہ انداز میں کوئی بات کر رہا ہو۔لیکن ان آسان الفاظ کا بہترین انداز میں استعمال انہیں خاص بنا دیتا ہے۔ ساتھ ہی کچھ الفاظ کی تکرار سے بھی نظم میں زیادہ کشش پیدا ہو رہی ہے۔ جیسے جگاؤ، نہانے لگی وغیرہ۔ ساتھ ہی ہم آواز الفاظ کی موجودگی سے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسے بچاؤ، جگاؤ، پڑے گی،لڑے گی، بچایا لایا وغیرہ۔

بچوں کے ذہن میں ہر وقت بہت ساری باتیں چلتی رہتی ہیں۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کی پُرتجسس طبیعت اُن کے دل و دماغ کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتی وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا کرتے اور نیا سوچتے رہتے ہیں اور ان کی اس اوٹ پٹانگ سوچ اور باتوں کو صوفی تبسم سے زیادہ بہترین انداز میں کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ آسان لفظوں کے استعمال سے وہ نظم کو اتنا خوبصورت روپ دیتے ہیں کہ اُس پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

صوفی تبسم نے بچوں کے لیے صرف آسان اور سادہ الفاظ پر مشتمل نظمیں نہیں لکھیں۔ بلکہ انہوں نے بچوں کو نئے نئے الفاظ سیکھنے کا بھی موقع دیا ہے جس سے بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے نظم 'اقبال' اور قائداعظم میں باقی نظموں کی نسبت تھوڑے مشکل یا نئے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً دل شادمان، دل شاد، گلستان، پاسبان، آبرو، کارواں، عظمت وغیرہ۔ آسان الفاظ کے ساتھ ساتھ ایسے الفاظ کا استعمال بچوں کو بہت کچھ نیا سیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر صوفی تبسم نے اپنی نظموں میں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنے بھی الفاظ کا استعمال کیا ہے، وہ بے حد آسان، نئے اور بچوں کی پسند کے مطابق ہیں۔ اسی لیے بچے آج تک صوفی تبسم کی نظموں کو جتنی بار بھی پڑھتے ہیں۔ اُن سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

موسیقیت

بچپن میں بچہ اکثر وہی چیزیں سُننا پسند کرتا ہے جس میں سُر ہو۔ ماں بچے کو لوری بھی دیتی ہے تو وہ بھی گا کر دیتی ہے اور وہ لوری ساری زندگی بچے کو یاد رہتی ہے۔ یعنی بچے موسیقیت والی باتوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ لہٰذا یہی بات نظموں پر بھی آجاتی ہے کہ چاہے نظم کیسی ہی ہو۔ لیکن اگر موسیقیت سے بھرپور ہے تو بچہ اُسے لہک لہک کر پڑھے گا بھی اور یاد بھی رکھے گا۔ نظم کا سمجھ آنا یا نہ آنا، یا اُس سے حاصل ہونے والے سبق کو سمجھنا نہ سمجھنا ایک الگ اور دوسری بات ہے۔ لیکن اگر پہلی ہی نظر میں نظم موسیقیت اور سُر اور لَے سے بھرپور ہوئی اور پسند آگئی تو باقی ساری باتیں بھی بعد میں پوری ہو جائیں گی۔ کیونکہ بچے ہمیشہ سُریلی چیزوں کی طرف موسیقی کی طرف جلدی متوجہ ہوتے ہیں۔ نظم 'ٹرٹر'، 'منے رولے'، 'پانچ چوہے'، 'ٹمک ٹالا'، 'نہر میں آگ'، 'مرغا اور چوزہ' یہ تمام نظمیں موسیقیت سے بھرپور ہیں۔

بچے انہیں صرف اس خصوصیت کی بنا پر ہی نہیں پڑھیں گے بلکہ یہ بہت آسان بھی ہیں۔ بچے جب بھی ان نظموں کو پڑھیں گے تو لہک لہک کر پڑھیں گے اور بار بار دُہرائیں گے۔ کسی نظم کی بچوں کے لیے پسندیدگی کا یہی معیار ہے کہ بچے اس نظم کو بھولیں مت۔

اب قیوم نظر کی نظموں کو بھی اسی پیمانے پر رکھا جائے گا۔ جس پر صوفی تبسم کی بچوں کے لیے نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تشبیہات

پتنگ بازی بچوں کا پسندیدہ کھیل ہے اور بچے لڑکے بہت چھوٹی عمر سے ہی اس کھیل کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ پتنگ اُڑانا بُری بات نہیں ہے لیکن کٹی پتنگ پکڑنے کے چکر میں اکثر بچوں میں لڑائی ہو جاتی ہے اور کٹی پتنگ کو پکڑنے کے لیے بچے سب کچھ بھول کر اُس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اس بات کو لٹیرے کی تشبیہ سے بیان کیا گیا ہے یعنی کہ اچھے بُرے کی پرواہ کیے بغیر لوٹنے کی فکر میں رہنا۔ جو کہ بالکل غلط بات ہے۔

خربوزہ بہترین پھل ہے اور سب سے زیادہ فکر یہی ہوتی ہے کہ یہ میٹھا ہو۔ کیونکہ پھیکا خربوزہ کھانا مشکل ہے۔ اب خربوزے بیچنے والے ویسے بھی اپنا پھل بیچنے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ تا کہ اُن کا پھل بک جائے اور کوئی گاہک آئے، وہ کچھ لیے بغیر نہ جائے۔ اسی چکر میں نظم 'خربوزہ' میں گاہک کے پوچھنے پر ریڑھی والے نے مصری کے کوزے کی تشبیہ استعمال کی ہے کہ یہ اس قدر میٹھے ہیں کہ جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔

اپنے وطن سے ہر کوئی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ آزاد فضاؤں میں سانس نہایت بڑی نعمت ہے۔ پاکستان میں ہم سب اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ اللہ نے اس ملک کو بے شمار قدرتی وسائل کی دولت سے مالا مال کیا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے 'پاکستان وطن میرا' میں دریاؤں کے لیے چاندی اور زمین کے لیے سونے کی تشبیہات استعال کی گئی ہیں۔ سونا چاندی دونوں ہی بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ اسی لیے وطن کے قدرتی وسائل کی قیمت کا اندازہ ان سے ہو جاتا ہے۔

آسان زبان

قیوم نظر کے ہاں بچوں کے لیے جتنی بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ وہ بے حد آسان زبان اور اکثر چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں کہ بچوں کو انہیں پڑھتے اور یاد کرتے ہیں۔ کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن آسان زبان کے ساتھ بچوں کے لیے زبان کا چٹخارہ بھی موجود ہے اور بچے اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی تعریف اتنے خوبصورت انداز میں کی ہے کہ بچے 'حمد' کو خوشی خوشی پڑھیں گے اور یاد بھی کریں گے۔ صبح سویرے ہر انسان چرند پرند اللہ کی حمد وثنا میں مشغول ہوتا ہے۔ قیوم نظر نے اس سارے منظر کی

بہترین اور آسان زبان میں منظر کشی کر کے بچوں کے لیے شاعری کرنے کا صحیح حق ادا کیا ہے۔

اسی طرح نظم 'سب سے اونچا' میں ایک بچے کے اپنے وطن اور پرچم کی طرف جذبات کی بڑی بھرپور عکاسی قیوم نظر نے اس نظم میں کی ہے اور بچے کے جذبات کے اظہار کے لیے ویسی ہی سادہ زبان اور معصوم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نظم نہ صرف پڑھنے میں بے حد آسان ہے بلکہ سمجھنے میں بھی کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے دن کام کرنے کے لیے اور رات آرام کرنے کے لیے بنائی ہے۔ جیسے ہی دن کی روشنی پھیلتی ہے۔ انسان ، جانور، چرند پرند سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ صبح کی روشنی پڑتے ہی سب جس طرح باری باری معمول کی مصروفیات کی طرف آتے ہیں۔ اُن مناظر کو بڑے ہی نرالے اور خوبصورت انداز میں نظم 'صبح سویرے' میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی آسان اور سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ لیکن بچوں کی دلچسپی کے تمام عناصر کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

جہاں تک نظم 'چڑیاں' اور 'میری بلی' کی بات کی جائے تو چڑیاں ہر گھر کے صحن میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ادھر سے اُدھر پھدکتی اور اُڑتی ہیں۔ دانہ دنکا چن کے پھر اُڑ جاتی ہیں ۔ پھر کبھی پانی پینے آ جاتی ہیں۔ اُن کا یہ آنا جانا سارا دن لگا رہتا ہے۔ اُس کو بہت اچھے انداز اور سادہ زبان میں بیان کیا ہے کہ بچے اسے پوری دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اسی طرح بلی جو کہ پالتو جانور ہے۔ بچوں کے ساتھ اس کی بے حد دوستی ہوتی ہے۔ ساتھ کھیلنا، کھانا کھلانا، سلانا سب چلتا ہے اور اگر اس قدر محبت کرنے والا جانور کہیں کھو جائے تو اُسے ڈھونڈنے میں بچے جس انداز کو اپنائیں گے ۔ بالکل اُسی انداز کو اُسی سادہ زبان میں بیان کیا ہے کہ پڑھتے ہی بچوں کے چہرے پر خوشی پھیل جائے گی۔

پودے لگانا بہت اچھی بات ہے۔ اس سے ایک طرف تو خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ ہمارے لیے آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ پودے گھروں میں بھی رکھے جاتے ہیں جو کہ گملوں میں لگائے جاتے ہیں اور باغوں میں بھی طرح طرح کے پھول اور پودے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن پودے جہاں بھی ہوں۔ یہ حفاظت اور توجہ مانگتے ہیں۔ قیوم نظر نے بچوں کو سمجھانے کی خاطر اتنے عام سے موضوع کو نظم 'پودے' میں بھی اتنے پیارے اور سادہ انداز و بیان میں پیش کیا ہے کہ بچے فوراً بات سمجھ جائیں گے۔

اسی طرح کھانے پینے کے متعلق جتنی بھی نظمیں ہیں۔ وہ سب بالکل سہل انداز میں لکھی گئی ہیں کہ بچوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور نظم کے شروع سے آخر تک بچوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

ماں کو اپنے بچوں سے بے حد محبت ہوئی ہے۔ وہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ ان کے کھانے پینے سے لے کر چلنے اور پڑھنے تک ہر بات کا خاص خیال رکھتی ہے اور یہ مشکل کو حل کرتی ہے۔ تاکہ اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ بچہ ماں کی اس بے لوث محبت کا اظہار اپنے معصومانہ خیالات میں جس طرح کر سکتا ہے۔ اس کی بھرپور عکاس نظم 'میری امی' کر رہی ہے۔انتہائی سادہ زبان اور خوبصورت ترین انداز میں اس بے لوث محبت کا اظہار بہت دلکش ہے اور یہ نظم پڑھنے کے بعد بچے پہلے سے زیادہ اپنی ماں سے محبت کریں گے اور اس کا خیال بھی رکھیں گے۔

بچوں کو نئے نئے تجربات کرنے کا اور طرح طرح کے کھیل کھیلنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کی پُر تجسس فطرت اُنہیں کبھی بھی ایک جگہ پر ٹکنے نہیں دیتی۔ لہٰذا بلبلے بنانے کا سارا طریقہ نظم 'بلبلے' میں بیان کر دیا گیا ہے اور اس قدر آسان زبان کا استعمال کیا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ بچے بنا کسی دقت کے نہ صرف یہ نظم سمجھ جائیں گے۔ بلکہ اگلے ہی پل وہ بلبلے بنانے کا تجربہ بھی کر رہے ہوں گے۔

آسان الفاظ

قیوم نظر نے اپنی تمام تر نظموں میں بچوں کی طبیعت کے مطابق زبان و الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے بچوں کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے اور بہت کچھ سمجھ اور سیکھ بھی لیتے ہیں۔ کیسا ہی مقدس یا سنجیدہ موضوع کیوں نہ ہو۔ انتہائی سہل انداز میں بیان کر دیا ہے اور سب سے بڑی بات کہیں بھی بچوں کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔

اس کائنات کو بنانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے مثل ہے۔ اسی حقیقت کو بچوں کو سمجھانے کی خاطر نظم 'میرا خدا' میں جن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بے حد سہل اور روزمرہ استعمال کے الفاظ ہیں۔ جیسے آم، آڑو، سیب، سردے، پودے، پھول، خوشبو، چڑیاں، کوے، کبوتر، طوطے، ریچھ، ہاتھی، بھینس، گھوڑے، پہاڑ، دریا، سمندر، سورج، جنات، پریاں، انسان وغیرہ۔ غرض انسانی آنکھ جو کچھ بھی دیکھتی ہے وہ سب اللہ رب العزت نے بنایا ہے اور اس کائنات کو سجایا ہے۔

صبح سویرے جب سورج کی کرنیں پھیلنا شروع ہوتی ہیں تو یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ آرام کا

وقت ختم ہوا اور اب کام کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ دن چڑھتے ہی انسان، حیوان، چرند، پرند سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ صبح کی سیر کو نکل پڑتے ہیں اور سورج نکلنے پہ گھروں کو لوٹتے ہیں تاکہ پھر تیار ہو کر اپنے اپنے کاموں پر پہنچا جائے۔ یوں دن چڑھنے کا یہ سارا منظر 'سورج نکلا' میں بے حد سہل انداز میں پیش کر دیا گیا ہے جیسے باغ، چڑیاں، کوے، طوطے، بچے، بوڑھے یہ تمام الفاظ انتہائی آسان اور سادہ ہیں جن کے سمجھنے میں بچوں کو کسی بھی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

اسی طرح 'چنبلی' نظم کا انداز ایسا ہی ہے جیسے دو سہلیاں آپس میں بات کر رہی ہوں۔ الفاظ کا چناؤ اور استعمال بھی اُسی کے مطابق ہے۔ ساتھ ہی کہیں کہیں الفاظ کی تکرار سے مزید آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ کامیاب ہے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے، اُجلی اُجلی، لمبی لمبی وغیرہ۔ اسی طرح سادہ الفاظ کے ساتھ ساتھ ایسے الفاظ کا استعمال ہے جو بچوں کے ذخیرۂ زبان میں اضافے کا باعث بن سکتے ہیں۔ جیسے چھتری، شاخیں، عطر وغیرہ۔

اسی طرح نظم ''دال چنے کی'' میں دال بھوننے کا سارا عمل بالکل اسی انداز میں بتایا ہے جس طرح کہ کوئی بچہ بیان کر سکتا ہے۔ الفاظ بھی بالکل بچوں کی سوچ اور انداز کے مطابق سادہ اور آسان ہیں۔ کہیں بھی کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ بلکہ دو، چار نئے الفاظ کا اضافہ بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں ہو جاتا ہے۔

بچپن میں بہن بھائیوں کی محبت بھری نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔ چھوٹے بہن بھائی اکثر اپنے بڑے بھائیوں بہنوں کی شکایات اپنی ماں سے کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود کو بڑوں کو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اس لیے ماں ہی وہ واحد ذریعہ ہوتا ہے جو اُن کو ڈانٹ سکے۔ اب اس نوک جھونک کو قیوم نظر نے نظم 'شکایت' میں خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اور یہ نوک جھونک جس قدر عام اور روزمرہ کی بات ہے۔ اُسی قدر اس نظم کے الفاظ سادہ اور روزمرہ استعمال کے ہیں کہ بچے انہیں پڑھ کر دل و دماغ کا وہی چٹخارہ حاصل کر سکیں گے جو وہ اصل حالات میں کرتے ہیں۔

'مینار پاکستان' اور 'انار کلی' ان دونوں نظموں میں موضوعات بہت بڑے اور اہم ہیں۔ ایک تو مینارِ پاکستان ہے، جہاں قراردادِ پاکستان کی یاد میں اسے بنایا گیا ہے۔ اُس کی اہمیت اور تقدس ہمارے دلوں میں بہت زیادہ ہے۔ دوسری طرف ایک تاریخی بازار انار کلی کا ذکر ہے۔ دونوں میں سنجیدگی کے باوجود اور بہترین منظر

کشی کے ساتھ ساتھ الفاظ کا اتنا نپاتُلا استعمال ہے کہ پڑھنے میں لطف آ جاتا ہے۔ ساتھ ہی بچوں کے لیے نئے الفاظ سیکھنے کا موقع ہے۔ جیسے قلعہ، ہم پایہ، قطعہ، منجن، چھپے والا، بھیڑ وغیرہ۔ ایک تو بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوگا دوسرے وہ خالص اُردو پڑھنا اور سمجھنا شروع کر دیں گے۔ لیکن ان سب کے باوجود زبان اور الفاظ بہت سادہ اور آسان ہیں کہ اگر کوئی ایک دو بھاری لفظ آ بھی جاتے ہیں تو مجموعی طور پر نظم کی سادگی پر وہ گراں نہیں گزرتے۔

موسیقیت

بچوں کو نظم یا شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے۔ وہ نظم کا سُر اور لے یا دوسری زبان میں موسیقیت ہے۔ بچے ہمیشہ نظموں کو لہک لہک کر پڑھتے ہیں۔ مطلب کا سمجھ میں آنا یا نہ آنا بعد کی بات ہے۔ سب سے پہلے جو چیز بچوں کو متوجہ کرتی ہے، وہ نظم کی موسیقیت ہے۔ الفاظ کا استعمال کیساس بھی ہو۔ زبان کیسی بھی ہو۔ اگر تو نظم موسیقیت سے بھرپور ہے تو بچوں کو اس سے زیادہ کوئی نظم پسند نہیں آ سکتی۔ قیوم نظر اس بات سے بخوبی آگاہ نظر آتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی نظموں میں موسیقیت کا خاصا خیال رکھا ہے۔ اس موسیقیت کو دکھانے کے لیے ذیل میں چند مثالیں دی جا رہی ہے۔

ککڑوں کوں
مُرغا ہوں

چوں چڑ چُوں
چڑیا ہوں

اُوں اُوں اُوں
ننھا ہوں

(ککڑوں کوں)

☆......☆......☆

کھاتا تھا کھچڑی پیتا تھا پانی
گاتا تھا گانے میرے سرہانے
اِک دن اکیلا بیٹھا ہوا تھا

میں نے اُڑایا واپس نہ آیا
کیسے بلاؤں کیسے بھلاؤں
بلبل کا بچہ

(بلبل کا بچہ)

☆......☆......☆

آئیں آئیں آئیں
ایسا گانا گائیں
بادل مینہ برسائیں

(گانا)

☆......☆......☆

اوپر جتنی بھی نظمیں دی گئی ہیں۔ وہ تمام کی تمام موسیقیت سے بھرپور ہیں۔ کہیں کہیں موسیقیت پیدا کرنے کے لیے تکرار لفظی کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے اُوں اُوں، غُوں غُوں، بگڑم بگڑم، ٹم ٹم، چھم چھم، پم پم، چم چم، تیز تیز، آئیں آئیں، کائیں کائیں وغیرہ۔ عموماً تکرار لفظی کو شاعری میں پسند نہیں کیا جاتا لیکن بچوں کی نظموں میں موسیقیت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تکرار لفظی ہے۔ اس سے نظم میں سُر آتا ہے اور یہ بچوں کی طبیعت اور مزاج پر بالکل گراں نہیں گزرتی۔ بلکہ بچے اکثر بات کو دہرانے کے عادی ہوتے ہیں تو وہ ایسی موسیقیت سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

نظموں کے پیغام کا موازنہ

بچوں کی طرح اُن کا ادب بھی بے حد ضروری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ بچوں کے ادب کے بچوں پر اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف بچوں کی خوشی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ بلکہ بچوں کے اخلاق و کردار کی تشکیل میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کے لیے مستقبل کی راہ دکھانے، منزل کا سراغ لگانے، زندگی کا نصب العین متعین کرنے اور زندگی میں پیش آنے والی مشکلات سے لڑنے اور ران کا حل نکالنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ لہٰذا صوفی تبسم اور قیوم نظر نے بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں سے کچھ ایسا ہی کام لینے کی کوشش کی ہے۔ ہر نظم بچوں کے حوالے سے کوئی نہ کوئی پیغام یا زندگی کے لیے کوئی نہ کوئی

سبق لیے ہوئے ہے۔ اب اس پیغام کو سمجھنا اور اُس کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنا بچوں کی اپنی ذمہ داری اور سوچ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں صوفی تبسم اور قیوم نظر کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں سے حاصل ہونے والے پیغام کا موازنہ اور جائزہ لیا جائے گا۔

صوفی تبسم اور قیوم نظر نے بچوں کے لیے جتنی بھی نظمیں لکھی ہیں اُن میں دونوں کا پیغام اور مقصد ایک ہی ہے۔ بس انداز دونوں کا ایک دوسرے سے تھوڑا جدا ہے۔ لیکن بچوں کے حوالے سے دونوں کی لکھی نظمیں بچوں میں یکساں مقبول ہیں۔ دونوں شاعروں نے اپنی نظموں کے ذریعے سے بچوں کی اخلاقی نشوونما کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ خدا اور نبی سے محبت، وطن سے محبت، ہمدردی، دوستی، جانوروں سے پیار کا درس دیا ہے۔

ذیل میں دونوں کی مشترک پیغام والی نظموں کو ذکر کیا جائے گا تاکہ نظموں سے حاصل ہونے والے پیغام اور سبق کا بہتر طور پر موازنہ کیا جا سکے۔

دونوں شاعروں نے اپنی نظموں 'میرا خدا' میں جو اللہ تعالیٰ کی تعریف میں لکھی ہے اُس کا مقصد بچوں کو اللہ تعالیٰ کی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ ساری دنیا یہ کائنات کس نے بنائی اور سجائی ہے۔ انسان، جانور، چرند، پرند، سمندر، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، پھل، پھول، پودے، جنات یہ سب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے اور بنائے ہیں۔ وہی سب کا خالق مالک اور رازق ہے۔ ہم سب اُسی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ چونکہ بچوں کے معصوم ذہن میں اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور اس دنیا سے متعلق بہت سارے سوالات ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن تمام سوالوں کے جوابات ان دونوں حمد میں دینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بچے بہت شروع سے زندگی کی حقیقت اور اس کے دینے والے کو پہچان سکیں۔

حضرت محمد ﷺ آخری نبی ہیں۔ آپؐ اللہ کے محبوب نبی ہیں۔ چودہ سو سال پہلے جب جہالت انتہا پر تھی تو اللہ نے آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا۔ آپؐ نے اللہ کے دین کی طرف سب کو دعوت دی۔ قرآن مجید آپؐ پر اُتارا گیا۔ تمام نبیوں میں آپؐ کا مقام سب سے اُونچا ہے۔ ہم سب آپؐ کے در کے گدا ہیں۔ قیامت کے دن آپؐ ہماری بخشش کا ذریعہ ہیں اور آپؐ کا امتی ہونا ہم سب کے لیے بہت بڑے فخر کی بات ہے۔ یوں اللہ اور رسول ﷺ کے متعلق بچوں کو کافی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی زندگیوں میں سب سے زیادہ مقدم رکھنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ صوفی تبسم اور قیوم نظر دونوں نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں

نبی اکرمؐ کی شان اقدس میں نذرانہ پیش کیا ہے

اسی طرح اپنے وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان میں قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ اس محبت کو ملک کا نام روشن کرنے اور ملک کے لیے محنت کرنے میں صرف کیا جائے۔ وطن میرا، دیس ہمارا جیسی نظموں میں بھی یہی پیغام دیا گیا ہے کہ آزاد وطن بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کی قدر کریں اور لکھیں، پڑھیں، محنت کر کے اپنے ملک کا نام اور مقام مزید روشن اور اُونچا کریں تاکہ آپ کا ملک بھی ترقی کرے اور آپ کو بھی خوشی ملے۔

دونوں شاعروں کے ہاں ایک نظم سورج سے متعلق ہے اور ایک نظم میں چاند کا ذکر ہے۔ سورج یا دن سے مراد وہ وقت لیا گیا ہے جب سب اُٹھ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کیا انسان، کیا جانور سب کے سب اپنی اپنی مصروفیات اور کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح رات آتے ہی چاند کا ظاہر ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ آرام کا وقت ہے۔ دن بھر کے تھکے ہارے سب اس وقت آرام کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے دن کام کرنے کے لیے اور رات آرام کرنے کے لیے بنائی ہے۔ لہٰذا بچوں کو بھی شروع سے ہی رات جلدی سونے اور صبح جلدی اُٹھنے کا عادی ہونا چاہیے تاکہ سارا دن وہ چاق و چوبند ہو کر اپنا کام کرسکیں۔ دونوں شاعروں نے اپنی اپنی نظموں کے ذریعے سے دن اور رات کے اس مربوط نظام کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کر دیا ہے۔

لڑائی جھگڑا بہت بُری بات ہے بلکہ لڑائی جھگڑے میں سب کا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے جس قدر ہو سکے لڑائی جھگڑے سے دور رہنا چاہیے۔ بچے اکثر چھوٹی چھوٹی بات پر لڑ پڑتے ہیں۔ لیکن وہ لڑائی کے انجام سے بے خبر ہوتے ہیں۔ لڑائی سے متعلق نظموں جیسے تیتر بٹیر، بندر اور بندریا، بلونگڑے وغیرہ میں یہی بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لڑائی میں دونوں فریقین برابر جانی و مالی نقصان اُٹھاتے ہیں۔ لہٰذا پیار و محبت اور صلح صفائی سے رہیں اور اگر کوئی مسئلہ آ بھی جائے تو اُسے بات کر کے حل کرنے کی کوشش کریں۔

صوفی تبسم اور قیوم نظر نے اپنی نظموں میں جانوروں سے محبت کا پیغام دیا ہے۔ اکثر بچوں کو جانور اور پرندے پالنے کا شوق ہوتا ہے۔ جیسے بلی، کتاب، طوطا، مور وغیرہ جانور گھروں میں پالے جاتے ہیں تو جب آپ کوئی جانور، پرندہ پالتے ہیں تو آپ کو اُس سے محبت بھی ہو جاتی ہے اور ہر وقت اُس کی فکر بھی رہتی ہے۔ مثلاً اگر جانور بیمار ہو جائے، یا کچھ کھائے پیئے نہ، یا کہیں گم ہو جائے تو بچے اس بات کا بے حد اثر لیتے ہیں۔ بچے چونکہ معصوم ہوتے ہیں اور اپنے سے محبت کرنے والی ہر شے سے وہ بھی بے حد پیار کرتے ہیں۔ لہٰذا

جانوروں اور پرندوں سے ان کی دوستی اور محبت عام بات ہے اور اس بات کا اندازہ بچوں کی نظموں سے بھی ہوتا ہے کہ جن میں انہیں جانوروں سے دوستی اور محبت کرنے کا سبق دیا گیا ہے اور بچے اپنی معصومیت میں ان جانوروں سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ دراصل بچوں کو اپنی بے شمار خیالی کہانیاں اور سارے دن کی باتیں سنانے کے لیے کوئی چاہیے ہوتا ہے۔ وہ سننے والا اب کوئی جانور بھی ہوسکتا ہے یا کوئی کھلونا بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے جانوروں سے محبت اور گفتگو فطری بات ہے۔

زندگی گزارنے کے لیے انسان کو بہت سے رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جن میں سے ایک خوبصورت رشتہ دوستی بھی ہے۔ دوستوں کے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ آپ کے اچھے بُرے وقت میں آپ کے دوست آپ کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بچپن میں جب بچہ گھر سے باہر نکلتا ہے تو سب سے پہلے اُس کا ہاتھ تھامنے والا اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دوست پیدا نہیں ہوتے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا 'آؤ آؤ سیر کو جائیں'، 'دوست ہے میرا' جیسی نظموں میں بھی دوستی کا ہی پیغام ملتا ہے۔ ساتھ کھیلنا، گھومنا پھرنا، کھانا پینا یہ سب دوستوں کے ساتھ مل جل کر کرنے میں مزا آتا ہے۔ مل بانٹ کر کھانا اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا ان نظموں کا لب لباب ہے۔

یہ نظمیں بچوں کے اخلاق و کردار کی تشکیل میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نظم کے ذریعے بچوں کو زندگی کا مقصد، اپنی منزل کی پہچان اور معاشرے میں اُن کا کردار یہ سب باتیں بہت آسانی اور پیار سے سکھائی جاسکتی ہیں۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد اور کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہوتی ہے اور اس منزل اور مقصد کے لیے ہر ایک کو خود ہی ہمت اور کوشش کرنا پڑتی ہے۔ ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خودغرض ہو جائے اور صرف اپنی ذات کا سوچے اور اپنے کام سنوارے۔ بلکہ ایک اچھا انسان تو وہ ہے جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی مدد کرے۔ انہیں مشکل میں تنہا نہ چھوڑے اور جہاں تک ہو سکے اُن کی بھی مدد اور رہنمائی کرتا رہے۔ اخلاقیات اسی کا نام ہے کہ آپ کی وجہ سے دوسروں کو دکھ اور تکلیف کی بجائے سکھ اور آرام ملے اور یہ نظمیں اور شاعری بچوں کو یہ سب سکھانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

بچوں کو شروع سے ہی کتاب پڑھنے کا عادی بنانا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ بچے ادھر اُدھر فضول وقت ضائع کریں۔ اُنہیں اس وقت کو کسی کارآمد کام میں صرف کرنا چاہیے تاکہ وہ اس وقت سے کچھ سیکھ سکیں۔ بچوں کے سیکھنے کی یہی عمر اور وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ بچپن میں سکھائی گئی باتیں اور عادتیں ساری زندگی انسان کے ساتھ

رہتی ہیں اور پھر انہیں بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو شروع سے ہی اچھی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دینی چاہیے۔تا کہ وہ ان کتابوں سے علم کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور کردار کی تشکیل کرنا سیکھ سکیں اور معاشرے کے لیے اچھے شہری ثابت ہوسکیں۔

یوں اس سارے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفی تبسم اور قیوم نظر دونوں نے بچوں کی بہترین اخلاقی نشوونما کے حوالے سے بہت اچھی اور عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ بس دونوں کے انداز اور الفاظ میں کہیں کہیں فرق ہے۔ ورنہ مقصد تو دونوں شعراء کا ایک ہی ہے کہ آنے والی نسل کی بہتر طور اخلاقی پر نشوونما اور پرورش کی جاسکے۔

حوالہ جات (باب چہارم)

۱۔ الیاس احمد مجتبیٰ، ''بچوں کے ادب کے پچیس سال، ساقی، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۶۱

۲۔ ''آب حیات کے لطیفے''، بحوالہ ''ساقی''، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۶۳

3. A Critical History of Childern Literature, P.XV.

۴۔ فاروق علی خان، راجہ، کلیاں ہی کلیاں، ص ۸

۵۔ ایضاً

6. A Critical History of Childern Literature, p.471

۷۔ فاروق علی خان، راجہ، ''کلیاں ہی کلیاں''، ص ۹

۸۔ مجتبیٰ حسین، ''اُردو میں بچوں کا ادب''، افکار، کراچی، سالنامہ ۱۹۰۴ء، ص ۲۴۴

۹۔ الیاس احمد مجتبیٰ، ''بچوں کے ادب کے پچیس سال، ساقی، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۶۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۱

11. Adventures in Modren Literature - Vocabulary and Succeu, P.242

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۷

۱۳۔ مجتبیٰ حسین، ''اُردو میں بچوں کا ادب''، افکار، کراچی، سالنامہ ۱۹۰۴ء، ص ۲۴۲

۱۴۔ الیاس احمد مجتبیٰ، ''بچوں کے ادب کے پچیس سال، ساقی، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۰۰ء، ص ۱۶۱

15. Bonamy Dobere, "Modren Prese Style", P. 10.

16. M. Stauffer, Ruth, "Adventure in Modren Literature" The Short Story", p.4

17. Modren Prose Style, P.10.

۱۸۔ غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی، ''جھولنے''، (دیباچہ)، احمد شاہ پطرس بخاری، فیروز سنز، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۱ء، ص ۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۷

ماحصل

کسی قوم کی ترقی کا دارومدار بڑی حد تک اس کے بچوں پر منحصر ہے۔ کیونکہ آج کا بچہ کل کا شہری ہے۔ انسانی سماج کا پہلا تعمیری نقش بچوں سے بنا ہے اور ہماری معاشرت کا عکس و اظہار انہی بچوں کے ذہن پر مرکوز ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب کے امین اور نگہبان ہوتے ہیں اس لیے ان کی تربیت کا مسئلہ ہمارے علوم میں بنیادی توجہ اور ترجیح کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کی تربیت اور ذہنی نشوونما پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اُردو ادب کی طرح اُردو میں بھی بچوں کا ادب موجود ہے۔ بچوں کے ادب سے مراد نظم اور نثر کا ذخیرہ ہے۔

> ''بچوں کا ادب اس وقت تک بچوں کا ادب کہلانے کا مستحق نہیں جب تک کہ لکھنے والا خود اپنے آپ کو بالکل بچہ ہی نہ بنا لے اور اسی انداز سے سوچنے، سمجھنے لگے اور بچوں کے لیے لکھے۔ ایک نامور ادیب کا یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ بچوں کا ادب اس کے لیے ایک کم تر درجہ کی چیز ہے۔ کاش اُردو ادب کی ممتاز شخصیتوں کی مانند اُردو کا بچوں کا ادب بھی صحیح معنوں میں ممتاز شخصیتیں پیدا کر سکے جنہیں بچے جانیں اور پہچانیں۔''

بچوں کی صحیح تربیت اور نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے ایسا ادب فراہم کیا جائے جو ان کے لیے فکر انگیز، خیال افروز اور ان کی تعمیر میں مددگار ہو۔ بچے کا ذہن ہمیشہ متجسس رہتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت سمجھنے کی کوشش میں وہ بار بار سوال پوچھتا رہتا ہے۔ ہمارے ادب کی ذمہ داری ہے کہ ان کے جذبہ تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کرنے اور ان کو تخیل کی بلندی، تیزی اور تندہی حاصل ہو تا کہ وہ صاحب نظر بن سکیں۔

اُردو میں بچوں کا ادب ایک نئی نظر کا محتاج ہے۔ ہمارا سرمایہ دوسری زبانوں کے بچوں کے ادب کے مقابلے میں کم درجے کا ہے۔ اچھے فنکاروں نے اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ وقت میں بہترین تخلیقی فنکاروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس ادب کی تخلیق کے لیے معاشرت کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی افتاد، شعور، نفسیات اور احساسات وغیرہ کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اور زبان پر اس حد تک قدرت درکار ہے کہ آسان فہم زبان میں مؤثر طریقہ پر مافی الضمیر سمجھا سکیں۔

بچوں کے ادب کی اشاعت کا معقول بندوبست ہونا چاہیے۔ خوبصورت اور دلکش تحریروں کے ساتھ مختلف رنگوں سے مزین تصویریں بھی ہوں۔ بچے تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔ کتابت و طباعت کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ فنِ کتابت کے بہترین نمونوں سے بچوں کے ذہن میں خوش خطی کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔ عمدہ کاغذ اور خوبصورت گٹاپ سے کتابوں میں صوری حُسن بھی پیدا ہوگا جو بچوں کو کتابوں سے دلچسپی میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

کتابوں کی قیمت مناسب ہو تاکہ ہر خاندان اور ہر بچہ حاصل کر سکے۔ نیز اس بات کی ازحد ضرورت ہے کہ ان مطبوعات کا علم ہر اُردو داں کو ہو۔ اُردو اشاعت کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ان مطبوعات کا علم قاری کو مشکل سے ہو پاتا ہے۔ اُردو کتابوں کی خرید وفروخت کا نظام غیر تسلی بخش ہے۔ انگریزی کتابوں کی تنظیم کی طرح ہمارے نمائندے ملک کے گوشے گوشے میں سفر کریں اور ہر کتب خانے سے رابطہ پیدا کریں۔ اخباروں اور رسائل میں مناسب اشتہاروں اور تبصروں کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔ بچوں کے ادب کی تخلیق کی طرف ممتاز و معروف قلمکاروں کو متوجہ کرانے کی ضرورت ہے تاکہ ترجمے کا کام کم سے کم ہو سکے۔ ترجمہ تخلیق کا بدل نہیں ہوسکتا اور ترجمے سے ہمارے مخصوص ثقافتی رجحان کی نمائندگی بھی نہیں ہو پاتی۔ تاہم علاقائی ادب کے تراجم علاقائی ثقافت اور تہذیب سے روشناس کراتے ہیں۔

اب جبکہ تعلیم میں پیہم ترقی اور توسیع ہو رہی ہے۔ تعلیم کا معیار اونچا ہو رہا ہے۔ طلبہ کی تعداد روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔ اشاعتی سہولتیں بھی آسانی سے میسر ہو رہی ہیں۔ اب اُردو زبان کے لیے بھی شاید حالات بہتر ثابت ہوں۔ بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی، نسوانی معاشرہ کی مصروفیات بھی اس ادب کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ نصاب سے الگ ہٹ کر بچوں کے لیے یہی ادب ان کا رہنما اور بہترین ساتھی بنے گا۔ ان حالات میں بچوں کے ادب اور اس کی اشاعت کو نئے امکانات میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تخلیق کے سوتے فی زمانہ اتنے شاداب چاہے نہ ہوں لیکن تراجم اور عالمی ادب کی دنیا اب بھی بیکراں ہے۔

بچوں کا ادب (جلد اوّل: عالمی ادب سے انتخاب)

فہرست

آسٹریلیا:

بابلو چاند اور سیاہ فام — ترجمہ: نصر ملک

آئرلینڈ:

سُرخ گلاب — ترجمہ: نصر ملک

مسکراتا شہزادہ — ترجمہ: ابصار عبدالعلی

بھوت اصلی بھوت — ترجمہ: ابصار عبدالعلی

خودغرض جن — ترجمہ: خورشید ربانی

افریقہ:

شیر، گیدڑ اور آدمی — ترجمہ: نصر ملک

جب شیر اُڑ سکتا تھا — ترجمہ: نصر ملک

سفید فام آدمی اور سانپ — ترجمہ: نصر ملک

امریکہ:

مچھیرا............! — ترجمہ: نصر ملک

کہانیاں سنانے والا لڑکا — ترجمہ: رضوانہ سید علی

چاند کی دیومالا — ترجمہ: محمد عاصم بٹ

ایران:

بیمار لڑکی — ترجمہ: ہما نصر

چوہوں اور بلیوں کی جنگ — ترجمہ: ہما نصر

خدا کی مصلحت — ترجمہ: رضوانہ سید علی

برطانیہ:

مینڈک شہزادہ	ترجمہ: نصر ملک
آسمان پہ ستارے	ترجمہ: نصر ملک
کاپر فیلڈ	ترجمہ: حمزہ حسن شیخ
گرین ہاؤس	ترجمہ: ڈاکٹر عمران مشتاق
مسٹر لومڑ	ترجمہ: احمد صغیر صدیقی

برما:

کٹھ پُتلیاں	ترجمہ: نصر ملک
گدھ گنجا کیوں ہے	ترجمہ: نصر ملک

بنگلہ دیش:

طاقتور درخت	ترجمہ: نصر ملک
ہُنر	ترجمہ: ابصار عبدالعلی
دو اور تین	ترجمہ: ابصار عبدالعلی

بھارت:

جنگلی چوہا اور اونٹ	ترجمہ: مسعود منور
بلی کا انصاف	ترجمہ: ابصار عبدالعلی
تم پرندوں سے نہ کہو	ترجمہ اختر رضا سلیمی
آنکھیں کھل گئیں	ترجمہ: داؤد رضوان
وقت کی قدر	ترجمہ: داؤد رضوان

جاپان:

سنگ تراش — ترجمہ: نصر ملک

قیمتی مالا — ترجمہ: رضوانہ علی سید

چین:

مالٹے کے بیج — ترجمہ: نصر ملک

کاٹھ کا گھوڑا — ترجمہ: نصر ملک

فرشتے کا انعام — ترجمہ: رضوانہ سید علی

ڈنمارک:

یہ بالکل سچ ہے — ترجمہ: نصر ملک

بے رحم شہزادہ — ترجمہ: نصر ملک

بُلبُل — ترجمہ: نصر ملک

ننھی جل پری — ترجمہ: نصر ملک

چالاک کسان — ترجمہ: رضوانہ سید علی

متحدہ عرب امارات:

خوبصورت لڑکی اور شہزادہ — ترجمہ: نصر ملک

لیلیٰ — ترجمہ: نصر ملک

مصر:

مگرمچھ کی دوستی — ترجمہ: سعید احمد فارانی

لتھوینیا:

جادوئی لفظ	ترجمہ: نصر ملک
جادوئی انگوٹھی	ترجمہ: نصر ملک
طلسمی چکی	ترجمہ: نصر ملک
سنہری سیب	ترجمہ: نصر ملک
جادوئی لڑکے	ترجمہ: نصر ملک
جھگڑالو مرغ	ترجمہ: نصر ملک

ناروے:

جاگیردار کی دُلہن	ترجمہ: نصر ملک
پراٹھا	ترجمہ: مسعود منور

یونان:

وہ بوڑھا آدمی	ترجمہ: نصر ملک
قسمت اور بھکاری	ترجمہ: رضوانہ سید علی

یمن:

میہا ڈَیلو	ترجمہ: نصر ملک
خواب	ترجمہ: نصر ملک

بچوں کا ادب (جلد دوم: قومی ادب، حصہ نظم)

فہرست

حمد:

تیری یاد میں بکے ہم ہیں	آصف ثاقب
ازل سے تو ابد تک حکمران ہے	ابصار عبدالعلی
اے زمین آسمان کے مالک	الطاف حسین حالی
سب نظارے اللہ اللہ کرتے ہیں	حافظ لدھیانوی
بزم افلاک میں ہے ہر سُو اُجالا تیرا	خواجہ عابد نظامی
جسم و جاں بنائے اللہ	خورشید ربانی
اللہ واحد سب کا مالک	علی یاسر
تیرا ساتھ نرالا سائیں	نعمان فاروق
وہ برتر ہے اعلیٰ بھی ہے	یاور عظیم

نعت:

صبح محمدؐ شام محمدؐ	آصف ثاقب
ڈور اُلجھی ہوئی تھی سرا مل گیا	ابصار عبدالعلی
مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام	مولانا احمد رضا خان
آج ہوں میں تیرا دہلیز نشین	احمد ندیم قاسمی
کوئی آپ سا نہیں	اختر رضا سلیمی
وہؐ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا	الطاف حسین حالی

جب وہ سفر پہ جایا کرتے	انور مسعود
عجب انداز ہے فضلِ خدا کا	حسرت موہانی
وہ جس پہ نازاں ہیں خود عطائیں	محشر بدایونی

سوہنی دھرتی:

(نظم)	شاعر
چاند تارا وطن	احسان اکبر
آزادی کی سالگرہ	احمد فراز
اپنا پرچم	تنویر پھول
۶ ستمبر کے گمنام شہید	ساغر صدیقی
پرچم آزادی	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
پیارا پاکستان	عنایت علی خان
ترانہ	محسن احسان
پاکستانی بچے	نجیب احمد

کلاسیکی شاعری سے انتخاب:

بخش دو، گر خطا کرے کوئی	مرزا اسد اللہ خان غالب
شب برات	نظیر اکبر آبادی
موسم گرما	غلام ہمدانی مصحفی
حق بات	شیخ محمد ابراہیم ذوق

بلی اور چوہا/ شیر کا شکار	الطاف حسین حالی
اونٹ/ چڑیا کے بچے	اسماعیل میرٹھی

نظم کہانی:

ایک مکڑا اور مکھی	ڈاکٹر علامہ محمد اقبال
ایک پہاڑ اور گلہری	ڈاکٹر علامہ محمد اقبال
میں دوڑتا ہی دوڑتا	ابن انشا
آپی کی کاپی	ابصار عبدالعلی
چندر اور بندر	اختر شیرانی
صفائی	ڈاکٹر بدر صغیر
بھن بھن، پَین پَین	ڈاکٹر توصیف تبسم
جھوٹا گواہ	حفیظ جالندھری
بچپن کہانی	سلطان کھاروی
چڑیا اور چڑیا رانی	پروفیسر شفیق راجا
مچھلی	ناصر زیدی
ایک کہانی	نسرین انجم بھٹی

تمثیل:

اژدے	اختر شیرانی
بہادر لڑکا	امجد اسلام امجد

پیاسا کوا	امجد اسلام امجد
وہی لقمان	ڈاکٹر توصیف تبسم

اثاثہ:

دُعا	ڈاکٹر علامہ محمد اقبال
ہمارا مدرسہ/ چاندنی رات	اختر شیرانی
بادل کا گیت	احمد ندیم قاسمی
گڑیا ناچی	اظہر نفیس
بچپنا	پروین شاکر
میری بچی	حبیب جالب
ایک دن ہم بھی جیتیں گے	حفیظ جالندھری
منیزہ کی سالگرہ	فیض احمد فیض
آ ؤ آ ؤ سیر کو جائیں	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
گنتی	قتیل شفائی
چڑیا اور کوا	قیوم نظر
تارے	مجید امجد
ساون	منیر نیازی

اثاثہ (۲):

پانچ میں	آصف ثاقب

تلاش	اُفق دہلوی
میری بلی	احمد صغیر صدیقی
چھوٹا سا بچہ	افضل سراج
بادل ماں اور بچہ	الطاف قریشی
ٹم ٹم والا	الیاس بابر اعوان
علم کا گیت	امجد اسلام امجد
چندا اور دھرتی	انور مسعود
بول رے مرغ	ڈاکٹر توصیف تبسم

بچوں کا ادب (جلد سوم، قومی ادب، حصہ نثر)

فہرست

کہانیاں:

بولتی مچھلی	آغا عبدالحمید
امانت	احمد داؤد
جان کی بازی	اشفاق احمد
مہمان کی عزت	حفیظ ہوشیار پوری
پیسے کمانے کی انوکھی ترکیب	حمید اختر
بدلہ	خدیجہ مستور
یہ کہانی مجھے بہت پسند تھی	سر شیخ عبدالقادر
شیر آیا شیر آیا دوڑنا	سعادت حسن منٹو

جب میں ننھا منا تھا	شوکت تھانوی
محفل کے آداب	صلاح الدین احمد
خوب چھینے	مولوی عبدالحق
دو دوست	عزیز اثری
عرب بچے	غلام عباس
بہن بھائی	فرخندہ لودھی
نواب صاحب کا قالین	میرزا ادیب
بولا اور مارا گیا	میرا جی
چوری کھل گئی	نذر سجاد حیدر
وفاداری	ن ۔ م راشد
شہزادے کے چھ ہتھیار	ڈاکٹر احسان اکبر
مگرمچھ اور رحمدل بچے	احمد رشید
معصوم عزم	ڈاکٹر اسلم فرخی
صرف دو آنے	بانو قدسیہ
جن کی خواہش	جبار توقیر
شہزادی	حسینہ معین
ایک اندھیری رات	ستار خان
نوشیروان عادل	پروفیسر سجاد شیخ

بہترین اُستاد	شاہد زبیر
ننھی پری	شمع خالد
بھوکی لومڑی اور چالاک کوا	ظفر اقبال
غرور کا سر نیچا	عذرا اصغر
آخری قربانی	عزیز صدیقی
نیکی کی تلاش	فریدہ حفیظ
سب سے بڑی دولت	رضوان ثاقب
لالچ کی سزا	زمرد سلطانہ
شیر اور خرگوش	سیدہ تعظیم عمران
چالیس روپے	شعیب خالق
پاکستان زندہ باد	محمد زبیر ارشد
عقل مند کسان	محمد عاصم بٹ
ایک تھا شہزادہ	نگہت سلیم
بھول	محمد شعیب مرزا

کہاوت کہانیاں:

کہاوتوں کی کہانیاں	سید وقار عظیم
ایک اکیلا، دو گیارہ	ڈاکٹر توصیف تبسم
دودھ کا دودھ، پانی کا پانی	ڈاکٹر توصیف تبسم
جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے	زاہد حسن

ڈرامے:

پہاڑ اور بچہ	مجتبیٰ حسین
گمشدہ فریادی	میرزا ادیب
دھواں	ابصار عبدالعلی
مکڑی	ارشد چہال
پانی اُبالنا ضروری ہے	صائمہ الٰہی

مضامین:

لندن کی ٹیوب	سید احمد پطرس بخاری
ایک درویش وزیر	طالب ہاشمی
املی کا درخت	مولوی عبدالحق
طلبہ کی سرگرمیاں	عبدالسلام خورشید
پہلا موجد بچہ	مقبول انور داؤدی
زندگی کا بوجھ	نیاز فتح پوری
جانور ہمارے دوست	ڈاکٹر محمد نسیم صدیقی

میرا بچپن:

بچپن مجھے عزیز ہے!	احمد ندیم قاسمی
دُعا کا پلو	اصغر ندیم سید
میری زندگی کی کہانی	ڈاکٹر انور سدید

کیا یہ ایک بھوت تھا!	توفیق رفعت
کڑوی گلاب جامن	حسن عابدی
میری ابتدائی زندگی	خواجہ محمد زکریا
سکول میں پہلا دن	فیض احمد فیض
مالی کچھوا اور دریا	منیر علی دادا

مزاح:

اچھو میاں کا جاگنا	ظفر اقبال
کھیر کا دیگچہ	محمد ادریس قریشی
چچا تیز گام نے آم کھائے	محمد فہیم عالم

پاکستانی زبانوں کے تراجم:

براہوی

احساس	افضل مراد
دوستی	نورینہ سائل

بلوچی

بلی اور بڑھیا	میر عاقل مینگل

پشتو

ابن سعود کا انصاف	حافظ محمد ادریس
تین اور پانچ	حافظ محمد ادریس

پنجابی

کوؤں کی اصلی بولی	اشرف سہیل/ اختر رضا سلیمی
ڈھول	الیسا گھمن
خوبصورت پرندہ	فرخندہ لودھی/ خالی مصطفیٰ
بانسری والا	فرخندہ لودھی/ اختر رضا سلیمی

پوٹھوہاری

کالی سویڑ	قمر محمود عبداللہ/ شیراز طاہر

پہاڑی

عرفان کی کہانی	ڈاکٹر صغیر خان/ شیراز طاہر

سرائیکی

مچھلی کا شکار	حمزہ حسن شیخ
چالاک گیڈر	خدیجہ کبریٰ/ خورشید ربانی
حرام، مال کو کھا جاتا ہے	شوکت مغل/ خورشید ربانی
باتوں کے زخم	عصمت اللہ شاہ/ خورشید ربانی

سندھی

عقل اور بخت	فضل الرحمٰن میمن/ فہیم شناس کاظمی
عقل مند بادشاہ	لیلا رام روچندائی/ فہیم شناس کاظمی
کوا اور چڑیا	محمد ابراہیم جویو/ فہیم شناس کاظمی

شنا

انا پرست راجا	حبیب الرحمٰن مشتاق
چڑیل	حبیب الرحمٰن مشتاق

کشمیری

جادو کا پیالہ	شاہد ندیم

ہندکو

گنجے کی کہانی	انجم جاوید
پیر مانک کی ڈھیری	بشیر احمد سوز
پتھر کے انسان	بشیر احمد سوز

بچوں کا ادب، دعوۃ اکیڈمی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

-	نام کتاب	مصنف
-	خدا پر بھروسہ	طالب ہاشمی
-	عقل مند کون؟	سید نظیر زیدی
-	سبق	سلیم چغتائی
-	گمنام محسن	طالب ہاشمی
-	علم کا پہاڑ	اشتیاق احمد
-	حاتم طائی کا بیٹا	طالب ہاشمی
-	سزا	کلیم چغتائی

- آزادی کا دن	مظہر یوسف زئی

چلڈرن لٹریچر پروجیکٹ کے تحت جو کتابیں شائع کی گئیں، وہ درج ذیل ہیں:

نام کتاب	مصنف
- رسول پاکؐ	عبدالواحد سندھی
- سات کہانیاں	اعجاز احمد
- ماسٹر جی	میرزا ادیب
- تین دوست	عامر یونس
- تمہارا یہ آنسو	میرزا ادیب
- ریچھ اور گلہری	اعجاز احمد
- کایا پلٹ	آصف جاوید سکندر
- کالا چور	مظہر یوسف زئی
- اونچے درختوں کا باغ	میرزا ادیب
- صبر کی چٹان	اعجاز احمد
- چڑیا کی دوستی	شازیہ عالم
- خواب مرتے نہیں	محمد عمر احمد خان
- بددیانتی کا انجام	مصطفیٰ ڈھلوں

بچوں کی عمر کے لحاظ سے پرائمری، مڈل اور میٹرک سطح کے لیے الگ الگ کتب شائع کی گئیں۔

پرائمری:

	نام کتاب	مصنف
-	قرآنی دنیا کی سیر	محمد اسلام نشتر
-	زندگی کے آداب	خواجہ عابد نظامی
-	میں ایک چڑیا ہوں	میرزا ادیب
-	بطخ کا بچہ	محمد فاروق دانش
-	ریچھ اور گلہری	اعجاز احمد
-	پھول ہی پھول	پروفیسر محمد اسحاق جلالپوری
-	پیارے رسولؐ کی پیاری باتیں	ڈاکٹر عبدالرؤف
-	جدا ہوئے تو مرے	پروفیسر عنایت علی خان
-	چاندی کا جوتا	صفیہ سلطانہ صدیقی
-	انوکھا خزانہ	ڈاکٹر محمود الرحمٰن
-	نجاشی کا دربار	شاہدہ بخاری
-	پکنک کا انجام	ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر
-	نیت کا پھل	عشرت رحمانی
-	چنو منو اور شیطان	پروفیسر عنایت علی خان
-	نیکی کا بدلہ	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
-	خدا کا گھر	آغا اشرف

-	ماں نے کہا تھا	زاہدہ پروین
-	نیکی کی خوشبو	محمد عثمان خان

یہ وہ کتب ہیں جو پرائمری جماعت کے بچوں کے لیے شائع کی گئیں۔

مڈل:

	نام کتاب	مصنف
-	پاکستان زندہ باد	سید انصار ناصری
-	جان ہے تو جہان ہے	کلیم چغتائی
-	عظیم عطیہ	آصف جاوید سکندر
-	کاہلوں کی شہزادی	صفیہ سلطانہ صدیقی
-	رنگ برنگی نظمیں	پروفیسر عنایت علی خان
-	پکا وعدہ	طارق انیس
-	وفا کی خوشبو	زبیر طارق
-	املی کا درخت	بابائے اُردو مولوی عبدالحق
-	خزانہ	رضوانہ معراج
-	واپسی	میرزا ادیب
-	بلی کے گلے میں گھنٹی	امجد حسین چھتدی
-	کالا پتھر	محمد عمر احمد خان
-	علم کا اُجالا	ریاض فاطمہ

- مسلم سائنسدان	سید نظر زیدی
- سالگرہ کا تحفہ	شگفتہ فاضل

یہ وہ کتب ہیں جو مڈل سطح کے بچوں کے لیے شائع کی گئیں۔

میٹرک:

نام کتاب	مصنف
- جلال و جمال	ضیاء الحسن ضیاء
- پیارے نبیؐ کی سیرت طیبہ	بشریٰ امام الدین
- یقین کا معجزہ	اعجاز احمد
- سب سے بڑا انسان	سید نظر زیدی
- قائد کہانی	ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر
- وہ کون تھا؟	نذیر انبالوی
- امام بخاری کا کارنامہ	احمد حاطب صدیقی
- موت کا دوست	زبیر طارق
- وقت کا مسافر	محمد عادل منہاج
- کارنامہ	شازیہ فرحین
- اصلی تحفہ	میرزا ادیب
- سائیکل	نور السحر انصاری
- روشنی کی تلاش	زبیر طارق

- خوشگوار حادثہ	سید ریحان احمد
- روشن مثال	عفت گل اعزاز
- تاجل کی کہانی	پروفیسر انور رومان
- درخشاں ستارے	کلیم چغتائی
- آٹو گراف	انیسہ سلیم
- سنگین وجہ	اشتیاق احمد

اس کے علاوہ مفتی کفایت اللہ کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' میں سے ایمانیات، طہارت، نماز اور روزہ، زکوٰۃ کے مسائل الگ الگ ترتیب دے کر مناسب ترامیم کے ساتھ چار کتب میں شائع کیا گیا ہے۔

بچوں کے لیے سندھی زبان میں شائع ہونے والی کتب

نام کتاب	مصنف
- تعلیم الاسلام ایمانیات	مفتی کفایت اللہ
- تعلیم الاسلام طہارت	مفتی کفایت اللہ
- مانک موتی (حصہ اوّل، دوم، سوم، چہارم)	عبدالرحمٰن جتوئی
- اللہ جو دوست	حافظ عبدالقدوس
- جنگی قیدی	عبیداللہ عازی
- حضرت ابوبکر صدیق ؓ	بابر منیر قاضی
- اسلامی سچائی	سید ابوالحسن ندوی
- بچو سردار	عبدالواحد سندھی

- ست کھائیوں	اعجاز احمد
- روشنی جی لاٹ	عبدالوہاب منگریو
- اخلاقی کھائیوں	خواجہ عابد نظامی
- جک جو سردار	حکیم محمد سعید

بچوں کے لیے پشتو زبان میں شائع کتب

نام کتاب	مصنف
- تعلیم الاسلام ایمانیات	مفتی کفایت اللہ
- شہید ہونکے	سید نظر زیدی
- درے دوستان	عبدالکافی ادیب
- ستادا وخکہ	عبدالکافی ادیب
- نامعلوم محسن	ڈاکٹر محمد یوسف

English Books For Childrens

- Basic Islamic Teachings (P.i), Mufti Kifayat Ullah
- Basic Islamic Teachings (P.ii), Mufti Kifayat Ullah
- Basic Islamic Teachings (P.iii), Mufti Kifayat Ullah
- Basic Islamic Teachings (P.iv), Mufti Kifayat Ullah
- The Big feast
- Power belonge to Allah
- Love of Rasulullah.Patience and compassion.
- Reberth of Islam. The Teacher of mankind.
- The Children books of Islam.
- Yousaf and his brothers.
- Hilal and Haram.

- Our Prophet Part (I)
- Our Prophet Part (II)
- Mercy to mankind Part (I)
- Mercy to mankind Part (II)
- The Messenger of Allah (I)
- The Messenger of Allah (II)

کتابیات

بنیادی ماخذ

۱۔ غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی، ''کلیات اب سب ہیں ٹوٹ بٹوٹ میاں'' الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۳ء

۲۔ غلام مصطفیٰ تبسم، صوفی، ''جھولنے'' فیروز سنز، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۱ء

۳۔ قیوم نظر، ''آلوچے'' فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، س ن

۴۔ قیوم نظر، ''گلگلے''، فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰

۵۔ قیوم نظر، ''بچوں کا لاہور''، فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۰

۶۔ قیوم نظر، ''بلبلے'' فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، بار اول ۱۹۹۱

ثانوی ماخذ

۱۔ اسد ادیب، ''بچوں کا ادب، تجزیے اور تجاویز''، مکتبہ کتاب گھر، ملتان، ۱۹۹۴ء

۲۔ ایم اے قریشی، ''فرائیڈ اور لاشعور''، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، اشاعتِ دوم، ۲۰۰۷ء

۳۔ زیب النساء بیگم، ''اقبال اور بچوں کا ادب''، قومی کونسل برائے فروغ زبانِ اردو، نئی دہلی، اشاعت اول، ۲۰۰۰

۴۔ صادق حسین طارق، پروفیسر (تالیف)، ''حکیم محمد سعید (شخصیت اور فن)''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، اشاعتِ اول، ۱۹۹۰ء

۵۔ قاضی جاوید، ''روسو یورپی روشن خیالی کا نمائندہ''، مشعل بکس، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۰۱ء

۶۔ کنھیا لال، ''تاریخ لاہور''، تخلیقات، فرنگ روڈ، لاہور، س ن

۷۔ محمد افتخار کھوکھر، (مرتب)، ''بچوں کے رسائل کا سالانہ جائزہ، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۹

۸۔ محمد افتخار کھوکھر، (مرتب)، ''بچوں کے رسائل کا سالانہ جائزہ''، دعوۃ اکیڈمی، ۱۹۹۰

۹۔ محمد افتخار کھوکھر، ''روشنی کا سفر، بچوں کے ادب کے پچیس سال'' ارقم آفاق پرنٹرز، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۱۳

۱۰۔ محمد عارف ضیاء، ڈاکٹر، ''تعلیمی نفسیات اور نصاب'' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، اشاعت ہفتم، ۲۰۱۳ء

۱۱۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ''اردو میں بچوں کا ادب (کتابیات) حصہ اول''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۱۲۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ''اردو میں بچوں کا ادب'' نیشنل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۷۰ء

۱۳۔ مسعود احمد برکاتی، ''پاکستان میں بچوں کا ادب انسائیکلوپیڈیا'' شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۹۸

۱۴۔ نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، ''صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حیات و خدمات'' مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع اول ۲۰۰۸ء

مقالہ جات

۱۔ تسنیم کوثر (مقالہ نگار)، غیر مطبوعہ ''قیوم نظر احوال و آثار''، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

رسال و جرائد

۱۔ بچوں کا ادب (جلد اول: عالمی ادب سے انتخاب)، مدیر: محمد عاصم بٹ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۲-۹۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء

۲۔ بچوں کا ادب (جلد دوم: قومی ادب حصہ نظم)، مدیر: محمد عاصم بٹ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۵-۹۴، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء

۳۔ بچوں کا ادب (جلد سوم: قومی ادب، حصہ نثر)، مدیر: محمد عاصم بٹ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ: ۹۹، اپریل تا جون ۲۰۱۳ء

۴۔ پھول، مدیر: محمد شعیب مرزا، نوائے وقت، لاہور، شمارہ: ۲۹۳، فروری ۲۰۱۵ء

۵۔ پھول، مدیر: محمد شعیب مرزا، نوائے وقت، لاہور، شمارہ: ۲۹۴، مارچ ۲۰۱۵ء

۶۔ پھول، مدیر: محمد شعیب مرزا، نوائے وقت، لاہور، شمارہ: ۲۹۷، جون ۲۰۱۵ء

۷۔ پھول، مدیر: محمد شعیب مرزا، نوائے وقت، لاہور، شمارہ: ۳۰۰، ستمبر ۲۰۱۵ء

۸۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۱، جلد۶۷، مئی ۲۰۱۲ء

۹۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۳، جلد ۶۹، جون ۲۰۰۹ء

۱۰۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۴، جلد۶۷، اگست۲۰۱۲ء

۱۱۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۵، جلد۶۷، ستمبر۲۰۱۲ء

۱۲۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۶، جلد۶۷، اکتوبر۲۰۱۲ء

۱۳۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۶، جلد۴۷، اکتوبر۲۰۱۴ء

۱۴۔ تعلیم و تربیت، مدیر: عبدالسلام، فیروزسنز، لاہور، شمارہ:۱۲، جلد۶۷، اپریل۲۰۱۲ء

۱۵۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۱، جلد۵۲، جنوری۲۰۰۴ء

۱۶۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۲، جلد۶۳، فروری ۲۰۱۵ء

۱۷۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۸، جلد۶۲، اگست ۲۰۰۹ء

۱۸۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۸، جلد ۵۹، اگست ۲۰۱۱ء

۱۹۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۹، جلد ۵۱، ستمبر۲۰۰۳ء

۲۰۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۹، جلد۶۲، ستمبر۲۰۰۲ء

۲۱۔ ہمدرد نونہال، مدیر: مسعود احمد برکاتی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، شمارہ:۹، جلد۶۲، ستمبر۲۰۱۴ء

ENGLISH BIBLOGRAPHY

1. Cahn, Stevon, "The Philosphical Foundation of Education, New York, Harper and Raw Publishers, 1970.

2. Dewey, John, "Experience and Education", New York, Ny: KAPPA DELTA, 1938

WEB SITES:

1. en.m.wikipedia.org
2. ur.m.wikipedia.org
3. walesonline.co.uk

CENTRAL LIBRARY